سہ ماہی
اردو
امراوتی
ساحر لدھیانوی
نمبر
ISSN 2278-229X
مدیر
وسیم فرحت کارنجوی (علیگ)
سرِ مقتل جنھیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرِ منبر کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے
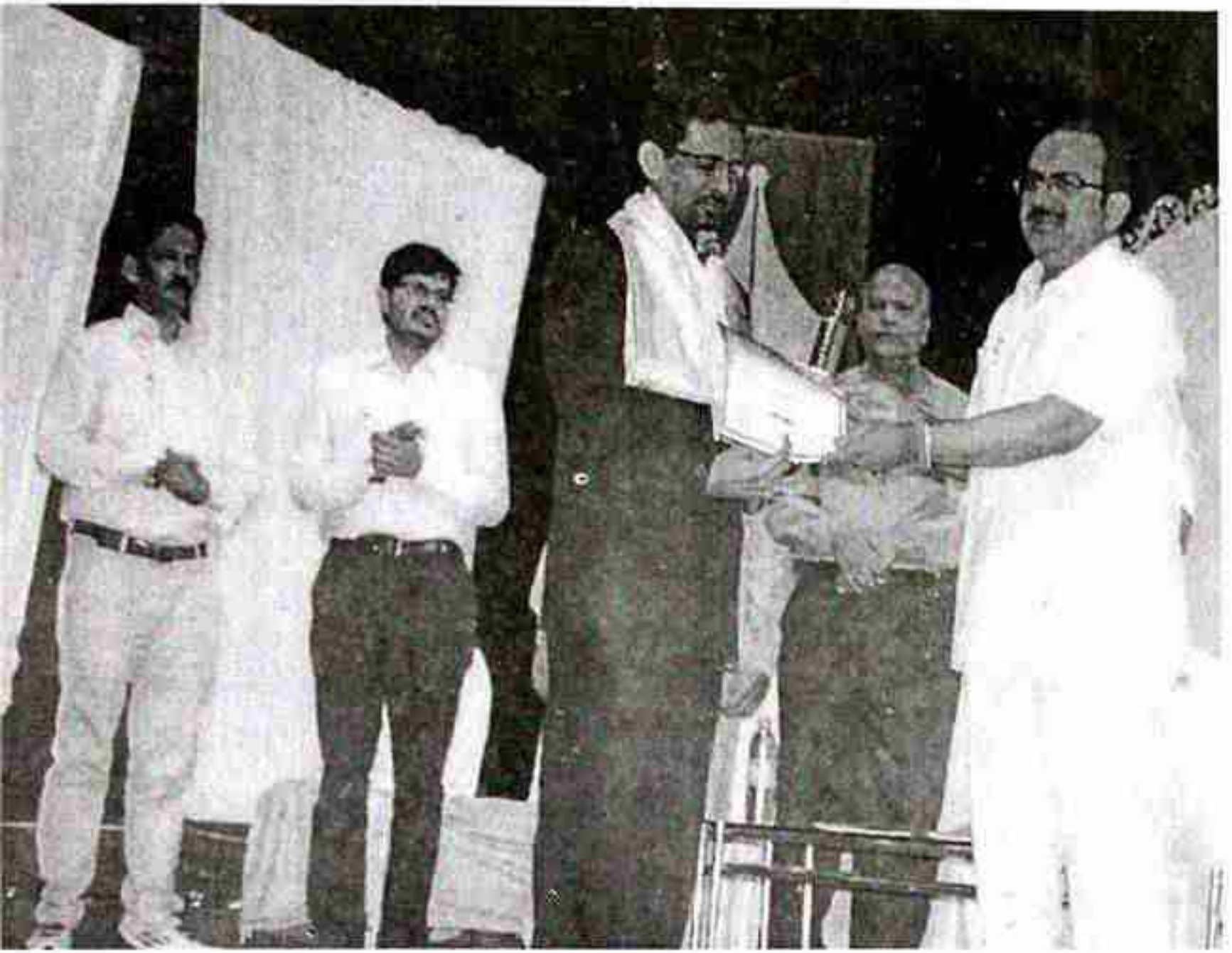
مہاراشٹر ہندی ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر گنیش گائکواڑ کو
ہندی شعری مجموعہ ''**کبھی سوچا نہ تھا**'' کے لیے
''سنت **نام دیو پرسکار**''
(مع پچیس ہزار روپے وظیفہ) سے نوازتے ہوئے وزیر کابینہ برائے ثقافتی امور
جناب سنجے دیوتلے صاحب۔ مورخہ ۱۴ ستمبر ۲۰۱۳ کو حکومت مہاراشٹر
کی جانب سے منعقد پر وقار تقریب میں ایوارڈ بحال کیا گیا۔

اردو ادبِ اطفال کی تمام تخلیقی اصناف پر خوش اسلوبی سے طبع آزمائی کرنے والے قلم کار جناب وکیل نجیب کی ۳۰ ویں طبع زاد تصنیف
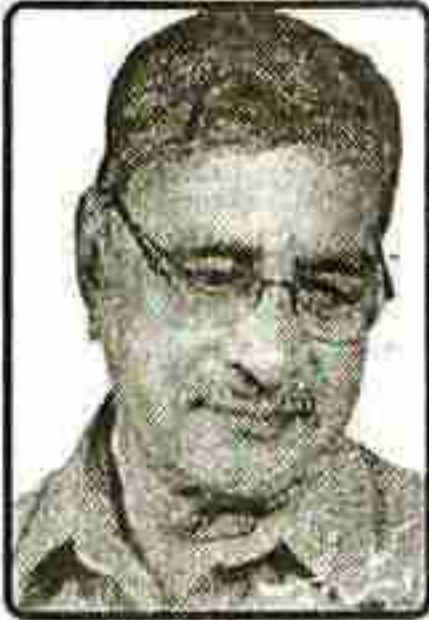
عنقریب افقِ ادب پر جلوہ افروز ہو رہی ہے

وکیل نجیب کی دیگر طبع زاد تصانیف

ناول (بچوں کے لیے)

	صفحات
بے زبان ساتھی	86
مہربان جن	220
خوفناک حویلی	160
خطرناک راستے	140
جاں باز ساتھی	220
غدار وزیر	90
جاں باز شہزادے	180
پانچ بھائی	200
واپسی	85
انوکھی ادا	90
سازش	180
کمپیوٹان	290

ایک عجیب حادثہ	120
نواب بنڈی والا	160
انسانیت اور درندگی	180
معصوم بجوکا	180
غمگسار	320
مسیحا	112

کہانیوں کے مجموعے (بچوں کے لیے)

جنگل کی امانت	128
ماں کی بددعا	90
اندھیرا اجالا	120
ایک شخصیت پانچ کہانیاں	128
کچھ کہانیاں کچھ ڈرامے	180

ڈراموں کے مجموعے (بچوں کے لیے)

اپنا دکھ اپنی خوشی	80
کچھ ڈرامے کچھ کہانیاں	160

سفرنامے (بچوں کے لیے)

شمالی ہندوستان کی سیر	128
دارجلنگ کی سیر	160

بڑوں کے لیے تصانیف

سنگریزے (افسانوں کا مجموعہ)	180
سیاہ رات (ناول)	380
سفرنامۂ حج	140

ملنے کا پتہ

نجیب منزل، نزد لال اسکول، مومن پورہ، ناگپور۔18

موبائل: 09373114213

☆ان کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور یک رنگی بھی۔ حفیظ میرٹھی ’عزیز بگھروی‘ پر ان کے مضامین کے محض عنوانات ہی کا مطالعہ اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ مصنف طبعی اور فکری لحاظ سے ادب کی اسلامی تحریک سے متوسل ہے۔ کسی ادبی یا غیر ادبی تحریک سے متاثر ہونا میرے نزدیک نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ بس ایک وقوعہ ہے جو فن کار کو تخلیقی سطح پر متاثر کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ مضامین متعلقہ شاعروں کی فکر اور فن کو کامیابی کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں۔ (ڈاکٹر مدحت الاختر)

☆ڈاکٹر محمد کلیم ضیاء کا مطالعہ خاصہ عمیق اور وسیع ہے۔ اپنے تجزیے کے لیے وہ متعدد حوالوں اور حواشی سے کام لے کر اپنی کسی بات کو وثوق کے ساتھ ثابت کر دیتے ہیں۔ ایک اچھے اور سچے نقاد کی یہی خوبی ہوتی ہے۔ (افتخار امام صدیقی)

☆ڈاکٹر کلیم ضیاء کی تنقید میں مشرقی اصول کارفرما دکھائی دیتے ہیں، وہ میتھو آرنلڈ کے مقابلے خواجہ حالی کو مقدم جانتے ہیں۔ قاری کو فلسفیانہ گتھیوں میں نہ الجھاتے ہوئے تفہیم و ترسیل کو حضرتِ کلیم اولین فریضہ گردانتے ہیں، اور یہی وہ اندازِ فکر ہے جو ان کی تنقید میں تخلیقیت پیدا کر دیتا ہے۔ (وسیم فرحت کارنجوی علیگ)

حیات جہدِ مسلسل کا نام ہے فرحتؔ جمود سے بھی مقدر کہیں بدلتا ہے

بیادِ خلیل فرحتؔ کارنجوی (مرحوم)

سہ ماہی

امراوتی

ساحرؔ لدھیانوی نمبر

جلد نمبر۲ شمارہ نمبر۲،۳،۴ (مشترک شمارہ) امراوتی، مہاراشٹر (ہند) اپریل تا دسمبر ۲۰۱۳ء

مدیر

وسیم فرحتؔ کارنجوی (علیگ)

Email:wkfarhat@gmail.com Cell.09370222321

نائب مدیر: ڈاکٹر کلیم ضیاء معاون مدیر: تحسین اسرار

ساحرلدھیانوی نمبر: ۲۰۰روپے، زرِ سالانہ: ۱۵۰ روپے، لائبریری اور اداروں سے: ۲۵۰ روپے

خط و کتابت کے لیے

Editor,URDU,"Adabistan", Near Wahed Khan Urdu D.Ed.College,Walgaon Road,
AMRAVATI-444601,Maharashtra (India)

اگر آپ چیک یا ڈرافٹ بھیجنا چاہیں تو صرف **WASEEM FARHAT** اس نام سے بھیجیں۔

امام الغزل، ابوالمعانی، ہم نوائے آتشؔ جیسی صفات سے متصف

علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، مالک رام جیسے عالم جس کی استادی کے قائل

ہزار طوفانوں سے ایک جان پہ لڑنے میں ماہر، اردو ادب کا سب سے زیادہ معرکہ خیز شاعر

جس کی شعری تہہ داری کا ایک عالم معترف، اپنے فن میں یکتا

غالبؔ شکن میرزا یاس یگانہؔ چنگیزی کے ایک سو ستاون خطوط کا مجموعہ

تاریخ اردو ادب میں پہلی بار

مکتوباتِ یگانہؔ

تحقیق، ترتیب، حواشی

وسیم فرحت کارنجوی (علیگ)

اچھوتی اور چونکا دینے والی تحریروں سے ادب میں پہچانے جانے والے محقق و نقاد وسیم فرحتؔ کارنجوی

کی ان تھک تحقیق کا ثمرہ، یگانہؔ چنگیزی کی مکمل حیات ان کے خطوط کے آئینے میں

مع طویل مقدمہ مرتب نیز تفصیلی و مدلل حواشی، 'بقلم یگانہؔ' کے تحت یگانہ چنگیزی کے خطوط کے عکس

کثیر رنگی کاغذ پر یگانہ کی نایاب تصاویر۔ کلاسیکی ادب کی تاریخی و دستاویزی کتاب

دبیز کاغذ، کثیر رنگی سرورق، مجلد (Hard Bound)، انگریزی کتابوں کو منہ چڑائے ایسی جلد سازی

جدید تکنیکوں سے آراستہ دیدہ زیب سرورق، ۲۶۰ صفحاتی ضخیم و حوالہ جاتی کتاب

قیمت: ۳۰۰ روپے

اردو پبلکیشنز کی فخریہ پیش کش، جلد اپنی کاپی محفوظ کریں۔

(وی پی سے منگوانے کی صورت میں وی پی خرچ خریدار کے ذمے ہوگا)

مکتوباتِ یگانہ

یگانہ چنگیزی کے علاوہ اردو ادب کے کئی دلچسپ انکشافات کتاب ھٰذا میں شامل ہیں۔ علامہ اقبال و حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے خطوط کے عکس۔ فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، ابوالکلام آزاد، عزیز لکھنوی سے متعلق نئے باب وا ہوتے ہیں۔ مکمل حیات یگانہ کا احاطہ کرتی کتاب، شائع ہوتے ہی بہت تیزی سے فروخت۔ چند نسخے باقی۔

تاثرات

☆☆ وسیم فرحتؔ صاحب، سلام مسنون۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ صنف غزل کو نئی سمت دینے والے شاعر یگانہ چنگیزی پر آپ کی مرتبہ کتاب "مکتوبات یگانہ" موصول ہوئی۔ بہت خوب۔ مبارک باد۔ (عزت مآب محمد حامد انصاری، نائب صدر جمہوریہ، دہلی)

☆☆ میں بہت کم کتابیں پوری پڑھ پاتا ہوں، لیکن یقین جانئے کہ "مکتوبات یگانہ" شروع سے آخر تک پڑھی۔ واقعی یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے دوران میں نے چند مقامات پر نشانات بھی لگائے ہیں۔ آپ نے کڑی محنت سے کام انجام دیا ہے۔ ہاں البتہ من موہن تلخ سے آپ سرسری گزر گئے، جب کہ ان پر مزید گہرائی سے کام کیا جا سکتا تھا، بہر حال، آپ کی کتاب ان چند اچھی کتابوں میں سے ایک ہے جنھیں میں بہ شوق اپنی میز پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔ (شمس الرحمٰن فاروقی، الہ آباد)

☆☆ یگانہ چنگیزی کے سلسلے میں ڈاکٹر معصوم رضا راہی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ، مشفق خواجہ کا مرتبہ 'کلیات یگانہ' کے بعد تیسری معتبر کتاب "مکتوبات یگانہ" ہے۔ اور اس وقار و اعتبار کے ساتھ ساتھ کتاب کی اشاعت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی ہے۔ سرورق، گرد پوش، جلد سازی وغیرہ خوب سے خوب تر ہے۔ (ضمیر کاظمی، ممبئی) ☆☆ یہ کتاب اردو کے عام قاری اور محققین کے لیے ایک سوغات ہے۔ یہ ایک بہترین کام ہے۔ اردو ادب کے پڑھنے والے بھائی وسیم کی اس کاوش کو بھلا نہ پائیں گے۔ (احمد سہیل، امریکہ)

☆☆ "مکتوبات یگانہ" وسیم فرحت کے تنقیدی شعور، تحقیقی بصیرت اور محنت شاقہ کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کے ذریعے وسیم فرحت نے یگانہ کو شعری آگہی، مردانہ آہنگ اور جہد حیات کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے بالمقابل قائم کر دیا ہے۔ ایک عہد سے مجادلہ کرتا ہوا یگانہ اس کتاب میں میرے ہم عصروں سے بھی مکالمہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ (ڈاکٹر سید صفدر، امراوتی)

☆☆ مکتوبات یگانہ وسیم فرحت کارنجوی صاحب کی بہترین تحقیقی اور ادبی کارنامہ ہے۔ جس قدر محنت اور جانفشانی سے یہ کام انجام دیا ہے اس کا اندازہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ (محمد اعظم امروہی، برطانیہ) ☆☆ وسیم فرحتؔ کارنجوی کی کوشش لائق صد ستائش ہے۔ یہ خالص تحقیقی کام ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی ہونی چاہیے۔ (ڈاکٹر عبدالحئی خان، مدیر 'اردو دنیا' نئی دہلی)

☆☆ اس جانفشاں کام کے لیے اردو طبقہ ہمیشہ آپ کا احسان مند رہیگا۔ آپ نے ایک لائق صد تحسین کام انجام دیا ہے۔ (سلمان رضوی، پونہ) ☆☆ زندہ باد، ایک تاریخی کام، مبارک باد (لیاقت جعفری، کشمیر) ☆☆ "مکتوبات یگانہ" کو قابل تحسین کارنامہ کہا جائیگا۔ (محمد شفیع الرحمٰن، پٹنہ)

پاکستان میں رابطہ

بزم تخلیق ادب پاکستان، دفتر: II-B/18، کمرشل ایریا، نزد پیراڈائز بیکری، ناظم آباد، کراچی

موبائل: 0321-8291908

خم خانۂ ساحرؔ

عنوان | قلم کار | صفحہ نمبر

اداریہ .... مدیر 9

اعترافِ ساحرؔ

☆نغماتِ ساحرؔ

۱۔ساحراور بھجن کی معنویت — گوپی چند نارنگ (نئی دہلی) — 13
۲۔ساحر کے فلمی نغمے — گلشن کھنہ (لندن) — 22
۳۔ایک قدم کا فاصلہ — وسیم فرحت کارنجوی علیگ — 28

☆حیاتِ ساحرؔ

۱۔یادوں کے لمس — امرتا پریتم — 33
۲۔ساحر کے ساتھ ایک شام — نریش کمار شادؔ — 40
۳۔ساحرلدھیانوی — اے حمید — 46
۴۔کچھ یادیں بھولی بسری سی — حافظ لدھیانوی — 60
۵۔ساحر۔تجزیہ نما تاثر — ندافاضلی (بمبئی) — 88
۶۔آسماں چپ ہے — واجدہ تبسم — 96
۷۔ساحر کی حیات وفن — ایم کاویانی (بمبئی) — 106
۸۔ساحر کی محبتیں — ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور) — 133
۹۔ساحر۔جو پل دو پل کا شاعر۔۔ — شہناز خانم عابدی (کینیڈا) — 139
۱۰۔جانے کیا تو نے کہی — شیریں دلوی (بمبئی) — 153
۱۱۔ایک سرکش سے محبت کی تمنا — راشد اشرف (کراچی، پاکستان) — 158
۱۲۔ساحرلدھیانوی — شفیقہ قادری (حیدرآباد) — 160

☆جہاتِ ساحرؔ

۱۔مقبولیت اور امکانات کا شاعر — ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی (علی گڑھ) — 172

۲۔ کچھ ادبی کچھ ذاتی تاثر | حیدر قریشی (جرمنی) | 182
۳۔ ساحرؔ کا سخن | نصرت ظہیر (نئی دہلی) | 191
۴۔ ساحرؔ کا ساحرانہ مخاطبہ | احمد سہیل (امریکہ) | 205
۵۔ ساحر اور معیارِ فن کی عظمت | حقانی القاسمی (نئی دہلی) | 212
۶۔ ساحر کی غزل گوئی | نذیرؔ فتح پوری (پونہ) | 228
۷۔ ساحر کا فن | کوثر مظہری (نئی دہلی) | 234
۸۔ ایک بیدار شاعر۔ ساحرؔ | ڈاکٹر زیبا محمود (سلطانپور) | 243

نگار خانہء ساحرؔ .... تصاویر 248-269
مکاتیبِ ساحرؔ .... خطوط 270-273
رفیقانِ ساحرؔ .... اقتباسات 274-279
• خواجہ احمد عباس • فکر تونسوی • خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم
• ڈاکٹر ستیہ پال آنند • ڈاکٹر مظفر حنفی • سعید رضا سعید
خراجِ عقیدت 280-294
• خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم • نقشبند قمر نقوی • ڈاکٹر محبوب راہیؔ
• خورشید اکبر • ڈاکٹر گنیش گائکواڑ • ڈاکٹر کلیم ضیاءؔ
دریچۂ زبان و ادب ....
مضرابِ سخن ....
• اردو اور جدید تکنالوجی | ڈاکٹر خواجہ اکرام (نئی دہلی) | 295
• مکتوباتِ یگانہ۔ سعی بے بدل | راشد اشرفؔ (کراچی، پاکستان) | 311
• یگانہؔ۔ خطوط کے آئینہ میں | ڈاکٹر صفدرؔ (امراوتی) | 317
انتخابِ ساحرؔ لدھیانوی 322-400

اردو زبان اور امت مسلمہ سے دیوانہ وار محبت کرنے والے،

جن کے جذبۂ شوق سے کئی نسلیں فروغ پا چکی ہیں،

جن کی علمیت، فراست اور دانش مندی کا ایک عالم معترف،

گہوارۂ علم اعظم کیمپس پونہ کے روح رواں،

اردو ادب کے کئی بڑے رسائل و مجلّہ جات کے کفیل،

سہ ماہی ''اردو'' کے سر پرست،

مردِ آہن، عظیم المرتبت عزت مآب

منور پیر بھائی

کی نذر،

اداریہ

معزز قارئین!

نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اردو کا "ساحر لدھیانوی نمبر" آپ کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں۔ تین شماروں کا مشترک شمارہ نو مہینے کے وقفے کے بعد منظر عام آیا ہے۔ کسی اور زاویے سے غور کریں تو اتنی ہی مدت تولید کی بھی ہوتی ہے۔ لیجیے نتیجہ میں بطن اردو سے "حضرتِ ساحر" تشریف لائے ہیں۔ اس خاص نمبر کا خیال آنے پر طے کیا گیا تھا کہ دو شماروں کا مشترک شمارہ شائع کیا جائے لیکن محض تین سو صفحات "ساحر لدھیانوی" کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے چار و ناچار تین شمارے "وقفِ ساحر" کرنے پڑے، امید کہ قارئین ہمارے اس اقدام کو گوارا فرمائیں گے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بچہ اپنے والد کے ہی نقش قدم پر چلتا ہے۔ والد کی پسند کو اپنی پسند بناتا ہے، ان کے ذہنی میلانات و ترجیحات کو بلا چوں و چرا قبول کرتا ہے، اور اسی روش پر چلتے ہوئے جوانی سے بڑھاپے تک کا اپنا سفر مکمل کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح میرا معاملہ رہا، والدِ بزرگوار حضرتِ خلیل فرحت کارنجوی مرحوم کی پسند کو ہی میں نے اپنا شعار بنایا۔ گزشتہ صدی کے دو شاعر استاد یگانہ چنگیزی اور ساحر لدھیانوی، والدِ مرحوم کی اولین پسند تھے۔ فرحت مرحوم کی اول الذکر سے 'فطری' اور ثانی الذکر سے 'فکری' مناسبت رہی۔ شعوری لاشعوری طور پر یہی دو صاحبان میرے حلقۂ پسندیدگی میں اشتمال کر گئے۔ نتیجتاً حضرتِ یگانہ پر پانچ عدد کتابیں (ایک طبع شدہ و چار زیرِ طباعت) رقم کر ڈالیں۔ اور اسی خلوص کا ثمرہ "ساحر لدھیانوی نمبر" کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہی اس خاص نمبر کی وجہ تخلیقیہ ہے۔ خدا گواہ کہ میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں، میرے حرف حرف کی نگرانی کرتے فرحت مرحوم کو اپنے ارد گرد پاتا ہوں۔ یونانی فلسفیوں کا ایمان ہے کہ 'باپ' کبھی نہیں مرتا، جس دم 'باپ' کی موت واقع ہوتی ہے، بظاہر 'باپ' مرتا ہے لیکن اصلاً موت 'بیٹے' کی ہوتی ہے۔ اسی لمحہ 'باپ' اپنی شکل بدل کر بیٹے کا روپ لے لیتا ہے، اور یہیں سے 'باپ' کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے، غرض کہ 'باپ' کبھی نہیں مرتا۔ یقین جانیے کہ اس فلسفہ کا بعینہٖ مجھ پر اطلاق ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی بخوبی احساس ہے کہ علم و فضل میں، میں تا قیامت حضرتِ فرحت مرحوم کے عشرِ عشیر تک بھی پہنچ نہ پاؤں گا۔ میری ان خالص نجی باتوں کے یہاں اندارج کا جواز صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک 'ساحر لدھیانوی نمبر' پر ہی کیا موقوف،، بجنسہٖ سہ ماہی "اردو" کا اجراء بھی فرحت مرحوم کی یاد میں کیا گیا ہے۔ بہر کیف۔

ساحر لدھیانوی پر گزشتہ تیس برسوں میں دو اہم نمبر شائع ہوئے ہیں۔ اول صابر دت کی ادارت میں "فن و شخصیت نمبر" (۱۹۸۵) اور دوم برادرم نصرت ظہیر کی ادارت میں 'سہ ماہی ادب ساز' کا "ساحر لدھیانوی نمبر" (۲۰۱۰)۔ فن و شخصیت نمبر میں ساحر کی موت کے فوراً بعد تاثراتی نوعیت کے مضامین کی اکثریت ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۴۵ تا ۱۹۸۵، ساحر پر لکھے گئے سبھی چھوٹے بڑے مضامین

اس خاص نمبر میں شامل کیے گئے۔ اب یہ نمبر ناپید ہے۔ بلکہ نئی نسل کے قاری کو اس کے متعلق جانکاری بھی نہیں۔ مذکورہ نمبر میں شامل مضامین کے متعلق عرض کروں کہ محض یادداشتوں پر مبنی شخصی خاکوں کی معنوی افادیت زمانے کی رو کے ساتھ ماند پڑتی جاتی ہے۔ ایک خاص وقت کے بعد ایسے مضامین شخصیت کو اجاگر کرنے میں تو خیر معاون ثابت ہو سکتے ہیں تاہم فن اور قد کا تعین کرنے میں ان سے مدد نہیں لی جا سکتی۔ ''ادب ساز ساحر نمبر'' خوبصورت اور جامع رہا۔ اس میں بیش تر مضامین 'فن و شخصیت ساحر نمبر' سے ماخوذ ہیں۔ برادرم نصرت ظہیر نے ساحر کا 'شعری کلیات' اس نمبر میں شائع کر دیا۔ (ہر چند کہ میری اپنی دانست میں خاص نمبر میں بجنسہ کلیات کی شمولیت کا کوئی معقول جواز نہیں بنتا) یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ 'ادب ساز' کا ساحر نمبر، عوام تو خیر جانے دیجیے، خواص تک بھی نہیں پہنچا۔ اس کے پس پردہ دو وجوہات رہیں، اول تو یہ کہ نصرت صاحب کسی کو بھی 'اعزازی کاپی' فراہم نہیں کرتے (اور یہ نہایت واجب، معقول اور خوش آئند امر ہے) دوم یہ کہ اس خاص نمبر کی قیمت آج سے چار برس قبل چار سو روپے رکھی گئی، جس نے اسے ہمارے ''غریب اردو والے'' عوام الناس سے دور پہنچا دیا۔ خود میں نے تقریباً نصف ہزار روپے قیمت ادا کر کے مذکورہ شمارہ خریدا۔ بس یہی جواز سہ ماہی ''اردو'' کے 'ساحر لدھیانوی نمبر' کا بنتا ہے۔ انتہائی کم اور معقول قیمت پر ۴۰۰ صفحاتی دستاویزی نمبر اس گرانی کے دور میں کسی صورت نقصان کا سودا نہ ہوگا۔ اس کا اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ سالانہ خریداروں کو ۱۵۰ روپیے کے سالانہ چندہ کے اعتبار سے محض ۱۱۲ روپیے میں یہ قیمتی نمبر حاصل ہو رہا ہے۔ مزید یہ کہ سالانہ خریداروں کو رجسٹری ڈاک سے پرچہ بھیجا جا رہا ہے جس کا ڈاک خرچ کم و بیش ۲۲ روپیہ فی پرچہ کے حساب سے محض ۹۰ روپیے میں ۴۰۰ صفحاتی نمبر سے سالانہ خریدار لطف اندوز ہوں گے۔ ساتھ ہی غیر خریداروں کو بھی برائے نام ۲۰۰ روپیے کی ادائیگی پر، قیمت سے دوگنا صفحات کی کتاب بہم پہنچ رہی ہے۔ اس لحاظ سے سہ ماہی ''اردو'' کی عوام تک رسائی بڑے پیمانے پر ہوگی انشاءاللہ۔

برادرم نصرت ظہیر صاحب نے نہایت قیمتی چنداں مضامین ٹائپ شدہ عنایت فرمائے ہیں، ادارہ نصرت ظہیر صاحب کا سرتاپا ممنون ہے۔ ساتھ ہی برادرم شکیل رشید صاحب مدیر 'اردو ٹائمز' بمبئی نے اشتہار کی فراہمی میں خاصہ تعاون فرمایا، خدا انہیں معقول اجر دے۔ قبلہ حکیم سلیمان طور صاحب، برادرم وکیل نجیب صاحب، برادرم کلیم ضیاء صاحب، برادرم ڈاکٹر گنیش گائکواڑ صاحب، برادرم ساجد محشر صاحب و قومی کونسل دہلی کے ارباب حل و عقد، افسران (علی الخصوص عالی جناب شاہنواز خرم صاحب و جناب مشرا صاحب) وغیرہم کے تعاون بیش بہا کے بغیر 'ساحر نمبر' کا خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہو پاتا۔ ادارہ سبھی حضرات کا مشکور ہے۔ خدا کرے کہ سہ ماہی ''اردو'' کا 'ساحر نمبر' آپ کی پسندِ خاطر بنے۔ گراں قدر آرا کا شدید انتظار رہیگا۔

آپ کا اپنا،

[signature] ناظم

خاکہ

ساحرؔ لدھیانوی

قلمی نام	:	ساحرؔ لدھیانوی
اصل نام	:	عبدالحئی
ذات	:	گجر (گوجر)
پیدائش	:	۸ مارچ ۱۹۲۱ء کریم پورہ، (لال پتھروں والی حویلی) لدھیانہ، پنجاب (غیر منقسم ہندوستان)
والد کا نام	:	چودھری محمد فضل احمد
والدہ کا نام	:	سردار بیگم (تعلق کشمیر)
تعلیم	:	گورنمنٹ کالج لدھیانہ (نامکمل) گورنمنٹ کالج لاہور (نامکمل) (بی اے) دیال سنگھ کالج لاہور
ذہنی میلانات	:	سیکولرازم، ترقی پسندی
ذریعہ معاش	:	سنیما نغمہ نگاری
معاشقے	:	امرتا پریتم، سدھا ملہوترا، پریم چودھری، امر کول، ہاجرہ مسرور
ادارت	:	ماہنامہ 'ادبِ لطیف'، 'شاہکار'، 'پریت لڑی'، 'سویرا'
ازدواجی زندگی	:	تاحیات مجرّد رہے۔
تصانیف و انتخابات	:	تلخیاں۔ پرچھائیاں۔ گاتا جائے بنجارہ۔

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

ساحر کے ذریعے کیے گئے تراجم : 'کارل مارکس'، 'سامراج'

ساحر کی شاعری کے تراجم :

انگریزی ترجمہ SHADOWS SPEAK۔ مترجم خواجہ احمد عباس (۱۹۵۸ دیباچہ از سجاد ظہیر)

انگریزی ترجمہ THE BITTER HARVEST

مترجم رفعت حسن (۱۹۷۷)

انگریزی ترجمہ۔ مترجم سچا سائیں (۱۹۹۸)

اعزازات وانعامات :

عمدہ نغمہ نگاری کے لیے فلم فیئر ایوارڈ (۱۹۶۴)

حکومتِ ہند کی جانب سے پدم شری ایوارڈ (۱۹۷۱)

سویت لینڈ نہرو ایوارڈ (۱۹۷۲)

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو ایوارڈ (۱۹۷۲)

عمدہ نغمہ نگاری کے لیے فلم فیئر ایوارڈ (۱۹۷۷)

وفات :

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ کی شب ۵۹ سال کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہوا۔ جوہو، ممبئی کے قبرستان میں پیوندِ زمین ہوئے۔

بے روح گنبدوں میں بھٹکتی ہوئی دعا
بے جان پتھروں کی عبادت ہے زندگی

خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم

نغماتِ ساحر

گوپی چند نارنگ، نئی دہلی

ساحر لدھیانوی اور بھجن کی معنویت

غزل یا مثنوی کی طرح بھجن صنف اور ہیئت دونوں نہیں، فقط صنف ہے اور صنفوں کی صنف کہ گیت یا نظم کی طرح بھجن کسی بھی ہیت میں ممکن ہے، بس تفہیم یا معنیاتی فضا بھجن کی ہونا چاہیے، یعنی کسی برتر اور ارفع ہستی سے خطاب، مصدرِ ہستی یا کلید کائنات، یا اس کی کوئی بھی تجسیم، دیوی، دیوتا، اوتار، واہگورو، پیر و مرشد، حسنِ حقیقی یا مجازی کی کوئی شرط نہیں۔ تجسیم تجسیم ہے اور تجرید تجرید، لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی، اس کا جیسا راز بھجن میں کھلتا ہے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ عشق وارادت، عقیدت و محبت ٹوٹ کر چاہنے، عشق کی آگ میں اندر ہی اندر جلنے، انگ میں انگ سمانے اور جنم جنم کی پیاس بجھانے اور جل تھل ہو جانے کا تصور خاصی دلگداز مجازی کیفیت رکھتا ہے۔ یہ جسم و جمال کی سرشاری اور بدنیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ وہ روحانیت ہے جو مندروں کی جسمانیت سے ابھرتی ہے۔ ذہنی خیال لاکھ حقیقی سہی، جذبے کو فتیلہ دکھانے کے لیے تجریدیت سے کام نہیں نکلتا۔ تجسیمیات کی تہ داری ضروری ہے۔ بھگتی کی سرشاری اور جذب و کیف کا سب سے بڑا رمز یہی ہے کہ اس میں پرش اور پرکرتی ایک ہی سطح پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔

دوہے کی ہیئت متعین ہے اور اس کی صنفی پہچان بھی۔ بھجن وارفتگی کے باعث آزاد ہے، البتہ دوہے کی طرح بھجن کا گھر بھی ہندی اور دوسری ہندستانی زبانیں اور بولیاں ٹھولیاں ہیں۔ بھجن اُن تمام ہندستانی زبانوں میں ملتا ہے جہاں جہاں بھگتی کا اثر ہے اور بھگتی کا اثر کہاں نہیں۔ لیکن اردو کا ٹانکا اگر بھڑا ہوا ہے تو کھڑی سے یا برج سے یا اودھی، بھوجپوری یا راجستھانی سے۔ لیکن اردو میں دوسری بولیوں کے اثرات نہ ہوں، ایسا بھی نہیں ہے۔ 'بھجن کیرتن' کی ترکیب ہی سے ظاہر ہے کہ جہاں اس کا ایک سرا روحانی عقیدت سے

جڑا ہوا ہے، دوسرا سنگیت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یعنی مندروں یا بت کدوں کی فضا سے جہاں انسانی روح آلائشوں سے پاک ہو کر الوہی تصور میں ڈوبنے کا جتن کرتی ہے۔ عبادت گاہوں سے وابستہ ہونے کے تصور کی بنا پر بھجن سے خاص طرح کی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں اور معنی کی ترسیل سے پہلے معنی کی پرچھائیاں قاری کے ذہن و شعور کا حصہ بننے لگتی ہیں جو عبارت ہیں عقیدت و محبت سے یا سرشاری و سرمستی سے یا پریم رس کی فضا سے — علاوہ ازیں بھجن کا تصور خاص طرح کی جھنکار کے ساتھ ذہن میں آتا ہے، سنگیت میں رچا بسا ہوا۔ یعنی بھجن کا سنگیت میں رچا بسا ہونا بھی خاص طرح کی معنیاتی فضا پیدا کرتا ہے۔ بھجن بولے جانے کی نہیں گائے جانے کی چیز ہے۔ گویا بھجن مجرد لفظ نہیں، بھجن لے اور تال ہے۔ اسی طرح بھجن فقط حکمت و موعظت نہیں، بھجن عقیدت و محبت ہے۔ بھجن فقط مستی نہیں بھجن سرمستی ہے۔ یہ عشق و محبت کا اظہار تو ہے ہی، یہ عشق و محبت کا احساس بھی ہے، دوہا اور گیت تو اردو میں ایسے آئے گویا اردو کے ہو گئے، لیکن بھجن بھجن ہے۔ اگر ادب ڈسکورس ہے تو بھجن کچھ زیادہ ہی ڈسکورس ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

غزل یا نظم ثقافتوں کے آر پار کسی بھی زبان میں ممکن ہیں، لیکن بھجن کا معاملہ الگ ہے۔ دوہے اور گیت سے اس کا کچھ جوڑ بیٹھتا ہے، لیکن بھجن کی لفظیات بڑی حد تک بھجن کی لفظیات ہے، یہ لفظیات ہے تو بھجن ہے یہ نہیں تو بھجن نہیں۔ بھجن کے خاص موٹو اور خاص امیج ہیں۔ یہ ہیں تو بھجن کی خاص معنویت ہے، یہ نہیں تو بھجن بھجن نہیں۔ بھجن کی خاص معنیاتی فضا بھجن کی خاص لفظیات اور خاص امیجری سے ہے، اس امیجری کو بدل دیں تو پوری معنیاتی فضا بدل جائے گی اور کیف و کم بھی وہ نہیں رہے گا۔

اردو شاعروں نے یوں تو ہندی اصناف یعنی گیت اور دوہے میں کیا کیا داد سخن نہیں دی، لیکن بھجن کی دنیا میں اردو والوں کی آمد و رفت زیادہ معلوم نہیں۔ اس لیے جب پتہ چلا کہ ساحر لدھیانوی (1921-1980) نے اس کوچہ کی بھی ہوا کھائی تھی تو قدرے تعجب ہوا۔ بیشک ساحر قادر الکلام شاعر تھے اور انھوں نے کئی کئی اسالیب میں اور کئی کئی ہیئتوں میں اور اصناف میں کلام کیا ہے۔ لیکن بھجن کے لیے تو الگ ذہنی فضا چاہیے اس کے تو تقاضے ہی دوسرے ہیں۔ اردو گو ہندستانی ہندی پر متصرف ہوتا ہی ہے لیکن بھجن میں نپٹ ہندستانی سے کام نہیں چلتا، اس کے لیے تو برج یا اودھی یا راجستھانی میں پیرا ہوا آدمی چاہیے یا پھر سور داس، بہاری، تلسی داس میرا بائی کا شناسا، اور فقط شناسا نہیں ان شعریاتی روایتوں میں رچا بسا ہوا۔ ساحر کو نہ بولیوں ٹھولیوں یعنی برج اور اودھی وغیرہ سے علاقہ تھا، نہ ہندی سنسکرت سے۔ پھر وہ کیوں کر پار اتر سکتا تھا۔ بھجن کا تو ڈسکورس ہی الگ ہے، اس پر دسترس ہوگی تو بات بنے گی ورنہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس شبہ کے ساتھ میں نے ساحر کے بھجنوں کو ٹٹولا۔ مجموعوں میں متن نہ ملا، نمبروں میں لے دے کے ایک دو۔ مجبوراً کھوجنا سننا پڑا۔

متن کو جوڑا، پڑھا، دوبارہ پڑھا، پھر سنا، گونج رہ گئی۔

ابتدا ان بھجنوں سے کرتے ہیں جن پر کرشن کی راس کا اثر ہے یہ برہ کی پیڑا اور دردِ محبت میں ڈوبے ہوئے بھجن ہیں:

آن ملو آن ملو شیام سانورے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی سی رے

برندا بن کی کنج گلین میں تم بن جیارا نہ لاگے
نس دن تھاری باٹ نہاریں بیا کل نین ابھاگے
اب ہی ایسی دشا ہے من کی کیا ہوئی ہے پھر آگے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی سی رے
آج لگا ہے جمنا تیرے مرلی مدھر بجائی

رچھوں جو نہ بھیجی موہن تمین نے کھوئی کھبریا
ہو جیے اک برج بالا رو رو کر باوریا
دھیر بندھا جا۔دھیر بندھا جا،مکھ دکھلا جا،نٹ ناگر سانوریا رے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی سی رے
آن ملو آن ملو شیام سانورے

ساحر کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ساحر کو بچپن ہی سے سنگیت سے مناسبت تھی۔ سنگیت سے مناسبت کا فائدہ بھجنوں کو پہنچنا فطری بات ہے، لیکن جو بات تعجب خیز ہے وہ یہ کہ ساحر کی بچپن کی زبان لدھیانوی پنجابی کو بھجنوں کی لفظیات سے دور کی بھی نسبت نہیں ہوسکتی۔مندرجہ بالا بھجن کے بول برج بھاشا اور راجستھانی کے لہجے میں نہائے ہوئے ہیں۔سوسیئر کا کلیدی قول ہے کہ آج تک کسی نے کئی سگنیفائڈ بغیر سگنیفائر کے نہیں دیکھا۔معنیات جو بھی قائم ہوتی ہے بغیر 'نشان' یعنی سائن کے نہیں۔شیام سانورے، برج میں اکیلی رادھے، برندا بن کی کنج گلین، باٹ نہاریں نین ابھاگے، جمنا تیرے مرلی مدھر بجائی، راس رچائی، یا نٹ ناگر سانوریا رے، میں کسی نشان کو بدل دیجیے، ساری معنیاتی فضا بدل جائے گی، بول تو شاید رہ جائیں، بھجن نہیں رہے گا۔ساحر کی ساحری اسی میں ہے کہ اس نے بھجن کی لفظیات کا اس خوبی سے صرف کیا ہے کہ

کرشن اور بیاکل گوپیوں کی راس لیلا سے شردھا، عقیدت اور سرشاری کی جو توقعات وابستہ ہیں وہ تمام وکمال جمالیاتی کیف وکم کے ساتھ پوری ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں بھگتی کے دو دھارے جانے جاتے ہیں، کرشن بھگتی اور رام بھگتی۔ دونوں کی بنیاد عشق ومحبت جذبات کی سرشاری اور تجسیمیت پر ہے۔ لیکن کرشن کی راس جہاں رومان پروری اور رنگینی وحسن کاری کا پہلو رکھتی ہے، رام کی روایت میں ایثار وقربانی، فرض شناسی اور وفا شعاری کی صفات نمایاں ہیں۔ ساحر نے دونوں طرح کے بھجن کہے ہیں لیکن رومانی افتادِ ذہنی کی وجہ سے ساحر کو زیادہ مناسبت کرشن جی کی معنویت رکھنے والے بھجنوں سے ہے۔ بنگال کے سوامی چیتنیہ کی روایت میں کرشن کا تصور 'پربھو' کے طور پر کیا گیا ہے۔ نیچے کا بھجن خالص کرشن بھگتی کا بھجن ہے۔ دیگر تمام ہندستانی بھاشائی شاعری کی طرح اس کی خصوصیت خاصہ بھی اس کا برہن کی زبان سے کلام ہونا ہے جو محبت میں چور ہجر وفراق کی اس حد تک ماری ہوتی ہے کہ برہ کی پیڑا اور دیہہ کی اگنی نے تن من کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ بن پریتم گھر آنگن سونا ہے۔ جیون کنگنا مرجھا رہا ہے۔ پیار کے دو بول سنائی دیں تو جیون دھن مل جائے اور پھر سے آس بندھ جائے اس تناظر میں میرابائی کی روح صاف جھلکتی ہے اور بولوں میں بھی کچھ ٹکڑے اس پریم دیوانی کے درد واضطراب کے بھی آگئے ہیں:

پربھو تیرو نام، جو دھیایے پھل پائے، سکھ لائے تیرو نام
پربھو تیرو نام
تیری دیا ہو جائے تو داتا، جیون دھن مل جائے
سکھ لائے تیرو نام، جو دھیائے تیرو نام
پربھو تیرو نام
تو دانی تو انتریامی، تیری کرپا ہو جائے تو سوامی
ہر بگڑی بن جائے، جیون دھن مل جائے
سکھ لائے تیرو نام، جو دھیایے تیرو نام
پربھو تیرو نام

ان بھجنوں میں کرشن کا براہ راست ورنن نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ کس سچویشن کے لیے ان کو لکھا گیا ہوگا، نہ ہی ہم کو کسی سچویشن سے سروکار ہے۔ کیونکہ دوسرے ذرائع سے پیدا کی گئی معنویت سے یہاں غرض نہیں، غرض ہے تو اس معنویت سے جو متن سے متعلق ہے، اور لطافت وکیفیت یا اثر آفرینی جو کچھ ہے، اس کی قبولیت کی راہ متن کے نظام نشانات کی رو سے ہے۔ پہلے دو بھجنوں کی طرح اس میں بھی عام بولوں سے کام لیا

گیا ہے اور اصل فضا امیجری سے ابھاری گئی ہے۔ پچھلے بھجن کی مرکزیت گیان دھیان (جو دھیائے پھل پائے) اور نام کے جاپ (پربھو تیرو نام، سکھ لائے تیرو نام) سے تھی، جبکہ زیر بحث بھجن کا مرکزی نشان اندر کی آگ، جدائی تپش اور پیاس کا ہے، یعنی بانہہ پکڑنے، انگ لگانے اور شیتل ہو جانے کا ہے۔ ہردے کی پیڑا/ دیہہ کی اگنی/ کیسی جاگی یہ اگن/ جیا دھیر دھرن نہیں پائے/ اتنی برسا دو/ سے اشارہ پریم سُدھا کی طرف ہے۔ جنم جنم کی داسی انتر گھٹ تک پیاسی ہے پریم سُدھا کی ورشا ہو تو تن من سب جل تھل ہو جائے، اور وجود جو ظاہر بھی ہے اور باطن بھی سب شیتل ہو جائے:

آج سجن موہے انگ لگالو جنم سپھل ہو جائے
ہردے کی پیڑا دیہہ کی اگنی سب شیتل ہو جائے

کیے لاکھ جتن مورے من کی تپن مورے تن کی جلن نہیں جائے
کیسی لاگی یہ لگن کیسی جاگی یہ اگن جیا دھیر دھرن نہیں پائے
پریم سدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے

ساحر کے یہاں ایسے بھجن بھی ہیں جو رام کی روایت سے متعلق کہے جا سکتے ہیں۔ یہاں بحث مذہبی عقیدت سے نہیں، شاعر کی ذہنی تخلیقی تحریک سے ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، رام کی مرکزیت اور معنویت کرشن کی روایت سے یکسر مختلف ہے۔ ساحر کے اس نوع کے بھجن بھی اپنے سبک، رواں اور رسیلے انداز اور مخصوص امیجری اور لفظیات کے باعث غور طلب ہیں۔ ان بھجنوں کا غالب رویہ اخلاقی اور روحانی ہے۔ کام، کرودھ اور لوبھ کا مارا جگت نہ آیا راس، یا جب جب رام نے جنم لیا تب تب پایا بن باس، ایسے مصرعے ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان میں اخلاقیات بھی ہے اور حق و باطل یا نیک و بد کی ابدی اور ازلی کشاکش کی تجسیم بھی جو کشش بھی رکھتی ہے اور لطف و اثر بھی:

کل جگ تک چلتی آتی ہے ست جگ کی یہ ریت
سب کچھ ہار چکے جب اپنا تب ہو رام کی جیت
جگ بدلے پر بدل نہ پایا اب تک یہ اتہاس
جب جب رام نے جنم لیا تب تب پایا بن باس

اسی نوع کا ایک اور بھجن ہے 'تو را منوا کیوں گھبرائے رے'، جس کا ٹیپ کا ٹکڑا ہے، رام جی کے دوار سے، جو

ساری فضا کو رام کی روایت سے رنگ دیتا ہے:

تو رامنوا کیوں گھبرائے رے

لاکھوں دین دکھیارے پرانی جگ میں مکتی پائے رے، رام جی کے دوار سے

بند ہو یہ دوار کبھی نہ یگ کتنے ہی بیتے

سب دواروں پر ہارنے والے اس دوار پر جیتے

لاکھوں پتت لاکھوں پچھتائیں، پاون ہو کر آئے رے

رام جی کے دوار سے، تو رامنوا کیوں گھبرائے رے

دین دکھیارے، پرانی، مکتی، پتت، پچھتائیں، پاون وغیرہ لفظیات سے کام لینا آسان نہیں، ان میں سے ہر نشان اپنی معنیاتی فضا اور کیفیت رکھتا ہے۔ اور تو اور مہانندا اور اہل لیہ بائی کی حکایتوں کی طرف اشاروں کا کامیاب صرف ساحر کی اساطیری گرفت پر دلالت کرتا ہے۔

اب آخر میں ایک نظر ان بھجنوں پر بھی جو کرشن اور رام کی شاعرانہ روایت سے ہٹ کر ہیں۔ ان کو بھی دو شقوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک وہ جو گیان دھیان یا اخلاقی تلقین یا ضبط نفس کے موضوعات سے قائم ہوئے ہیں۔ دوسرے جو مذاہب کی برابری یا بین مذہبی رواداری اور اتحاد پسندی کی معنیاتی فضا کو ابھارتے ہیں۔ گیان دھیان کے بھجنوں میں زیادہ زور بے ثباتی کائنات، جنم مرن اور آخرت پر ہے، یعنی یہ دنیا جنم مرن کا کھیل ہے۔ جو آیا ہے اس کو جانا ہی ہے۔۔ وہ نرموہی موہ نہ جانے جن کا موہ کرے، جیون چڑھتی دھوپ ہے جس کو ڈھلنا ہی ہے، غرضیکہ سوائے صبر یا دھیر دھرنے کے کوئی چارہ نہیں:

من رے تو کا ہے نہ دھیر دھرے

وہ نر موہی موہ نہ جانے جن کا موہ کرے

اتنا ہی اپکار سمجھ کوئی جتنا ساتھ نبھا دے

جنم مرن کا میل ہے سپنا یہ سپنا بسرا دے

کوئی نہ سنگ مرے

من رے تو کا ہے نہ دھیر دھرے

اسی طرح کا ایک اور بھجن ہے: تو رامن درپن کہلائے، یہ بھی نہایت مزے کا گیان بھجن ہے جس کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ شیشہ جو بغل میں ہے اسی میں تو پری ہے۔ یہ بھگتی اور تصوف کا پرانا مسئلہ ہے کہ ذات واجب الوجود

یا شعورِ کلی شعورِ انفرادی سے الگ نہیں اور قلب اس کا مرکز ہے۔ قلب آئینے کی طرح ہے، اس کو صیقل کرنے ہی سے ذات کی جلوہ گری ممکن ہے۔ ہندستانی روایت میں چونکہ ہر شے کی تجسیم دیوی دیوتاؤں سے کی جاتی ہے، اس لیے کہا ہے کہ من (قلب) ہی دیوتا، من ہی ایشور، من سے بڑا نہ کوئی:

من ہی دیوتا من ہی ایشور من سے بڑا نہ کوئی
من اجیارا جب جب پھیلے جگ اجیارا ہوئے
اس اجلے درپن پر پرانڑی دھول نہ جمنے پائے
تورا من درپن کہلائے
سکھ کی کلیاں دکھ کے کانٹے من سب کا آدھار
من سے کوئی بات چھپے نہ من کے نین ہزار
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی من سے بھاگ نہ پائے
تورا من درپن کہلائے
بھلے برے سارے کرموں کو
دیکھے اور دکھائے
تورا من درپن کہلائے

دوسرے بند سے ظاہر ہے کہ من کو ہر شے کا آدھار کہا ہے اور یہ کہ انسان لاکھ کوشش کرے وہ من سے بھاگ نہیں سکتا اور من اچھے برے سب سے انسان کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ گویا من ضمیر بھی ہے قلب بھی اور ذہن و شعور بھی۔ ان بھجنوں سے ہٹ کر ساحر کا ایک معرکے کا بھجن گنگا پر بھی ہے۔ جس کی حیثیت ہندستانی ثقافتی زندگی میں لائف لائن کی ہے۔ گنگا وہ پانی ہے جس سے زندگی کی آب ہے۔ ہندستانی روحانیت سے، فکر و فلسفہ سے، اساطیر اور دیوی دیوتاؤں سے، ویدوں، اپنشدوں، پرانوں سے، یوگیوں رشی منیوں سے، اور ہندستانی جمالیات اور شعریات پر بنیادی متون اور ان کے بھاشیہ اور مہا بھاشیہ لکھنے والوں سے، آب رودِ گنگا کا جو رشتہ ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ ساحر نے گنگا کی مہما کا جو بکھان کیا ہے اس میں پانی کے برابر بہنے کی، زماں کے تسلسل کی اور لفظوں کے دروبست کی جو موسیقیت ہے، بغیر کمالِ فن پیدا نہیں کی جاسکتی:

گنگا تیرا پانی امرت جھر جھر بہتا جائے
یگ یگ سے اس دیش کی دھرتی تجھ سے جیون پائے
دور ہمالے سے تو آئی گیت سہانے گاتی

بستی بستی جنگل سکھ سندیش سناتی
تیری چاندی جیسی دھارا میلوں تک لہرائے
گنگا تیرا پانی امرت جھر جھر بہتا جائے
کتنے سورج ڈوبے ابھرے گنگا تیرے دوارے
یگوں یگوں کی کتھا سنائیں تیرے بہتے دھارے
تجھ کو چھوڑ کے بھارت کا اتہاس لکھا نہ جائے
گنگا تیرا پانی امرت جھر جھر بہتا جائے
یگ یگ سے اس دیش کی دھرتی تجھ سے جیون پائے

بھجنوں کی ایک زمین بھگتی کا مرکزی مسلک یعنی انسانی مساوات، بین مذہبی رواداری اور اتحاد پسندی بھی ہے۔ بنی نوع انسان کو بلا تفریق مذہب وملت برابر جاننا، برابر سمجھنا اور سب سے برابر کا سلوک کرنا بھگتی اور تصوف کا بنیادی مسئلہ ہے۔ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں بالخصوص ایسے بھجن بطور کیرتن گائے جاتے تھے اور اکثر سماجی تقریبات میں بھی ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔ افسوس کہ ایسی بہت سی باتیں سیاسی مصالح کی وجہ سے وظیفۂ لب ہو کر رہ گئی ہیں۔ یعنی جتنا زیادہ ہم سیکولرازم کا ذکر کرتے ہیں، اتنا ہی عملی زندگی میں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ان چیزوں کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔ کیونکہ مقصد براری فقط ورد سے ہو جاتی ہے، گفتار سے کام نکلتا ہو تو کردار کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایسے میں ایشور اللہ کو ایک سمان کہنے اور سمجھنے والے معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ ساحر نے یقیناً گاندھی جی کے یہاں کے بھجنوں کے بولوں میں تصرف کیا ہوگا۔ اس طرح کے ایک نہیں دو گیت ہیں، کیا مصرعے ہیں اور کیا فضا بندی ہے:

اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام
سب کو سمتی دے بھگوان
اللہ تیرو نام
او سارے جگ کے رکھوالے
نربل کو بل دینے والے
بلوانوں کو دے گیان
سب کو سمتی دے بھگوان

اللہ تیرو نام

ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سمتی دے بھگوان
سارا جگ تیری سنتان
ایشور اللہ تیرے نام

اسی طرح کا ایک بھجن اسکولی بچوں کی دعا کے طور پر بھی رائج ہے جس میں رام رحیم کرشن کریم یسوع مسیح اور ابراہیم کو یاد کیا گیا ہے، اور تمام مذہبوں کی اس تعلیم کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ اصل چیز کرم (عمل) ہے۔ اگر عمل اچھا نہیں تو دکھاوے کے مذہب سے کیا حاصل۔ کوئی مذہب بدی یا نفرت یا تشدد کی تعلیم نہیں دیتا، اور سب سے بڑی سچائی نیک اور صالح عمل میں ہے۔ کئی اسکولوں میں یہ بھجن آج بھی بطور صبح کی دعا کے سنا جاتا ہے:

رام رحیم کرشن کریم
یسوع مسیح اور ابراہیم
سب کی ہے اتنی تعلیم
بھلے کرم کر دنیا میں یہ کرم ہے نیک کمائی
انھیں کرموں میں چھپی ہے سارے دھرموں کی سچائی
جس نے اچھے کرم کیے ہر دھرم کی لاج نبھائی
رام رحیم کرشن کریم، یسوع مسیح اور ابراہیم
سب کی ہے اتنی تعلیم

بھجن کی شعری کائنات وسیع بھی ہے اور محدود بھی، وسیع اس لیے کہ روحانیات یا اخلاقیات بھی کرۂ آسمانی کی طرح ہے جو آدی ہے اور انت بھی۔ اور محدود اس لیے کہ شعور انفرادی کی عقیدت یا شردھا بہر حال عقیدے کا معاملہ ہے اور عقیدہ وحدانی ہوتا ہے اس میں یکتائی ہے دوئی نہیں۔ ساحر کی خوبی یہ ہے کہ ہر دو اعتبار سے اس نے بھجن کے شعری تقاضوں کا حق ادا کیا ہے اور جہاں جیسی فضا ہے ویسی معنویت قائم کی ہے۔ کرشن لیلا ہو یا رام بھگتی یا گیان دھیان کے مسائل ہوں یا ایشور اللہ، رام رحیم یا کرشن کریم کی، کبیر یا نانک کی ہمہ گیر اور لازوال روحانی روایت ہو، ساحر نے اسے تخلیقی محویت سے کچھ اس طرح متشکل کیا ہے کہ مدتوں اس کے رس اور لطافت میں کمی نہ آئے گی۔

گلشن کھنہ، لندن

ساحر لدھیانوی کے فلمی نغمے

ادب کے ساتھ ساتھ ساحر لدھیانوی کو بچپن سے ہی فلمی دنیا سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ انہوں نے بہت سی فلموں کی تصویریں ایک بڑی سی کاپی میں چسپاں کر رکھی تھیں اور کئی بار ممبئی جانے کا ارادہ بھی کیا تھا مگر اکیلے وہاں جانے کا شاید حوصلہ نہیں تھا۔ اگست 1947 میں جب ملک کی تقسیم ہوئی تو ساحر کچھ مدت تک اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ میکلوڈ روڈ، لاہور، میں مقیم رہے تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ ممبئی چلے گئے۔ ان کا مجموعہ 'تلخیاں' خاص و عام میں بہت مقبول ہو چکا تھا۔ ممبئی میں قیام کے دوران ایک سیٹھ نے اپنی فلم کے گانے لکھوانے کے لئے انہیں دفتر میں بلوایا اور ساحر کی عمر اور چہرے مہرے کو دیکھ کر پوچھا ''کیا آپ ہی ساحر لدھیانوی ہیں؟''

''جی ہاں میں ہی ساحر ہوں۔''

ساحر صاحب کا جواب پا کر اس سیٹھ نے اپنی میز کی دراز کھولی اور حیرت سے ساحر کی طرف تکتے ہوئے 'تلخیاں' نکال کر پوچھا ''کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟''

''جی ہاں یہ کتاب میری ہی تحریر کردہ ہے۔'' ساحر نے جواب دیا تھا۔

اس سیٹھ نے دوبارہ ساحر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں تم ساحر نہیں ہو سکتے۔ وہ تو ایک عظیم شاعر ہے اور تم تو ابھی بچے ہو۔'' یہ کہہ کر ساحر کو وہاں سے رخصت کر دیا۔

ساحر جب پہلی بار ممبئی پہنچے تو وہ تک بند فلمی شاعروں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فلمی شاعری بھی ادبی شاعری کی طرح وقیع ہو جائے۔ مگر ان دنوں دینا ناتھ مدھوک جیسے شاعر کا ممبئی کی فلم انڈسٹری میں طوطی بولتا تھا اور ان کے لکھے ہوئے فلمی گیت ہرا را غیرہ گنگناتا پھرتا تھا مگر ساحر نے تہذیب سے گرے ہوئے یا سستی شہرت حاصل کرنے والے گیت کبھی نہیں لکھے۔ ممبئی میں ان کی ادبی شاعری کی آواز دن بدن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مشاعروں، ادبی محفلوں اور آل انڈیا ریڈیو پر اپنی شعری تخلیقات پیش کرتے رہتے تھے اور وقت کے ساتھ ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ برصغیر کے انتہائی مقبول شاعر مانے جانے لگے تھے اور ایسے شاعر کو لوگ سننے اور ملنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ ساحر جب بھی مشاعروں میں جاتے تو ان کی

پذیرائی کے لئے شہر کا شہر اُمڈ آتا تھا کیونکہ ساحر کی شاعری روایتی شاعری سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ اپنے احساس اور تجربات کو مارکسی فلسفے میں سمو کر شعر کہنے کا فن جانتے تھے۔ انہوں نے جمہور اور دخترانِ جمہور کے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو اور اپنے قلم کو وقف کر دیا اور کہا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر ممبئی پہنچ کر فلمی نغمہ نگار بننے کے قریب ڈیڑھ دو برس تک جدوجہد کرتے رہے مگر کامیابی کوسوں دور تھی۔ وہ جب بھی کسی فلم اسٹوڈیو میں جاتے تو بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائریکٹر انہیں دیکھ کر احتراماً کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن جب فلم کے گیتوں کی بات چلتی تو سب یہ کہتے ''ساحر آپ برصغیر کے بلند مرتبہ شاعر ہیں اور ہم آپ کا اور آپ کی شاعری کا بہت احترام کرتے ہیں بلکہ آپ کے دیرینہ مداح ہیں لیکن فلم پر لاکھوں روپوں کی لاگت آتی ہے اس لئے آپ کے گیت لے کر ہم اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ اچھا ادبی شاعر فلم کے لئے کامیاب نغمہ نگار بھی ثابت ہو جائے۔'' یہاں تک کہ مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف نے، جو ایک کامیاب پروڈیوسر، ڈائریکٹر تھے اور 'ضدی' 'آرزو' جیسی ہٹ فلمیں بنا چکے تھے ایک دن ساحر سے کہا تھا ''ساحر صاحب آپ کی شاعری اور ادبی صلاحیتوں سے ہمیں بالکل انکار نہیں۔ دنیائے سخن میں آپ کا امتیازی مقام ہے اس کے باوجود آپ سے فلم کے گیت لکھوانا ایک بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف ہے۔''

ساحر کی فلمی جدوجہد کے ایام طویل اور کڑے ہوتے جا رہے تھے اور ابھی تک قسمت نے یاوری نہیں کی تھی اور ساحر اپنے دوستوں کے ساتھ اندھیری سے چرچ گیٹ تک بس یوں ہی گھومتے رہتے تھے۔ ایک دن وہ ماٹونگا میں پروڈیوسر موہن سہگل کے گھر بیٹھے تھے کہ سہگل صاحب نے ساحر لدھیانوی سے کہا۔ ''ساحر ان دنوں فلم انڈسٹری میں موسیقار ایس ڈی برمن کی بہت مانگ ہے لیکن اسے کوئی ڈھنگ کا گیت لکھنے والا نہیں ملتا۔ تم کل صبح جا کر اس سے مل لو۔ وہ نئی صلاحیتوں کی قدر کرنے والا میوزک ڈائریکٹر ہے۔ اگر تم نے اس کی مرضی کے مطابق پسند کا گانا لکھ لیا تو یقیناً تم سے پوری فلم کے گیت لکھوائے گا۔'' موہن سہگل کی بات ساحر کے دل میں اتر گئی۔ دوسرے دن وہ ایس ڈی برمن سے وقت لے کر اس سے ملنے گرین ہوٹل کھار گئے۔ وہاں پہنچ کر ساحر نے اپنا تعارف کرایا۔ برمن دا بنگالی تھے اور وہ ساحر کے ادبی مقام کو بھی نہیں پہچانتے تھے پھر بھی انہوں نے ساحر کو خوش آمدید کہا اور فلم کے گانے کی دھن اور سچویشن سمجھائی۔ ان دنوں فلم انڈسٹری میں یہ رواج عام تھا کہ نغمہ نگار سے پہلے موسیقار سے کنٹریکٹ کیا جاتا تھا۔ اس کے گیتوں کی مختلف دھنیں سن لی جاتی

تھیں اور جو دھنیں پرڈیوسرڈائریکٹر کو پسند آجاتی تھیں ان کے لئے ایگریمنٹ کر کے اپنی آنے والی فلم کے محفوظ کرلیا جاتا تھا۔ دھنوں کے بعد مسئلہ گیت کے بولوں اور سچویشن کا ہوتا تھا اور پھر اسی سچویشن کے مطابق نغمہ نگاروں سے بول لکھوائے جاتے تھے۔ ایس ڈی برمن ساحر لدھیانوی کو لے کر کاردار اسٹوڈیو پہنچے اور وہاں پر ساحر نے برمن دا سے فرمائش کی کہ وہ اپنی دھن ایک بار پھر سنائیں۔ برمن ہارمونیم پر دھن سنا رہے تھے اور ساحر صاحب گیت لکھتے جا رہے تھے۔ بول تھے:

''ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں

رُت ہے جواں تم ہو کہاں کیسے بلائیں... ٹھنڈی ہوائیں...''

گانے کے بول پروڈیوسر ڈائریکٹر اے آر کاردار کو بہت پسند آئے اور انہوں نے گیت کو اپنی فلم 'نوجوان' میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد ساحر لدھیانوی اور ایس ڈی برمن کی ایسی جوڑی بنی جو فلم انڈسٹری پر چھا گئی اور فلم انڈسٹری کو بہترین گیتوں اور کانوں میں رس گھولنے والی دھنوں سے روشناس کرایا۔ دیوانند نے جب اپنے ادارے نوکیتن کے لئے فلم بازی بنانے کا اعلان کیا تو گیت ساحر لدھیانوی سے ہی تحریر کروائے گئے۔ ایس ڈی برمن نے انہیں اپنی خوبصورت دھنوں سے سجایا اور سنوارا۔ بازی کے گیت گلی گلی اور ہر کوچے میں گونجنے لگے۔ ''سنو گجر کیا گائے سے گزرتا جائے'' بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اور پھر اسی فلم کا ایک گیت تو ذہنوں کو چونکا دینے والا تھا:

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے

اپنے پہ بھروسہ ہے تو اک داؤ لگالے

ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں

انصاف ترے ساتھ ہے الزام اٹھالے

ساحر کی یہ آواز، یہ آہنگ فلمی گیتوں کے لئے نیا اور انوکھا تھا۔ ساحر اپنے ادبی گیتوں کے زور پر اپنی اس آواز کو روز بروز تیز کرتے چلے گئے۔ 'بازی' باکس آفس پر نہایت کامیاب رہی تھی۔ اس کے بعد ساحر لدھیانوی کو اپنا مستقبل درخشاں نظر آنے لگا تھا اور ان میں بلا کی خود اعتمادی آگئی تھی۔ اب ساحر کو بہت سی فلموں کے گیت تحریر کرنے کی آفرز آنے لگی تھیں۔ برمن دا اور دوسرے کئی موسیقاروں کے ساتھ ان کے گیتوں کی وجہ سے فلمیں سپر ہٹ ہوتی گئیں اور ساحر شہرت کی بلندیوں پر اڑنے لگے تھے۔ فلم برسات کی رات میں ساحر کی جوڑی موسیقار روشن کے ساتھ تھی۔ ساحر صاحب نے اس فلم کے جو گیت تحریر کیے وہ اپنی مثال آپ تھے اس فلم کی یہ قوالی:

نہ تو کارواں کی تلاش ہے نہ تو راہبر کی تلاش ہے
میرے شوقِ خانہ خراب کو تری رہ گزر کی تلاش ہے

اور پھر یہ سدا بہار اور دل نشین گیت:

میں نے شاید تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقین لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ یہ گھنیری زلفیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو

برسات کی رات اپنے خوبصورت اور سدا بہار نغموں کی وجہ سے باکس آفس پر توقع سے زیادہ کامیاب رہی تھی۔ ہدایت کار بی آر چوپڑا نے بھی اپنی سپر ہٹ فلموں، گمراہ، نیا دور، سادھنا، دھول کا پھول اور ہمراز جیسی فلموں کے گیت ساحر لدھیانوی سے تحریر کروائے تھے۔ چوپڑا صاحب کی یہ تمام فلمیں ساحر کے گیتوں کی وجہ سے کامیابی کے جھنڈے گاڑتی چلی گئی تھیں۔ ہدایت کار گرو دت فلم 'پیاسا' کے نغمے بھی ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے اور ان کے انہی نغموں کے باعث 'پیاسا' نے ملک بھر میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس فلم میں پیش کی گئی ساحر کی یہ نظم، جو موسیقار ہیمنت کمار نے گائی تھی آج بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنی فلم کی ریلیز کے وقت تھی:

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کو پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا
خوشیوں کی منزل ڈھونڈی تو غم کی گرد ملی
چاہت کے نغمے چاہے تو آہ سرد ملی
دل کے بوجھ کو دونا کر گیا جو غم خوار ملا

ساحر لدھیانوی نے ایک نغمہ نگار کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں داخل ہو کر فلمی گیتوں کے معیار کو بہت بلند کیا اور ان کو ادبی رنگ میں رنگ کر ایک طرف حسنِ بیاں عطا کیا تو دوسری طرف تخیل کی لطافت اور جذبات کی پاکیزگی بخشی۔ ساحر نے ہندی فلموں کو ایسے گیت بھی دیے جو سیاسی اور سماجی شعور سے بھی لبریز تھے۔ یہ ایک بہت بڑا اقدم تھا جو ساحر نے انتہائی دلیری سے اٹھایا تھا۔ انہوں نے بہت سے دوسرے فلمی شاعروں کی طرح فلمی دنیا کو گندگی میں نہیں ڈبویا تھا بلکہ اپنے قلم کی قوت سے فلمی نغموں کو اگر ایک طرف حسن لطافت و نزاکت،

رکسک بخشی تو دوسری طرف سماجی، مادی اور اقتصادی شعور بھی دیا۔ سماجی شعور سے بھر پور عورت کی بے حرمتی کے بارے میں یہ نظم جو بی آر چوپڑہ کی فلم 'سادھنا' میں پیش کی گئی تھی ملاحظہ فرمائیں:

عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا
تلتی ہے کہیں دیناروں میں بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے، جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

ساحر صاحب نے ادب کے ساتھ ساتھ فلم کے میدان میں جو کارنامے سر انجام دیئے انہیں بالی وڈ کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکے گی۔ انھوں نے بے تکے لفظوں کے جنگلوں میں با مقصد شاعری کے گلاب کھلائے۔ اور اپنے فلمی نغموں کو ایک نرالا اور پُر وقار انداز عطا کیا تھا۔ ساحر کے گیتوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا ترقی پسندانہ مواد ہوتا تھا۔ انھوں نے بڑی جرأت اور قوت کے ساتھ اپنے گیتوں میں یہ آواز اٹھائی تھی۔ وہ ہمارے ناحق اور غیر مساوی سماج کے مخالف تھے، اسی لئے انھوں نے یہ نظم تحریر کی تھی:

وہ صبح کبھی تو آئے گی، وہ صبح کبھی تو آئے گی
دولت کے لئے جب عورت کی عصمت کو نہ بیچا جائے گا
چاہت کو نہ کچلا جائے گا، غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتوتوں پر جب یہ دنیا شرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی، وہ صبح کبھی تو آئے گی

ساحر کی یہ نظم فلم 'پھر صبح ہوگی' میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ساحر کے ان درد بھرے نغموں کو کون بھلا سکتا ہے:

میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا
جائیں تو جائیں کہاں
سمجھے گا کون یہاں، درد بھرے دل کی زباں...

اور پھر گرو دت کی فلم پیاسا میں جب یہ نظم پیش کی گئی تو اس نے سارے ہندوستان میں دھوم مچادی تھی:

یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا

یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے جھوٹے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

ساحر نے نہ صرف ادبی شاعری میں نام کمایا بلکہ فلمی دنیا میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ان کی یہ مشہور نظم جو شاید انہوں نے اپنے لئے تحریر کی تھی اور یش چوپڑا کی باکس آفس پر سپر ہٹ فلم 'کبھی کبھی' میں پیش کی گئی تھی:

میں پل دو پل کا شاعر ہوں، پل دو پل مری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے، پل دو پل مری جوانی ہے
کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے، تم سے بہتر سننے والے
کل کوئی مجھ کو یاد کرے کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے کیوں وقت اپنا برباد کرے

ساحر لدھیانوی نے اپنے بے شمار معیاری نغموں کے ذریعہ فلمی شاعری کو عزت بخشی۔ وقار بخشا اور اردو شاعری کو زندہ رکھا۔ ان کی فلمی شاعری پُر معنی، مسحور کن اور انقلابی تھی۔ ان کی شاعرانہ زندگی کے مختلف روپ تھے جن میں امنگیں تھیں، تقاضے تھے، ناانصافی کی شکایات تھیں۔ وہ فلمی گیتوں کی آبرو تھے اور انہیں اپنی فلمی شاعری پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ موسیقاروں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اردو شاعری کو دوام اور احترام کی منزل پر پہنچانے کے بعد وہ ایک نئی منزل کی طرف چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے۔ آج ساحر ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کے لاکھوں سدا بہار اور شاداب ادبی اور فلمی نغمے تاابد ہمارے دلوں میں گونجتے رہیں گے۔ ■■

ہمارے حال پہ اے ہنسنے والے بھولتا کیوں ہے
کہانی اور کچھ ہوتی اگر ہم بے وفا ہوتے

☆☆☆

اے داورِ محشر! ہمیں فردوس عطا ہو
دنیا میں جہنم کی سزا کاٹ چکے ہیں

خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم

وسیم فرحتؔ کارنجوی (علیگ)

ایک قدم کا فاصلہ

گزشتہ دنوں سہ ماہی اردو کے ''ساحر لدھیانوی نمبر'' کے متعلق برادرم شمیم طارق صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ شمیم بھائی نے کہا کہ 'ظ۔ انصاری نے ساحرؔ کے متعلق بڑی 'پیاری' رائے دی ہے کہ 'ساحر کی علمی اور فلمی شاعری میں ایک قدم کا فاصلہ ہے''۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسی ''ایک قدم کے فاصلے'' کو اپنے مضمون کا عنوان بنایا جائے کہ اس ایک قدم کو میں نے محسوس بھی کیا ہے اور والدِ گرامی مرحوم خلیل فرحتؔ کارنجوی کے توسط سے اس کا گواہ بھی رہا ہوں۔

پیش تر اس کے کہ میں ''ایک قدم کا فاصلہ'' طے کروں، ساحرؔ کی شاعری کے متعلق کچھ خیالات کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں۔ ساحرؔ کی شاعری کو ہم تین ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (واضح رہے کہ مذکورہ تینوں ہی ابواب میں ترقی پسند نظریہ کارفرما رہا ہے۔) اول باب تو وہ ہے جسے بعض ناقدین ادب ''ایک مخصوص عمر کی شاعری'' سے معنون کرتے ہیں۔ دوم وہ کہ جو ہر عہد کے، ہر عمر کے پیمانوں پر کھری اترتی ہے، جسے ساحرؔ کی لازوالیت کہا جائیگا۔ اور سوم وہ جو سنیما کے لیے لکھی گئی ہے۔ اول اور سوم باب بعضے ٹکراؤ کا شکار بھی ہوتا رہا ہے۔ ان تین ابوب کو کچھ تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں۔

بابِ اول: ''مخصوص عمر کی شاعری''

ساحرؔ کی شاعری کا وہ حصہ جہاں ساحرؔ کسی قطعی نوجوان شاعر کی طرح فکر کرتے ہیں، اندازِ بیاں بھی جہاں نوعمری کا مظاہرہ کرتا ہو، ایسی شاعری مخصوص عمر کی شاعری کہی جا سکتی ہے۔ ایام جوانی میں عوام تو خیر جانے دیجیے، خود شاعر بھی ایک خاص زاویے سے سوچتا ہے۔ اس کی فکر کے دائرے محدود ہوتے ہیں، بیش تر تغزل کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہی وہ خاص عمر ہے کہ جہاں آدمی معشوق کے گالوں اور بالوں کی شان میں قصیدہ خوانی کرتا ہے، سننے اور پڑھنے والے حضرات بھی ایک خاص عمر تک محبوب کے گال، بال، بانہیں، ہجر

وصال، لب و عارض وغیرہ عنوانات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے سامعین اور قارئین کی عمر بڑھتی ہے، شعور بالیدہ ہو جاتا ہے، ویسے ویسے دوسرے مضامین ان کی ترجیحات میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ درمیانی عمر تک تو خیر پھر بھی آدمی بڑے شوق سے معشوق کے جسم کا تذکرہ پسند کرتا ہے لیکن وسط عمری سے کچھ آگے عورت کا جسم اور اس کا بیان اپنی لذت کم کرتا جاتا ہے۔ یہی وہ خوبی یا خامی ہے جو ساحرؔ کی بابِ اول کی شاعری کو ناقدین میں غیر پسند کا درجہ دلواتی ہے۔ اس معاملہ کی ایک زندہ مثال میں عرض کروں کہ والدِ گرامی خلیل فرحتؔ کارنجوی صاحب نے اپنی شعری نگارشات کا انتخاب شروع کیا۔ میں یہ دیکھ کر سخت حیرت میں تھا کہ حضرت میرے پسندیدہ شعروں کو بے دریغ حذف کرتے جا رہے ہیں، میری قطعی نوجوانی کا عالم تھا، حضرت سے دریافت کیا کہ آپ اپنے اتنے اچھے شعروں کو دیوان سے باہر کیوں کیے جا رہے ہیں، جواب ملا 'بیٹے، یہ شاعری اوائل عمری میں ہی پسند آتی ہے'، معاملہ صاف ہوا۔ ٹھیک اسی طرح خود مجھے اپنی ابتدائی شاعری میں وہ کیف محسوس نہیں ہوتا جو اس وقت لہک لہک کر پڑھنے میں مجھے اور سامعین کو محسوس ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ امثلہ سے مجبوراً گریز کیا کرنا پڑ رہا ہے کہ بحیثیت مدیر، ہمیشہ سے ''میرے حصے میں فقط باغ کی محنت آئی'' کے مصداق صفحات کی تنگی مانع ہے۔ اس باب کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ نظم ''کبھی کبھی'' ماخوذ از 'تلخیاں'۔

ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین خیالوں میں محو ہو رہتا

بابِ دوم: ''ساحرؔ کی لازوالیت''

یقین جانیئے کہ سنیما کا شدید اثر اگر چہ نہ بھی ہوتا تو 'بابِ دوم' کی شاعری ساحرؔ کو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ ساحرؔ کی اس نہج کی شاعری میں تفکر کا کینواس خاصہ وسیع ہے۔ بلکہ کہیں کہیں کمیونزم کے ڈھانچے سے بھی آگے بہت آگے بڑھ کر سوچا گیا ہے۔ جہاں غمِ جہاں کو غمِ دلبر پر مقدم جانا گیا ہے، جہاں اسوسی ایشن کے مینفیسٹو کے علاوہ عالمِ انسانیت کا کرب شاعر اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اور پھر اس کرب سے جو شاعری منصۂ شہود پر آتی ہے، وہ ساحرؔ کی لازوالیت پر دال ہوتی ہے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

سعیِ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر
غریبِ شہر کے تن پہ لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

اور اب آخر میں اس مضمون کا لبِ لباب۔ وہی 'ایک قدم کا فاصلہ'۔ روسی ادیب و ناولسٹ فیوڈر دستایوفسکی کے شاہکار ناول 'کرائم اینڈ پنشمینٹ' پر مشتمل رمیش سہگل کے ۱۹۵۸ء میں آئے سنیما ''پھر صبح ہوگی'' کے نغمہ نگار ساحر تھے۔ اس سنیما کا ایک دوگانہ ''پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ''، اس گیت کا پہلا شعر ملاحظہ کریں۔

ہیرو کہتا ہے ۔ پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

جواباً ہیروئن کہتی ہے ۔ میں کہاں تک نہ نگاہوں کو پلٹنے دیتی
آپ کے دل نے کئی بار پکارا مجھ کو

اس گیت کے متعلق والدِ مرحوم خلیل فرحت کارنجوی صاحب نے ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ ''ایک ہی شاعر کے تخلیق کردہ گیت کے دو شعر، اول شعر 'پھر نہ کیجیے مری۔' معیار کے اعتبار سے عرش بریں پر جا ٹکا اور اسی شاعر کا دوسرا شعر 'میں کہاں تک نہ۔۔' بہ اعتبارِ معیار تحت الثریٰ میں جا گھسا، ایک ہی گیت کے دو شعروں میں اتنا بڑا تفاوت کیسے ممکن ہو سکتا ہے''۔ اس استفسار کے جواب میں ساحر فرماتے ہیں کہ ''پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ' والا شعر میرے دیوان 'تلخیاں' سے ماخوذ ہے اور اس کے بعد والا شعر 'میں کہاں تک نہ نگاہوں کو پلٹنے دیتی' سنیما کے لیے لکھا گیا''۔ (مکتوبِ ساحر بنام خلیل فرحت کارنجوی محررہ ۸ نومبر ۱۹۶۰ء، مذکورہ خط ''مکتوباتِ ساحر'' میں شامل کیا گیا ہے۔) غرض کہ اول شعر آمد اور دوم آورد کا نتیجہ ہے۔ یہ ساحر کا سنیما میں ابتدائی زمانہ تھا۔ اور اس وقت تک ساحر کی علمی اور فلمی شاعری میں زمین و آسمان کا فرق قارئین محسوس کر سکتے

ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اس دور تک ساحرؔ اپنی تخلیقیت سینما میں منتقل نہ کر پائے تھے۔ اور ظ۔ انصاری والا 'ایک قدم' ابھی کئی قدموں پر محیط تھا۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ ساحرؔ کے عہد میں ہندوستانی سینما بجائے خود زبردست اشتراکیت پسند رہا۔ بڑے بڑے ہدایت کار کمیونزم کی رو میں بہہ رہے تھے، حتیٰ کہ اداکار، کہانی کار، نغمہ نگار، مکالمہ نگار بھی خود کو اشتراکیت سے دور نہ رکھ پائے تھے۔ گرودت، بلراج سہانی، سنیل دت، ستیہ جیت رے، بمل رائے و دیگر حضرات ساحرؔ کے ہم قبیلہ رہے۔ ساحرؔ کے گیتوں میں بیش تر شاعری ان کے شعری مجموعوں سے مشتق ہے۔ بعضے لفظوں کے ہیر پھیر سے اور بعضے بجنسہٖ۔ شعری مجموعے سے سینما کی یہی ترسیل 'ایک قدم کا فاصلہ' ہے۔ ملاحظہ کریں۔

'تلخیاں' میں شامل نظم 'چکلے'

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں، محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

دس بند پر مشتمل نظم کا ٹیپ کا بند 'ایک قدم کا فاصلہ' طے کرتے ہوئے یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ ''جنھیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہے' اور اس نظم کے چھ بند سینما ''پیاسہ'' میں شامل کیے جاتے ہیں۔ مزید ان چھ بندوں میں بھی فارسیت آمیز الفاظ وتراکیب کی تشکیل میں ترمیم کی جاتی ہے۔ 'تلخیاں' میں شامل غزل 'تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم'، یہی غزل کچھ شعروں کے اضافے سے ''پیاسہ'' میں شامل کی گئی۔ اسی مجموعے میں شامل چھ بند کی نظم ''کبھی کبھی''، جب سینما میں شامل کی جاتی ہے تو نظم کا مکمل تھیم بدل جاتا ہے۔ سینما میں شامل چار بند کا گیت محض خانہ پوری ہو کر رہ جاتا ہے۔ 'تلخیاں' والی 'کبھی کبھی' کا تسلسل، روانی اور نفسِ مضمون کا ستیاناس کر ساحرؔ نے محض ''سیٹ'' کی ضرورت پوری کی ہے، جس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں مجھے بے ساختہ میرزا عبدالقادر بیدلؔ یاد آگئے۔

بہ رفع کجی مشکل بود از طبع کج طینت
بزور سیل نتواں راست کردن قالب پل را
(سیلاب کے زور سے پل کے قالب کو سیدھا نہیں کیا جاسکتا)

نظم ''خوبصورت موڑ'' چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں' کو بغیر یک لفظی تصرف کے ساحرؔ نے سنیما میں شامل کرلیا اور ایک شاہکار کو واقعی شاہکار کا درجہ مل گیا۔ 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' میں شامل ساحر کی ایک عمدہ غزل 'دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنے قریب سے'، اس غزل کے مطلع کو ساحرؔ نے ایک گیت کے مکھڑے کے طور پر استعمال کیا۔ گیت میں مابقیہ اشعار خالص سنیما کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اسی مجموعے سے ''میں پل دو پل کا شاعر ہوں' نظم کچھ تفریط کے ساتھ سنیما میں لی گئی۔

ایسی کئی ایک مثالیں یہاں دی جاسکتی ہیں کہ جنہیں ''ایک قدم کا فاصلہ'' سے موسوم کیا جائے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہ ہوگا کہ ساحرؔ نے کلیتاً سنیما کے لیے لکھی گئی شاعری میں ایک خاص مزاج کو برقرار رکھا۔ سطحی نغموں میں بھی ادبیت کی چاشنی ضرور مل جاتی ہے۔ اپنے دیوان سے شعری نگارشات کو ایک قدم کے فاصلے سے سنیما میں پرورینا بھی ساحرؔ ہی کا کمال ہے۔ امریکی فلسفی جان ہاسپرس نے کہا تھا کہ' اپنے اعمال سے ہم صرف دوسرے لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ فطرت کے وقوعات کا رخ بھی بدل دیتے ہیں'' (این انٹروڈکشن ٹو فلاسوفیکل اینالائسیس، یونیورسٹی آف کیلیفورنیہ پریس ۱۹۵۶ صفحہ نمبر ۴۹۸) مذکورہ بالا بیان کے عین مطابق ساحرؔ نے اپنے 'عمل' سے وقوعاتِ فطرت کو رخ بدل دیا۔ ان ہی کی کوششوں سے ریڈیو پر نغمہ نگاران کے نام پڑھے جانے لگے، گیت لکھنے کے بعد دھن بنائی جانے لگی، یہ جادو بلاشبہ کوئی ساحر ہی کرسکتا تھا۔

میں وہ نہیں جو مقدر پہ ہاتھ ملتا ہے
مرا عمل تو ہواؤں کے رخ بدلتا ہے
جھکے وہ آنکھ تو رک جائے گردشِ دوراں
اگر اٹھے تو شرابوں کا دور چلتا ہے

خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم

حیاتِ ساحرؔ

امرتا پریتم

یادوں کے لمس

جس چہرے کی روشنی میں سب سے پہلے دل کی تہوں میں درد جاگتے دیکھا وہ اس مذہب کا تھا، جس مذہب کے ماننے والوں کے لئے گھر میں برتن بھی الگ رکھے جاتے تھے۔
یہی وہ چہرہ تھا، جس نے میرے اندر انسانیت کی وہ جوت جگائی کہ ملک کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہی سے دوچار ہوکر بھی جب میں نے اس حادثے کے بارے میں قلم اٹھایا تو دونوں گروہوں کی زیادتیاں بغیر کسی رعایت یا ریزرویشن کے قلم بند کرسکی۔ یہ چہرہ نہ دیکھا ہوتا تو میرے ناول 'پنجر' کی تقدیر نہ جانے کیا ہوتی۔
میں اکیس برس کی تھی، جب اپنے خوابوں میں بسا ہوا چہرہ اس دھرتی پر دیکھا اور زبان پر بے ساختہ کسی کا یہ شعر آگیا:

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے سے

کافی برس بعد اس سے پہلی ملاقات کی تفصیل میں نے آخری خط میں بیان کی تھی۔ اس کے بعد ایک آگ کا دریا تھا۔ جس سے میں دن رات گزرتی رہی۔۔۔ یہاں تک کہ 1957 میں جب مجھے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تو فون پر یہ خبر ملتے ہی میں سر سے پاؤں تک تپنے لگی۔ خدایا یہ 'سنہرے' میں نے کسی انعام کے لئے تو نہیں لکھے تھے، جس کے لئے لکھے، اس نے تو انہیں پڑھا ہی نہیں۔ اب ساری دنیا بھی پڑھے تو مجھے کیا۔
اس شام ایک پریس رپورٹر آیا۔ فوٹو گرافر ساتھ تھا۔ وہ میری تصویر لینا چاہتا تھا۔ جس میں میں نظم لکھتی ہوئی نظر آؤں۔ میں نے سامنے میز پر کاغذ رکھا اور قلم ہاتھ میں لے کر کاغذ پر کوئی نظم لکھنے کے بجائے کسی ارادے کے بغیر اس کا نام لکھنے لگی جس کے لئے میں نے 'سنہرے' لکھے تھے۔ ساحر، ساحر، ساحر، سارا کاغذ بھر گیا۔

پریس کے لوگ چلے گئے تو اکیلے بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا۔ صبح اخباروں میں یہ تصویر چھپے گی تو میز پر پھیلے ہوئے کاغذ پر ساحر کے نام کی گردان نظر آئے گی... اوہ خدایا!

مجنوں کے لیلیٰ لیلیٰ پکارنے والی کیفیت کا تجربہ ہوا مجھے اس روز۔ لیکن کیمرے کا فوکس ہاتھ پر تھا، کاغذ پر نہیں۔ اس لئے دوسرے دن کے اخباروں میں کاغذ پر کچھ بھی نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ یہ تسلی ہونے کے بعد ایک کسک ایک چبھن اس میں شامل ہوگئی۔ کاغذ خالی نظر آرہا تھا۔ مگر خدا شاہد ہے کہ وہ خالی نہیں تھا۔

ساحر کی میں نے تھوڑی سی اپنے ناول 'اشرؤ' میں تصویر کشی کی ہے۔ پھر ایک تھی 'انیتا' میں اور 'پھروتی کی گلیاں' میں ساگر کے روپ میں۔

نظمیں بہت سی لکھی ہیں۔ سنیہڑے سب سے لمبی نظم اور دوسری کئی نظمیں اور آخر میں نظم 'آج کی بات' لکھ کر محسوس ہوا کہ اب چودہ برس کا بن واس پورا کر کے آزادی کی طرف لوٹ آئی ہوں۔

لیکن بیتے ہوئے ماہ وسال بدن کے لباس کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ داغوں کے نشان کی طرح ہوتے ہیں۔ کہتے کچھ نہیں، لیکن جسم سے الگ نہیں ہوتے۔ کئی برس بعد۔ بلغاریہ کے جنوب میں وارنا کے ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ جہاں ایک طرف سمندر تھا، دوسری طرف جنگل اور تیسری طرف پہاڑ۔ وہاں ایک رات ایسا محسوس ہوا، جیسے سمندر کی طرف سے ایک ناؤ آئی ہے اور اس میں سے اتر کر کوئی کھڑکی کی راہ سے میرے کمرے میں آ گیا ہے۔

خواب اور حقیقت ایک ہوگئے تھے۔ اس رات ایک نظم لکھی 'تیری یادیں'۔ بہت دنوں پہلے ساحر سے میری اور امروز (مصنفہ کے لئے آئیڈیل) کی ایک ساتھ ملاقات ہو چکی ہے۔ پہلی بار وہ اداس تھا۔ ہم تینوں نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر جو کچھ پیا تھا اس کے خالی گلاس میرے اور امروز کے وہاں سے اٹھ کر چلے آنے کے بعد بھی ساحر کی میز پر پڑے رہے۔ اس رات اس نے ایک نظم لکھی تھی۔

میرے ساتھی خالی جام
تم آباد گھروں کے باسی...

اور یہ نظم اس نے مجھے اس رات کوئی گیارہ بجے فون پر سنائی اور بتایا کہ وہ باری باری تینوں گلاسوں میں وہسکی ڈال کر پی رہا ہے۔ لیکن بمبئی میں جب دوبارہ ہماری ملاقات ہوئی تو اس وقت امروز کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ڈاکٹر کو فون کیا اور امروز کو دوا دلوائی۔ یوں تو میرے اندر کی عورت ہمیشہ میرے اندر کی فنکارہ سے پیچھے رہی ہے۔ دوسرے نمبر پر خود اپنے کو دھیان دلایا ہے۔ صرف فنکارہ کا روپ ہمیشہ اتنا روشن رہا کہ میری اپنی آنکھوں کو بھی میری پہچان اسی میں ملتی ہے۔

زندگی میں تین وقت ایسے آئے ہیں جب میں نے اپنے اندر کی صرف عورت کو جی بھر کر دیکھا ہے۔اس کا روپ اتنا بھرا پرا تھا کہ میرے اندر کی 'فنکارہ' کا وجود میرے لئے محو ہو گیا۔وہاں کوئی خلا نہیں تھا، جو اس کی یاد دلاتا۔یہ یاد صرف اب کر سکتی ہوں۔کئی برس کی دوری پر کھڑی ہو کر۔

پہلی بار اپنے اندر کی عورت کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر 25 برس ہو گئی تھی۔اور میری گود بچے سے خالی تھی۔تقریباً ہر رات مجھے ایک بچے کا خواب آتا۔ایک ننھا منا چہرہ ترشے ہوئے نین نقش ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتا ہوا۔اور بار بار خواب دیکھتے دیکھتے مجھے اس بچے کی پکی پہچان ہو گئی۔خواب میں وہ مجھ سے باتیں بھی کرتا تھا۔روزانہ ایک سی باتیں۔میں اس کی آواز بھی پہچاننے لگی تھی۔خواب میں میں پودوں کو پانی دے رہی ہوتی تھی اور گملے میں پھولوں کی جگہ ایک بچے کا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔

میں چونک کر پوچھتی تھی تو کہاں تھا؟ میں تجھے ڈھونڈتی رہی۔اور وہ معصوم چہرہ ہنس پڑتا تھا۔میں یہاں چھپا ہوا تھا__ اور میں جلدی سے گملے میں سے بچے کو اٹھا لیتی تھی۔لیکن جاگنے پر میں ویسی کی ویسی ہی ہوتی۔سونی ویران اور اکیلی۔صرف ایک عورت، جو اگر ماں نہیں بن سکتی تھی تو جینا بھی نہیں چاہتی تھی۔

دوسری بار یہ مشاہدہ میں نے تب کیا جب ایک دن ساحر آیا تھا اور اسے ہلکا سا بخار تھا۔اس کے گلے میں درد بھی تھا۔اور سانس میں کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی۔اُس دن اس کے گلے اور چھاتی پر میں نے وکس ملی تھی۔کتنی دیر ملتی رہی تھی! اور تب محسوس ہوا تھا۔اسی طرح پیروں پر کھڑے پوروں سے، انگلیوں سے اور ہتھیلیوں سے اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتے ہوئے میں اپنی پوری عمر گزار سکتی ہوں۔میرے اندر کی عورت کو اس وقت کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی۔

اور تیسری بار یہ عورت میں نے تب دیکھی تھی جب اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے امروز نے اپنا پتلا سا برش اپنے کینوس کے اوپر سے اٹھا کر اسے ایک بار لال رنگ میں ڈبویا تھا اور پھر اس برش سے میرے ماتھے پر بندی لگا دی تھی...

تقسیم ملک سے پہلے میرے پاس ایک چیز تھی جسے میں سنبھال کر رکھتی تھی۔یہ ساحر کی نظم 'تاج محل' تھی، جو اس نے فریم کر کے مجھے دی تھی۔آج تقسیم کی بربادی کے برسوں بعد اپنی الماری کا اندرونی خانہ ٹٹولنے لگی تو کسی دبے ہوئے خزانے کی طرح کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔

✓ ایک پتہ ہے جو میں ٹالسٹائی کی قبر سے اٹھا لائی تھی اور ایک کاغذ کا گول ٹکڑا ہے جس کے ایک طرف چھپا ہوا ہے 'ایشین رائٹرز کانفرنس' اور دوسری طرف ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، 'ساحر لدھیانوی'۔یہ وہ بیج ہے جو کانفرنس کے موقع پر سبھی مندوبین کو دیا گیا تھا۔میرے نام کا بیج میرے کوٹ پر لگا ہوا تھا اور ساحر کے نام کا

ساحر کے کوٹ پر لگا تھا۔ ساحر نے اپنا بیج اتار کر میرے کوٹ پر لگا دیا اور میرا بیج اتار کر اپنے کوٹ پر لگا لیا۔
اور آج کاغذ کا یہ ٹکڑا ٹالسٹائے کی قبر سے اٹھائے ہوئے پتے کے پاس پڑا ہوا مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ بھی میں نے ایک پتے کی طرح اپنے ہاتھ سے خود اپنی قبر پر سے اٹھایا ہے۔
پاس ہی ویت نام کی بنی ہوئی ایک ایش ٹرے ہے جو آذربائیجان کی راجدھانی باکو میں وہاں کی شاعرہ مختارو خانم نے مجھے دی تھی یہ کہتے ہوئے کہ جب جب تمہارے الہام کا دھواں تمہارے سگریٹ کے دھوئیں سے مل جائے مجھے یاد کر لینا۔

برسوں اس دھوئیں میں چہرے ابھرتے مٹتے رہے ہیں صرف اوروں کے لئے نہیں اپنا چہرہ بھی اپنی آنکھوں کے سامنے ــــ پگھلتا اور کانپتا ہوا ــــ حقیقت میں تبھی دیکھا ہے جب کوئی نظم لکھی ہے۔
کے اس کا گزاتے عشق ترے انگوٹھا لایا۔ کون حساب چکائے گا۔ اس نظم کی شانِ نزول یہ تھی کہ ایک بار ایک اردو مشاعرے کے موقع پر لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ لوگ کچھ ادھر ادھر ہوئے تو میں نے ہنس کر اپنی ہتھیلی اس کے آگے کر دی اور کہا آٹوگراف۔ ساحر نے ہاتھ میں لئے ہوئے قلم کی سیاہی اپنے انگوٹھے پر لگا کر انگوٹھا میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ جیسے میری ہتھیلی جس پر اپنے دستخط کئے اس پر کیا لکھا ہوا تھا یہ سب ہواؤں کے حوالے ہے۔ اس پر کیا لکھا ہوا تھا اسے خود اس نے کبھی پڑھا نہ زندگی نے۔ اس لئے میں کہہ سکتی ہوں۔ ساحر ایک خیال تھا۔ ہوا میں چمکتا ہوا۔ شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک ساحرانہ عکس، لیکن امروز کے ساتھ بتائی ہوئی زندگی، شروع کے کچھ برسوں کو چھوڑ کر ایک بے خودی کے عالم تک پہنچ گئی ہے۔
اور امروز جانتا ہے کہ میں نے ساحر سے محبت کی تھی۔ لیکن یہ جانکاری اپنی جگہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس سے آگے جا کر امروز کی بڑائی یہ ہے کہ اس محبت میں میری ناکامی کو امروز اپنی ناکامی سمجھتا ہے۔
یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میرا بیٹا میرے جسم کی آس بنا تھا۔ 1946 کے آخری دنوں کی بات۔
اخباروں اور کتابوں میں کئی بار پڑھا تھا کہ ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں بجی ہوں یا اس کے خیالوں میں جو چہرہ بسا رہے۔ بچے کی صورت اسی پر جاتی ہے اور میرے دل نے جیسے دنیا سے چھپ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا ــــ اگر میں ساحر کے چہرے کو ہر لمحے اپنے خیالوں میں رکھوں تو میرے بچے کی شکل میں اس کی شباہت آجائے گی۔ جسے زندگی میں نہیں پا سکی تھی۔ اسے خوابوں میں پا لینے کی ایک کرشمہ ساز کوشش ۔ خدا کی طرح صورت آفرینی کی خلاقانہ کوشش۔ جسم کا ایک آزادانہ عمل۔
صرف روایت ہی سے آزادی نہیں، خون اور نسل کی گرفت سے بھی رہائی۔
دیوانگی کے اس عالم میں جب 3 جولائی 1947 کو بچے کا جنم ہوا اور پہلی بار اس کی شکل دیکھی تو

اپنی خلاقی پر یقین ہو گیا اور بچے کے واضح ہوتے ہوئے خدوخال کے ساتھ اپنا تصور واقعی متشکل ہوتا نظر پڑا۔ میرے بیٹے کی صورت سچ مچ ساحر سے ملتی ہے۔

خیر دیوانگی کی آخری چوٹی پر پاؤں رکھ کر ہمیشہ کھڑا نہیں رہا جا سکتا۔ پاؤں ٹکانے کے لئے زمین کا کوئی ٹکڑا چاہئے۔ اس لئے آئندہ برسوں میں اس واقعے کا ذکر میں اس طرح کرنے لگی، جیسے یہ پریوں کی کوئی کہانی ہو۔ ایک بار میں نے یہ بات ساحر سے بھی کہی۔ اپنے آپ پر ہنستے ہوئے اس پر کیا ردعمل ہوا، مجھے علم نہیں۔ میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ ساحر ہنسنے لگا اور بولا ''ویری پورٹیسٹ۔''

ساحر کی زندگی کا ایک بڑا، بلکہ میں یہ کہوں گی سب سے بڑا کمپلیکس یہ ہے کہ وہ اپنی نظر میں خوبصورت نہیں ہے، اس لئے اس نے یہ بات کہی۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک دن اس نے میری لڑکی کو اپنی گود میں بٹھا کر کہا تھا۔ ''تمہیں ایک کہانی سناؤں'' اور جب میری لڑکی کہانی سننے کے لئے تیار ہوئی تو ساحر کہنے لگا ۔۔۔ ایک لکڑ ہارا تھا۔ وہ دن رات جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے جنگل میں ایک راج کماری کو دیکھا، بہت خوبصورت، لکڑ ہارے کا جی چاہا کہ وہ راجکماری کو لے کر بھاگ جائے۔

پھر؟ میری لڑکی کی عمر ابھی کہانیوں پر ہنکارے بھرنے کی تھی، اس لئے وہ بڑے دھیان سے کہانی سن رہی تھی۔ میں پاس بیٹھی صرف ہنس رہی تھی۔ کہانی میں دخل نہیں دے رہی تھی۔

ساحر کہہ رہا تھا ''مگر وہ تھا تو لکڑ ہارا۔ وہ راجکماری کو صرف دیکھتا رہا ۔۔۔ دور ہی سے کھڑے کھڑے اور پھر لکڑیاں کاٹنے لگا۔ سچی کہانی ہے نا۔''

''ہاں میں نے دیکھا تھا۔'' بچی نے نہ جانے کیوں کہا ۔۔۔ ساحر ہنستے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔ ''دیکھ لو، یہ بھی جانتی ہے۔'' اور بچی سے اس نے پوچھا۔ ''تم وہاں تھیں جنگل میں؟'' بچی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

ساحر نے پھر گود میں بیٹھی ہوئی بچی سے پوچھا۔ ''تم نے اس لکڑ ہارے کو بھی دیکھا تھا؟ وہ کون تھا''

بچی کو شاید اس وقت الہام ہو رہا تھا۔ بولی ''آپ۔''

ساحر نے پھر پوچھا اور ''وہ راجکماری کون تھی؟''

''ماما'' بچی ہنسنے لگی۔

ساحر مجھ سے کہنے لگا۔ ''دیکھا۔ بچے سب کچھ جانتے ہیں'' ۔۔۔ پھر کئی برس گزر گئے۔ 1960 میں جب میں بمبئی گئی تو ۔۔۔ راجندر سنگھ بیدی بڑے مہربان دوست تھے۔ اکثر ملتے تھے۔ ایک شام بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے پوچھا۔ ''پرکاش پنڈت کی زبانی ایک بار سنا تھا کہ نوراج (مصنفہ کا بیٹا) ساحر کا بیٹا

ہے...؟''

اس شام میں نے بیدی صاحب کو اپنی دیوانگی کا وہ قصہ سنایا اور کہا یہ تصوراتی سچائی ہے واقعاتی نہیں۔ انہی دنوں ایک دن نوراج نے بھی پوچھا۔ اس وقت اس کی عمر کوئی تیرہ برس کی تھی۔ ''ماما، ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گی؟'' ''پوچھو۔'' ''کیا میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں؟'' ''نہیں۔''

''لیکن اگر ہوں تو بتا دو۔ مجھے ساحر انکل اچھے لگتے ہیں۔''

''ہاں۔ بیٹا! مجھے بھی وہ اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو میں نے تمہیں ضرور بتا دیا ہوتا۔''

سچائی کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ لہٰذا میرے بچے کو میری بات پر یقین آ گیا۔

سوچتی ہوں، خیال کا سچ چھوٹا نہیں تھا، لیکن وہ صرف میرے لئے تھا، اتنا ذاتی کہ ساحر بھی اس میں شریک نہیں تھا۔ لاہور میں جب کبھی ساحر ملنے کے لئے آتا تھا تو میری ہی خاموشی میں کا ایک ٹکڑا سا کرسی پر بیٹھا لگتا۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔ وہ چپ چپ بیٹھا صرف سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ لگ بھگ آدھا سگریٹ پی کر راکھ دان میں بجھا دیتا تھا۔ پھر نیا سگریٹ۔ سگریٹوں کے بڑے بڑے ٹکڑے کمرے میں رہ جاتے تھے۔ کبھی کبھی بس ایک بار اس کے ہاتھ کو چھونا چاہتی تھی۔ لیکن میرے سامنے رواجوں کی ایک دوری تھی، جو طے نہیں ہو پاتی تھی۔ تب بھی تصور کا سہارا لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑوں کو سنبھال کر الماری میں رکھ لیتی اور پھر ایک ایک ٹکڑے کو اکیلی بیٹھ کر جلاتی تھی اور جب انگلیوں میں اسے پکڑتی تھی تو محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ہاتھ چھو رہی ہوں ___ سگریٹ پینے کی عادت مجھے تبھی پہلی بار پڑی تھی۔ ہر سگریٹ کو سلگاتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ پاس ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں میں وہ جیسے جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہے...

پھر برسوں بعد اپنے اس تجربے کو میں نے اپنے ناول 'ایک تھی انیتا' میں کاغذ پر اتارا۔ لیکن ساحر شاید ابھی تک میری سگریٹ نوشی کی اس تاریخ سے ناواقف ہے۔

سوچتی ہوں ___ خیال کی یہ دنیا صرف اس کی ہوتی ہے، جو اس کی تخلیق کرتا ہے۔ خدا جیسا خلاق بھی اکیلا ہی ہے۔ آخر جس مٹی سے یہ جسم بنا ہے اس مٹی کی تاریخ میں میرے لہو کی تاریخ میرے لہو کی گرمی میں شامل ہے۔ تخلیق کے آغاز میں جو آگ کا ایک گولا سا... ہزاروں برس پانی میں تیرتا رہا تھا اس میں سے ہر گناہ کو بھسم کر کے جو جاندار باہر نکلا تھا وہ اکیلا تھا۔ اسے نہ اکیلے پن کا خوف تھا نہ اکیلے پن کی خوشی۔ پھر اس نے اپنے ہی بدن کو چیر کر آدھے کو مرد بنا دیا آدھے کو عورت اور اسی سے اس نے دنیا کی تخلیق کی۔

دنیا کا یہ تصور محض دیومالا نہیں ہے۔ نہ صرف زمانہ قدیم کی تاریخ ہے، یہ ہر دور کی تاریخ ہے، خواہ چھوٹے چھوٹے انسانوں کی چھوٹی چھوٹی سی تاریخ ہی ہی...... میری بھی... ■■

☆ میر تقی میرؔ کے مقبرہ کی تلاش کرنے سے، یا پھر شبلی نعمانی کے معاشقے ڈھونڈ نکال لینے سے، اقبال کی ازواج کے تعدد میں مغز پاشی سے، یا پھر پچیس پچیس مرتبہ چھپے ہوئے مضامین کو مجموعہ کی صورت میں شائع کرنے سے اردو زبان کا مستقبل سنور نہیں سکتا۔ اردو زبان جب تک معیشت سے نہ جوڑی جائے، اس کی بقا غیر یقینی ہے۔ زمانہ کی رو کے ساتھ زبان کے قلابے ملا کر ہی ہم روشن مستقبل کی امید کر سکتے ہیں۔ عصری تقاضوں پر زبان کو پورا اتارنے کے لیے مثبت اقدام اٹھانے کی سخت ضرورت ہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر خواجہ اکرام کی کتاب ''اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات'' اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر سامنے آئی ہے۔ یہ اپنے نوع کی اولین کتاب ہے جو عصر کی معنویت اور میرے ایقان کو استقامت بخشتی ہے۔ نئی نسل کے لیے زبان اور جدید تکنیکوں کے ارتباط سے واقفیت از حد ضروری ہے۔ اس اعتبار سے خواجہ صاحب کی کتاب سر آنکھوں پر رکھے جانے کے قابل ہے۔ (**وسیم فرحتؔ کارنجوی علیگ**)

نریش کمار شاد

ساحر کے ساتھ ایک شام

''میں کب اور کہاں پیدا ہوا؟''

میرے اس سوال کو زیر لب دوہرا کر ساحر نے ہنستے ہوئے کہا: ''اے جدت پسند نوجوان! یہ تو بڑا روایتی سوال ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اس میں اتنا اضافہ اور کرلو'' کیوں پیدا ہوا؟''

میں نے جان بوجھ کر اپنے اوپر بے چارگی طاری کرتے ہوئے کہا: ''خوش مذاقی آپ کی مسلّم۔ لیکن ساحر صاحب اس کا سہارا لے کر آپ ہم غریبوں کے انٹرویو لینے کے شوق کا مذاق کیوں اڑا رہے ہیں؟''

ساحر نے ذرا سا جھینپتے ہوئے قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''1921 میں لدھیانہ میں۔''

میں نے اطمینان کی سانس لی اور پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے پوچھا۔''تعلیم کہاں اور کہاں تک حاصل کی؟''

''بی اے نہیں کر سکا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لدھیانہ اور دیال سنگھ کالج لاہور دونوں کالجوں سے نکالا ہوا ہوں— '' اور اتنا کہنے کے بعد ساحر کے لہجہ میں جیسے فخر اور اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔''لیکن اب ان دونوں کالجوں کو ناز ہے کہ میں وہاں پڑھتا رہا ہوں اور اب اس حادثہ کا کہ میں وہاں سے نکالا ہوا ہوں یقیناً انہیں صدمہ ہے۔'' اور مجھے اس وقت بے اختیار ساحر کی نظم ''نذر کالج'' کا آخری شعر یاد آ گیا۔

لیکن ہم اِن فضاؤں کے پالے ہوئے ہیں
گر یاں نہیں تو یاں کے نکالے ہوئے ہیں

''اچھا فرمایئے مسٹر عبدالحئی سے آپ حضرت ساحر لدھیانوی کب بنے؟''

''1937 میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے جب مجھے بالکل فراغت تھی، سب سے پہلا شعر کہا تھا— یاد نہیں۔
شاید یاد رکھنے کے قابل بھی نہ ہو۔''

''ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی؟''

''کسی سے نہیں۔'' اور پھر یکا یک جیسے ساحر صاحب کو کچھ یاد آ گیا اور وہ کہنے لگے: ''ہاں یہ ضرور ہوا کہ میں نے اپنی سب سے پہلی نظم ایک دوست کے ذریعہ اپنے اسکول کے ٹیچر فیاض ہریانوی کو ان کی رائے دریافت کرنے کے لئے بھیجی۔''

''تو انہوں نے کیا رائے دی؟''

''یہی کہ اشعار موزوں ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے نظم بہت معمولی ہے۔'' اتنا کہہ کر ساحر نے اپنے مخصوص لیکن بڑے محبوب اور دلکش انداز میں کہا'' ظاہر ہے میرے لئے اس وقت یہی بہت تھا کہ اشعار موزوں تو ہیں۔''

''اپنا تخلص آپ نے ساحر ہی کیوں تجویز کیا؟''

کرسی سے اٹھ کر ساحر کمرے میں ٹہلنے لگے اور ٹہلتے کہنے لگے: ''چونکہ کوئی نہ کوئی تخلص رکھنا مروج تھا۔ تخلص کے لئے کوئی اچھا سا لفظ مل جائے۔ تلاش میں تھا کہ اقبال نے داغ کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں اس شعر پر نظر پڑی:

اِس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

اپنی شاعری سے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی اور چونکہ میں بھی اپنے آپ کو سیکڑوں میں ایک شمار کرتا تھا۔ اس لئے اپنے تخلص کے لئے مجھے ساحر مناسب معلوم ہوا۔''

''شروع میں آپ اردو کے کس کس شاعر سے خاص طور پر متاثر تھے؟''

''اقبال اور جوش ملیح آبادی سے۔''

''اور اب اگر میں یہ دریافت کروں کہ آپ شعر کیوں کہتے ہیں؟''

ساحر نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ بلکہ مجھے اپنی لمبی نوکیلی ناک سے سونگھ رہے ہیں اور ایک بار پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے: ''میری رائے میں ہر آدمی کا جو پیشہ ہے۔ اس میں اس کا شوق اور ضرورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔

کبھی شوق پہلے اور کبھی ضرورت۔ سماجی اور سیاسی نظریئے کی تبلیغ کا سوال اس کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے اپنے وقت کا ایک حصہ مجھے فلمی شاعری کی نذر کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی کے بعض سانحات کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی میرا ذہن تخلیق شعر پر مجبور تھا۔''

یہ سن کر مجھے ان کا یہ شعر یاد آ گیا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ دیا ہے مجھ کو وہ لوٹا رہا ہوں

''اور آپ شعر کہتے کیوں کر ہیں؟''

اس کے جواب میں ساحر اپنے چیچک زدہ چہرے کو سہلاتے ہوئے بتلانے لگے: ''بعض اوقات کوئی ذاتی یا اجتماعی مسئلہ ذہن پر اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ اشعار کے بغیر اس کا تجزیہ کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت کسی خاص ماحول کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے عالم میں کوئی چیز مخل ہوتی بھی ہے تو مخل ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ فلمی گانا لکھنے کے لئے دروازہ بند کر کے کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور شعوری طور پر اپنے آپ کو گیت سے متعلق ماحول اور کردار کی نفسیات کے سانچے میں ڈھال کر اشعار کہتا ہوں یا گیت لکھتا ہوں۔''

''اچھے شعر کی آپ کے خیال میں مختصر ترین تعریف کیا ہے؟''

''خوب صورت ہو سچا ہو اور مفید ہو۔''

کیا آپ عَروض سے واقف ہیں اور کیا عَروض کا جاننا شاعر کے لئے ضروری سمجھتے ہیں؟''

میں خود عَروض سے قطعاً ناواقف ہوں۔ اس صورت میں عَروض کا جاننا شاعر کے لئے ضروری کیوں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ایک اچھا شاعر عَروض سے واقف ہو تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔''

''آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟''

''کئی چھوٹے اور بڑے، واقعات ہیں۔ کسی خاص واقعے کا انتخاب ناممکن ہے۔''

''آپ اس صدی کا سب سے بڑا شاعر کسے تسلیم کرتے ہیں؟''

''نظریاتی اختلاف کے باوجود اقبال کو۔''

''اردو کے موجودہ شاعروں میں آپ کو خاص طور پر کون سا شاعر پسند ہے؟''

''مشکل یہ ہے کہ ہم عصر شاعروں کے بارے میں ذاتی پسند کا انحصار فنکار کے علاوہ اس کی شخصیت پر بھی ہوتا ہے۔ تاہم فیض احمد فیض مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔''

''اور اردو کے جدید شاعروں میں کوئی قابل ذکر شاعر بھی آپ کی نظر میں ہے؟''

''نریش کمار شاد۔'' ساحر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا: ''حوصلہ افزائی کا شکریہ، لیکن ذرا سنجیدگی سے بتائیے۔ میرا مطلب ہے۔ حق گوئی سے کام لیجئے تا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔''

''حوصلہ افزائی یا تمہیں خوش کرنے کا سوال نہیں ـــــ '' ساحر نے اپنی لمبی لمبی انگلیوں کو لہراتے ہوئے کہا ـــــ ''

اپنی اس رائے کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ تصدیق درکار ہو تو کنور مہندر سنگھ بیدی سے پوچھ لینا۔"
اپنے ذکر کے سلسلے کو ارادتاً منقطع کرتے ہوئے میں نے دوسرا سوال کیا: "آپ کی نظر میں اب تک آپ کی بہترین نظم کون سی ہے؟"
ساحر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "مختلف اوقات میں مختلف نظمیں بہترین معلوم ہوتی رہی ہیں۔"
"مثلاً اس وقت کون سی نظم؟"
"پرچھائیاں ـــ" ساحر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔
"کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟"
"ہرگز نہیں۔ شعر کہنے کے لئے نشے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ نشے کی حالت میں عام طور پر اچھا شعر کہا ہی نہیں جا سکتا۔"
"تو پھر آپ شراب کیوں پیتے ہیں؟"
"میں تو بش شرٹ بھی پہنتا ہوں۔ حالانکہ شاعر کے لئے ضروری نہیں ہے۔"
"شاعری سے قطع نظر ویسے آپ کے شراب پینے کی وجہ کیا ہے؟"
"میں شراب نہیں پیتا۔ جب ممبئی میں شراب بندی ہوئی تھی اس وقت بھی میں شراب نہیں پیتا تھا۔ بعد میں بلڈ پریشر کی وجہ سے طبی طور پر میں نے تین چار سال تک شراب کا استعمال کیا اور اس سے کافی افاقہ ہوا۔ اب البتہ اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ رات کو شراب پیئے بغیر اچھی طرح نیند نہیں آتی۔"
"شاعری کے علاوہ آپ کو ادب کی دوسری اصناف سے کس حد تک دلچسپی ہے؟"
"پڑھنے کی حد تک ہر صنف سے دلچسپی ہے لیکن ـــ" ساحر نے انگلیوں کو اپنے بالوں میں الجھاتے ہوئے کہا ـــ "شروع شروع میں کچھ کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں اور بعد میں چند تنقیدی مضامین بھی۔"
"کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار ہے؟"
"جمود حرکت کی ضد ہے۔ ادب میں حرکت تو ہے، لکھا بھی بہت کچھ جا رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ زیادہ بلند پایہ نہ ہو۔"
"آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟"
"میں کبھی کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ غلام ہندوستان میں آزادی کے مثبت پہلو ڈھونڈنا اور ان کا پرچار کرنا میرا نصب العین ضرور رہا ہے اور اب ذہنی طور پر اقتصادی آزادی کا حامی ہوں۔ جس کی واضح شکل میرے

نزدیک سوشلزم ہے۔''

''آپ کے خیال میں ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟''

ساحر نے ڈپلومیٹک انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا: ''اردو زبان کے مستقبل کو ہندوستان کے مستقبل سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں اردو کا وہی مستقبل ہے۔ جو خود ہندوستان کا ہے۔ یعنی جس رفتار سے تعصب اور تنگ نظری میں کمی پیدا ہوگی اسی رفتار سے ملک اور اردو دونوں آگے بڑھیں گے۔''

''اب ذرا ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق فرمائیے؟''

''میں سمجھتا ہوں ترقی پسند تحریک نے ادب اور ملک کی بڑی خدمت کی ہے۔ اگر چہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے کچھ غلطیاں بھی ضرور سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن جو لوگ صرف اس کی خامیاں ہی گنتے ہیں۔ میں ان سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''لیکن یہ تو آپ مانتے ہیں کہ اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے؟''

''جی ہاں! منظم صورت اب باقی نہیں ہے۔''

''اور کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک محض چند افراد کے حصول شہرت اور باہمی ستائش کی تحریک تھی۔ اس سے ہم نے اپنا الو تو سیدھا کیا اور تحریک کا بولو رام ہو گیا۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے''

مجھے توقع تھی کہ میری بات کے جواب میں ساحر اپنا مصرعہ پڑھ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن انہوں نے خلاف توقع بہت تحمل سے کہنا شروع کیا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اس تحریک کے افراد نے کافی قربانیاں دی ہیں۔ صعوبتیں جھیلی ہیں۔ یہ بجا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی شہرت میں اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سے سماج اور ادب کے منفی میلانات کے لئے ان کی نظریاتی یکسانی تھی۔ اب اگر تحریک میں کرائسس پیدا ہوا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں سرمایہ داری کے توڑ کے لئے اشتراکی نظام کا جو خوش آئند تصور تھا۔ اس میں بھی شخصی آزادی اور کچھ دوسرے معاملات کے متعلق بعض خرابیاں محسوس ہوئیں۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''فلمی شاعری اور خاص طور پر اپنی فلمی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

''ادبی شاعری کے لئے بھی شروع میں روایتی شاعری کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے دل پسند اسٹائل سے کام کرتا ہے۔ میں نے بھی ابتدا میں فلمی دنیا کی روایت سے ملتی جلتی شاعری کی اور بعد میں اپنی جگہ بنانے

کے بعد میں اس قابل ہوا کہ ہمت کر سکوں کہ فلموں میں اپنی پسند کی فلمیں انتخاب کر سکوں۔ اس طرح میں بآسانی اور بخوبی اپنے خیالات وجذبات کا پرچار کر سکا۔'' بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ساحر نے کہا— ''فلم کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے خیالات وجذبات کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے یہ ایک پاورفل میڈیم ہے۔''

''یہ بتائیے کہ پرانے فلمی شاعروں میں کون سا شاعر آپ کو پسند ہے؟''

''آرزو لکھنوی''

''اور ہم عصر فلمی شاعروں میں۔''

ساحر کے بھرے ہوئے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کا رنگ دوڑا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے متوازن ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا'' بات یہ ہے کہ میں فلم رائٹر ایسوسی ایشن کا صدر ہوں۔ اس لئے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اب سب فلمی شاعروں کو ایک نظر سے دیکھنا میرا فرض ہے۔''

دفعتاً مجھے ساحر کی کسی پرانی نظم کا شعر یاد آ گیا۔

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

''اس کا جواب دینا تو غالباً آپ نامناسب خیال نہیں کریں گے۔'' میں نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا: ''آپ نے ابھی تک... شادی کیوں نہیں کی؟

ساحر جیسے اس غیر متوقع سوال کو سن کر چونک سے گئے اور پھر حسب عادت اس سوال کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے جواب دیا'' کیونکہ کچھ لڑکیاں مجھ تک دیر سے پہنچیں اور کچھ لڑکیوں تک میں دیر سے پہنچا۔''

مشترکہ قہقہے کے بعد میں نے کہا'' اچھا ساحر صاحب مجھے اب اجازت دیجئے کیونکہ میں ممبئی میں اپنی قیام گاہ تک بروقت پہنچنا چاہتا ہوں۔'' ■■

عنبر و عطر میں ڈوبے ہوئے تن یاد آئے
زلف و رخسار کے شاداب چمن یاد آئے
جام اٹھایا کہ نہ آئے کوئی بھولی ہوئی یاد
آگ پی لی تو کئی شعلہ بدن یاد آئے

خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

اے۔حمید

ساحرلدھیانوی

ساحرلدھیانوی نے کمرے کی اونچی چھت اور پرانی کھڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔
''یہ تو مجھے کوئی بھوت گھر لگتا ہے۔''
ابن انشاء نے اپنے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے آنکھیں گھما کر کہا۔
''اب اس میں بھوت ہی رہیں گے۔''

ابن انشاء اور ساحرلدھیانوی کے یہ ریمارکس اس عمارت کے بارے میں تھے جو بیٹ روڈ پر نشاط سینما کے بالکل سامنے واقع ہے۔ان دونوں یہ ایک ویران اجڑی ہوئی سرخ عمارت تھی۔جس کا ذکر ہمیں آج بھی آرتھر کانن ڈائیل اور ایڈ گر ایلن پو کی پراسرار کہانیوں میں ملتا ہے۔پاکستان کو بنے بمشکل چھ سات مہینے ہوئے ہونگے۔

گوالمنڈی میں ہندو سکھوں کے مکان بھی خالی پڑے تھے۔تھانہ گوالمنڈی کے سامنے والے مکان کی ایک ادھیڑ عمر کی ہندو عورت نے اپنا مکان نہیں چھوڑا تھا۔وہ کھڑکی میں بیٹھی آتے جاتے لوگوں کو مخاطب کر کے کہتی۔

''میں نہیں جاؤں گی۔لوگ چلے گئے ہیں تو جاتے رہیں۔''

اس کے باقی گھر والے ہندوستان جا چکے تھے۔خدا جانے اس عورت کا بعد میں کیا حشر ہوا۔اسی طرح ایک ادھیڑ عمر کے ہندو میاں بیوی کو میں نے سوتر منڈی چوک میں بھی دیکھا تھا۔چوک سوتر منڈی سے جو گلی بازار شیشہ کو مڑتی ہے اس کی نکڑ پر ادھیڑ عمر ہندو کی دکان تھی۔وہ سر پر گول ہندوانہ ٹوپی رکھے،صندوقچی کے آگے بیٹھا۔۔۔ان مریضوں کو دوائی دیتا۔اس کی بیوی دکان کے اندر صف پر بیٹھی ہوتی۔یہ ہندو۔۔۔بعد میں دکھائی نہ دیا۔

رائل پارک کی بلڈنگ بھی سنسان تھیں۔صرف لکشمی بلڈنگ کے نچلے حصے میں کچھ مہاجر آباد ہوئے تھے۔رائل پارک کی گلیاں کچی تھیں اور چوک میں ایک طرف لکڑی کے شہتیروں کا ڈھیر لگا تھا۔کبھی کبھی میں اور احمد راہی ان شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔

پھر احمد راہی عارف عبدالمتین کے ساتھ فکر تونسوی کو نکالنے تونسہ شریف چلا گیا۔ اس دوران ساحر لدھیانوی اور میں نے رائل پارک کی ایک بلڈنگ کی پہلی منزل پر قبضہ کرلیا۔ بعد میں اس منزل میں قتیل شفائی آ گیا تھا۔

فکر تونسوی آ گیا۔ دبلا پتلا، باریک آنکھوں والا ذہین نوجوان، جسے تونسہ شریف سے چلے آنے کا افسوس تھا۔ ''ادب لطیف'' کی ایڈیٹری کا زمانہ اس نے ہمارے ساتھ اسی منزل میں گزارا۔ بس ایک ڈرائینگ روم اور ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ سامان وہاں سوائے ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے کوئی نہ تھا۔ کارنس پر ایک کانسی کا بڑا سا پیالہ پڑا رہ گیا تھا۔ اس پیالے میں ہم باری باری پانی پیا کرتے تھے۔ ابن انشاء ایک روز وہاں آیا تو اس پیالے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''ارے یہ تو وہی پیالہ ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔''

رات کو فکر تونسوی صوفے پر، عارف عبدالمتین اور ساحر لدھیانوی زمین پر اور میں احمد راہی پلنگ پر سو رہتے۔ ہماری جیبیں اکثر خالی رہتی تھیں۔ کبھی دو چار روپے ہوتے اور کبھی کچھ بھی نہ ہوتا۔ غزل کا معاوضہ پانچ دس روپے اور کہانی افسانے کا معاوضہ مجھے پندرہ اور پچیس روپے کے درمیان ملتا تھا۔ اس سے کچھ روز گذر بسر ہوتی اور پھر وہی فاقہ مستی شروع ہو جاتی۔ ہمارے پبلشرز وہ تھے جنھوں نے اس ملک میں اعلیٰ ترین معیاری طباعت اور کلاسیکل ادبی روایات کی بنیاد رکھی۔ احمد راہی اور فکر تونسوی ادب لطیف کے ایڈیٹر تھے۔ بعد میں راہی ''سویرا'' کا ایڈیٹر بن گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی کی ''تلخیاں'' شائع ہو چکی تھی اور بے حد مقبول ہوئی تھی مگر پبلشر سے پیسے اسے توڑ توڑ کر ملتے تھے۔ ایک روز میں اور ساحر لدھیانوی ''سویرا'' کے دفتر گئے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ پبلشر سے قسط کے پیسے لے کر انارکلی کے ہوٹل ممتاز میں چائے پیسٹری اڑائیں گے۔

ان دنوں ہماری سب سے بڑی عیاشی یہی ہوا کرتی تھی یا زیادہ سے زیادہ کوئی فلم دیکھ لی اور کپڑے بنوا لئے۔ اسی پبلشر نے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''منزل منزل'' بھی شائع کیا تھا اور کچھ پیسے میرے بھی رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کچھ پیسے وصول کرلوں گا۔ ''سویرا'' کا دفتر ان دنوں بھی لوہاری کے باہر تھا۔

چودھری نذیر احمد بڑے باغ و بہار اور علم دوست پبلشر تھے اور ہم سے بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے۔ میں اور ساحر ''سویرا'' کے دفتر میں آئے تو چودھری صاحب میز پر جھکے پوسٹ کارڈ لکھ رہے تھے۔ ہم نے سلام کیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ ذرا مسکرائے اور کارڈ لکھنے میں محو ہو گئے۔ چہرے پر خاص مسکراہٹ ابھی تک ویسی ہی تھی۔

ساحر ڈرپوک تھا۔ اس میں جرات رندانہ کا فقدان تھا۔ اب ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرر ہے تھے۔

میں نے ساحر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ''چلو مانگو اپنی کتاب ''تلخیاں'' کے باقی پیسے؟''

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جواب دیا۔ ''تم کیوں نہیں مانگتے اپنے افسانے کے بقایا پیسے؟''

میرے پیسے زیادہ نہیں تھے کیونکہ چودھری نذیر صاحب نے میرے پیسے کبھی نہیں رکھے تھے۔ اور ہمیشہ میرا معاوضہ دو تین قسطوں میں ادا کر دیا کرتے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ میرے کچھ پیسے ان کی طرف رہ جائیں۔

اتنا مجھے یقین تھا کہ ساحر لدھیانوی پیسوں کا تقاضہ نہیں کرے گا اور پہاڑ کھود کر جوئے شیر مجھے ہی نکالنی پڑے گی۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں چودھری صاحب کے قریب جا کر جھٹ کہہ دیا۔

''چودھری صاحب! پیسوں کی ضرورت آن پڑی ہے۔''

''خیر تو ہے.........کیا ضرورت پڑ گئی تم لوگوں کو؟''

چودھری صاحب نے ہمیں سارے پیسے دے دئے۔ ہم ممتاز ہوٹل آ گئے۔

ہوٹل میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ لتا منگیشکر، ہیمنت کمار، جگموہن، طلعت محمود، رفیع اور گیتا رائے کے ریکارڈ تھے۔ ہم دیوار کی ساتھ لگی ایک میز کے پاس کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ اور مزے سے چائے پیتے اور میوزک سنتے رہے۔

ساحر لدھیانوی لمبے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لمبا قد ہونے کی وجہ سے وہ ذرا آگے کو جھک کر چلتا خالص لدھیانوی تھا۔ اردو پنجابی انداز میں بولتا۔ بات نرمی سے کرتا اور کھل کر کبھی قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ شعر سناتے وقت ذرا ذرا مسکراتا رہتا تھا۔ ان دنوں ساحر کی نظم ''ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں'' اور ''تاج محل'' کا بڑا چرچا تھا۔ ''تاج محل'' تو کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بے حد پاپولر تھی۔ مشاعرے میں یہ دونوں نظمیں خاص طور پر فرمائش کر کے اس سے سنتے۔

ساحر مشاعرے میں اپنی نظم پڑھتے ہوئے جھینپ جایا کرتا تھا۔ جب اس کے کسی شعر پر لوگ داد دیتے تو اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا۔ کھانے پینے میں بڑا سادگی پسند تھا۔ کپڑے زیادہ تر کھدر کے پہنتا۔ اس کا ایک گرم اوور کوٹ تھا، جسے میں، احمد راہی اور عارف عبدالمتین بھی پہنا کرتے تھے۔ ابن انشاء اس کوٹ کو

گوگول کا اوورکوٹ کہا کرتا۔

رائل پارک والی بلڈنگ کے دن بڑے یادگار دن تھے۔ اس بے سروسامانی کے عالم بھی ایک دلکشی اور جشن کا پہلو تھا۔ ہمیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی کہ صبح کا ناشتہ کرلیا ہے تو دوپہر کا کھانا کہاں سے کھائیں گے؟ ناشتہ یہ ہوتا کہ چائے کے ساتھ دو سلائس کھالیتے۔ رات کو جب سگریٹ ختم ہوتے تو آپس میں پیسے ڈال کر بازار سے سگریٹ لاتے۔ بڑے ستاروں والے کیپسٹن کا پیکٹ ان دنوں شاید تین چار آنے میں آتا تھا۔ یہ سگریٹ ہم بھی بڑے شوق سے پیا کرتے تھے۔ عارف سگریٹ نہیں پیتا تھا وہ ہمیں سگریٹ پیتے دیکھا کرتا تھا۔ عارف امرتسر سے ہی نظمیں کہتا لاہور آیا تھا اور یہاں آکر بڑی اچھی شاعری کر رہا تھا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ سگریٹ حسب معمول ختم ہوگئے فکر تونسوی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو آنے نکال کر کہا۔

''دوستو! میں یہ نذرانہ پیش کرسکتا ہوں اس کے سوا اس خاکسار کی جیب میں خاک نہیں۔

ساحرلدھیانوی کہنے لگا۔

''چلو اے حمید اس کے سگریٹ لے آؤ'' میں نے احمد راہی کو ساتھ لیا تو ساحر نے آواز لگادی۔

''آدھے راستے میں ہی نہ پی آنا یہاں آکر ہمارے ساتھ پینا۔''

''رات کافی گزر چکی تھی خوشگوار رات تھی اور معمولی خنکی تھی۔ میکلوڈ روڈ ان دنوں دن کے وقت ویران ویران سی ہوتی تھی رات کو بالکل ہی سنسان تھی۔ گیتا بھون بلڈنگ کے نیچے ایک مرادآبادی بزرگ پان سگریٹ کا کھوکھا لگاتے تھے۔ وہ اپنے کھوکھے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کیپسٹن کے سگریٹوں کی نصف ڈبی لی اور رائل پارک میں آگئے۔

چوک میں آکر ہم نہ جانے کیوں شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں ایسے مگن ہوئے کہ یہ خیال ہی نہ رہا کہ ساحرلدھیانوی اور فکر تونسوی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہم دو سگریٹ پی گئے۔ پھر خیال آیا کہ وہ لگو سگریٹوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جلدی سے اٹھ کر وہاں پہنچے تو ہمارا خیر مقدم بڑی لچھے دار گالیوں سے ہوا۔ ساحرلدھیانوی کا نشہ ٹوٹنے سے بُرا حال تھا۔ فکر تونسوی کی آنکھوں سے سے پانی بہہ رہا تھا۔

''کمینو! کہاں ہیں سگریٹ؟''

ہم نے جھٹ باقی تین سگریٹ ان کی طرف پھینک کر کہا۔

''ہم اپنے حصے کے سگریٹ پی آئے ہیں۔''

ساحر لدھیانوی نے مسکرا کر کہا۔

''اب ان سگریٹوں کا دھواں بھی تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ فکر قابو کر کے رکھ لے ڈبی کو۔'' فکر تونسوی نے ڈبی کھول کر ایک سگریٹ خود لگایا' ایک ساحر لدھیانوی کو لگا کر دیا۔

عارف بولا:

دوستو! کیا تم ایک سگریٹ سے کام نہیں چلا سکتے ختم ہو گئے تو پر پھر کیا کرو گے؟ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔''

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

''اب تو ہم بھی پورا پورا سگریٹ پئیں گے۔ یہ اے حمید اور احمد راہی کیوں ایک ایک سگریٹ ختم کر کے آئے ہیں؟''

ہمارے لئے بڑی مصیبت تھی، کیونکہ ہمیں تو وہ سگریٹ کا ایک کش لگانے کی بھی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے سامنے انہوں نے ایک ایک سگریٹ ختم کیا اور اس کا دھواں بھی دوسری طرف پھینکتے رہے۔ ایک سگریٹ باقی رہ گیا تھا۔ آرف کو نیند آ گئی۔ وہ فرش پر بچھی ہوئی دری پر سو گیا۔ ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھی نیند سے ابل رہی تھیں۔ رات کے دو بج چلے تھے۔

اس نے جمائی لے کر کہا۔

''یار! میں تو سونے لگا۔''

فکر نے کہا۔

''آج صوفے پر میں سوؤں گا۔''

ساحر جھٹ سے بولا۔

''اور میں تمہارے سر پر سوؤں گا؟ میں زمین پر نہیں سو سکتا۔ میری کمر میں پہلے ہی درد رہتا ہے۔''

احمد راہی نے کہا۔ پھر تو تمہیں ضرور زمین پر سونا چاہیے کیونکہ یہ حکیمی نسخہ ہے کہ جس کی کمر میں درد ہو اس کیلئے فرش پر سونا فائدہ مند ہوتا ہے۔''

ساحر لدھیانوی بولا۔

''آج تم کیوں نہیں سو جاتے زمین پر۔''

''میری کمر میں درد نہیں ہے۔''

فکر تونسوی کہنے لگا۔

''یار کیا فضول بحث کر رہے ہو۔ میں تم لوگوں اپنا تازہ مزاحیہ مضمون سناتا ہوں۔ خدا کی قسم تم لوگوں کی نیند نہ اڑ جائے تو فکر نام نہیں۔''

ساحر لدھیانوی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

''اے دشت نجد کے آوارہ مجنوں! خبردار جو تم نے مضمون سنانے کا پھر نام لیا''

فکر تونسوی ہنس کر بولا۔

''پھر چپکے سے زمین پر سو جاؤں اور میرے لئے آرام دہ صوفہ چھوڑ دو۔''

ساحر لدھیانوی نے سر جھکا کر کہا۔

''میں زمین کے اندر سو سکتا ہوں مگر تمہارا مضمون نہیں سن سکتا۔''

عارف عبدالمتین نے لیٹے لیٹے کہا۔

دوستو! میری نیند تو غارت نہ کرو۔''

فکر تونسوی نے سر جھاڑ کر کہا۔

''چلو یار اب سو جاؤ، اے حمید! سہگل کا کوئی گیت سناؤ یار۔ نیند ذرا جلدی آجائے گی۔''

میں نے پلنگ کی پٹی پر ٹیک لگاتے ہوئے فلم ''سٹریٹ سنگر'' میں سہگل کا گایا ہوا گیت سنانا شروع کر دیا۔

ساحر لدھیانوی دری پر لیٹا دیوار کی طرف منہ کئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

نیند بھری آواز میں بولا۔

''اے حمید تمہاری آواز میں بڑا سوز ہے۔''

فکر تونسوی بولا۔

''تم ریڈیو پر کیوں نہیں گاتے؟''

عارف سوتے سوتے بڑبڑایا۔

''خدا کیلئے سونے دو۔''

احمد راہی نے کہا۔

''میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔''

سب سو گئے۔ صرف میں اور احمد راہی جاگ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک پلنگ پر چت لیٹے چھت کو تک رہے تھے۔ جس کا پنکھا لوگ اتار لے گئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ساحر لدھیانوی کی نیند بھری آواز آئی۔

''اوئے آہستہ باتیں کرو۔''

میں نے کہا۔

''اس سے آہستہ بات تو عارف متین ہی کر سکتا ہے، ہم نہیں کر سکتے۔''

ساحر لدھیانوی ہنس پڑا۔ عارف عبدالمتین سو چکا تھا۔ نہیں تو وہ ضرور ہم پر کوئی نہ کوئی جملہ چست کرتا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں بھی نیند آ گئی۔ رات کے چار بجے تھے۔ کہ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میں نے فضا میں سگریٹ کی خوشبو محسوس کی۔ ایک دو بار لمبے لمبے سانس لئے۔ کمرے کی بند فضا میں کیپسٹن کے سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ چھپ چھپ کر سگریٹ کون پی رہا ہے؟ جبکہ رات کو ہمارے سگریٹ ختم ہو چکے تھے بلکہ ہم نے تو فرش کے کونوں کھدروں سے ٹوٹے بھی ڈھونڈ کر پی لئے تھے۔

میں نے احمد راہی کو آہستہ سے ہلا کر جگایا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔''

اس اپنی لال لال آنکھیں کھول کر ناک کے چوڑے نتھنے پھیلائے اور سرگوشی میں جواب دیا۔

ساحر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ اچھل کر پلنگ سے اُٹھا اور ہم دونوں نے فرش پر لیٹے ساحر لدھیانوی پر چھلانگ لگا دی۔ وہ ہڑ بڑا کر بولا۔

''کیا طوفان آ گیا ہے''

''سگریٹ کہاں ہے؟'' احمد راہی نے مطالبہ کیا۔

ساحر لدھیانوی مٹھی میں سگریٹ کو دبائے ہوئے تھا۔

''کمینے ہم سے سگریٹ کو چھپا کر پیتا ہے۔''

فکر تونسوی بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''یار یہ سگریٹ کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے ہمیں بھی ایک کش لگواؤ۔''

''ساحر پی رہا ہے۔''

''لاؤ یار ساحر ایک جرعہ ہمیں بھی عنایت ہو۔''

''مگر یہ ہم سے چھپا کر سگریٹ پیتا ہے۔''

ساحر بولا۔

آخری ٹکڑا کونے سے ڈھونڈ کر پی رہا تھا۔ یہ لو کمینو! تم بھی پیو۔''

اور ساحر لدھیانوی نے ٹکڑے کا آخری حصہ میری جھولی میں پھینک دیا۔ میں نے جھولی کو جھٹکا تو جلتا ہوا سگریٹ عارف کی گردن پر جا گرا۔ وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

''کیا مصیبت ہے؟''

سگریٹ کا ٹکڑا عارف کی گردن سے اچھل کر فکر تونسوی کے صوفے کی طرف آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے کیچ کر کے اسے ہتھیلیوں میں دو ایک بار اچھالا اور پھر اسے انگلیوں میں دبا کر کش پر کش لگانے شروع کر دیئے۔

''سگریٹ کے آخری حصے میں بڑی نکوٹین ہوتی ہے۔ بڑا نشہ آ رہا ہے۔''

فکر تونسوی عارف اور احمد راہی تو پھر سو گئے لیکن میں اور ساحر لدھیانوی جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح ہونے والی تھی اس وقت ہمیں چائے اور سگریٹ کی بڑی طلب ہوئی ساحر لدھیانوی نے کہا۔ ''اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''وعدہ کرتا ہوں، وہ حسین راز کیا ہے؟''

ساحر لدھیانوی سرگوشی میں بولا۔

''میری جیب میں اس وقت پورے دو روپے پڑے ہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ میں نے اپنے سوئے ہوئے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اگر تم بھی وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں بھی تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں۔''

ساحر لدھیانوی نے جھٹ سوال کیا۔

''تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟''

''ڈیڑھ روپیہ میری جیب میں ہے۔''

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

''چلو پھر باہر چل کر کہیں چائے پیتے ہیں۔''

''چلو۔''

ہم دونو آہستہ آہستہ سے دبے پاؤں اٹھ کر دروازے کے پاس ہی آئے تھے کہ احمد راہی کی بھاری بھرکم خواب آور آواز گونجی۔

''تم دونوں کمینے ہو۔'' اس سے پہلے کہ احمد راہی ہمیں گالیاں دیتا ہم بھاگ کر گلی میں آ چکے تھے اور ہنس ہنس کر ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔

ساحر لدھیانوی بولا۔
ایک پیکٹ سگریٹ ان کو بھی دے کر جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے۔"
ہم میکلوڈ روڈ پر آ گئے ۔رات ڈھل رہی تھی ۔سڑک سنسان پڑی تھی ۔ برسٹل ہوٹل کے باہر ایک تانگہ کھڑا تھا جس کا کوچوان اگلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ مراد آبادی کھوکھا بند تھا۔ ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔
"پیارے اس وقت صرف ریلوے اسٹیشن پر ہی چائے مل سکتی ہے۔ واپسی پر ان لوگوں کے سگریٹ بھی وہیں سے لیتے آئیں گے۔ چلو اسٹیشن پر ہی چلتے ہیں۔"
اور ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ رتن سنیما ویران پڑا تھا۔
"چٹان" کا دفتر بھی بند پڑا تھا اور باہر چوکیدار فرش پر ہی سو رہا تھا۔ "لاہور ہوٹل" کی عمارت ابھی تک پرانی ہی تھی اور اس کے ساتھ والی مشہور پارسی لانڈری اور کشمیری لانڈری کی دکانیں بھی بند تھیں۔ ریلوے اسٹیشن جاگ رہا تھا۔ لوہے کی اونچی چھت والے تانگہ اسٹینڈ میں تانگے کھڑے تھے۔ سامنے جو چھوٹا سا پلاٹ ہوا کرتا تھا۔ وہاں مہاجر کیمپ بنا تھا۔ جہاں ہندوستان سے آنے والے گھڑی پل کو رکتے تھے اور پھر انہیں مسلم لیگ کے ٹرکوں میں ڈال کر ویلٹن کیمپ پہنچا دیا جاتا تھا۔
ہم پلیٹ فارم پر آ گئے ۔ پلیٹ فارم ٹکٹ لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان دنوں ریلوے ٹکٹ بھی کوئی نہیں خریدتا تھا۔ مہاجرین کی اسپیشل ٹرینیں چلا کرتی تھیں۔ مسافر مفت سفر کرتے تھے۔ ہم ریلوے کینٹین کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر چائے پینے لگے۔ وہیں سے ہم نے سگریٹ بھی لے لئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کی چائے بڑی اچھی ہوتی تھی اور پیالی دو وانس کی ہوا کرتی تھی۔ پیالی کے باہر لکھا ہوتا تھا۔
"دو وانس"
میں نے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور سگریٹ سلگا کر ساحر کے ساتھ پل کی سیڑھیاں اتر کر سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اب دن کا جالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ نیچے پیراڈائیز ریسٹورینٹ کھلا تھا۔
میں نے کہا۔
"یہاں بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ابن انشاء بھی یہاں آ جائے۔" پیراڈائیز ریسٹورنٹ میکاڈ روڈ کا کافی ہاؤس تھا۔ کبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اسی جگہ بیٹھتے تھے ۔ ریسٹورینٹ کا مالک یوپی کا ایک سرخ و سپید دبلا پتلا نوجوان تھا۔ جس کو شاعروں اور ادیبوں سے بڑی عقیدت تھی۔ شاید یہ اسی عقیدت کے اظہار کا ایک پہلو تھا کہ جب کسی شاعر یا افسانہ نگار کا بل بڑھ جاتا تو وہ ریسٹورنٹ کے باہر لگے ہوئے تختہ

سیاہ پر اس شاعر یا افسانہ نگار کا نام لکھ کر آگے واجب الادا رقم درج کر دیتا تھا۔

پیراڈائیز ریسٹورنٹ خالی تھا۔نوکر فرش دھو رہے تھے۔ہم اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر بعد قمر اجنالوی آ گیا۔اونچا لمبا گھرے گنجان سیاہ بالوں والا مٹھی میں سگریٹ دبائے زور سے کش لگا کر اس نے ہم دونوں کو دیکھا اور ہنستا ہوا ہمارے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''صبح دم دروازہ کھلا۔چائے تو میں بھی پیوں گا کامریڈ۔''

اتنے میں ابن انشاء بھی آ گیا۔

''ارے تم لوگ رات سے اسی جگہ بیٹھے لگتے ہو۔کم بختو! اس شہر دل فگار میں سورج تو نکل لینے دیا کرو۔''

رائل پارک کی بلڈنگ ہم سے چھن گئی۔ عارف عبدالمتین نے پرانی انارکلی اور احمد راہی نے گوالمنڈی میں مکان الاٹ کروالئے فکر تونسوی کو لاہور چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑ گیا۔میرا خیال ہے فکر تونسوی اور کنہیا لال کپور دو آخری غیر مسلم ادیب تھے جنہوں نے روتے ہوئے لاہور کو الوداع کہا۔

ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والا ''بھوت گھر'' الاٹ ہو گیا۔ہماری فیملی بھی لاہور آ گئی اور فیض باغ میں رہنا شروع کر دیا۔

ساحر لدھیانوی کا کمرہ نچلی منزل میں تھا۔بلڈنگ خستہ حال تھی۔دیواروں کا چونا گر رہا تھا۔اونچی چھت میں جالے لٹکے تھے۔

غسل خانے کی کھڑکی بند نہ ہوتی تھی۔ نلکے کی ٹونٹی سے پانی ہر وقت گرتا رہتا تھا۔اس جگہ کھڑکی میں ٹوٹا ہوا شیشہ رکھ کر ساحر لدھیانوی شیو بنایا کرتا تھا۔روشن دان میں چڑیوں نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔اس عمارت کے آگے ایک لان تھا۔جس میں جھاڑ جھنکار اُگا ہوا تھا۔آج کل یہاں کڑاہی تکہ والوں کے کھوکھے ہیں پہلے یہاں نہیں تھے۔سامنے امروز کا دفتر تھا۔جس کی ایک جانب کسی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی نے دفتر بنا رکھا تھا۔

ابن انشاء نے اسی بلڈنگ کی ایک انیکسی الاٹ کروالی تھی۔جس کی چھت سرخ اور مخروطی تھی۔یہ چینی طرز کا ایک منزلہ مکان آج بھی ویسے ہی ہے اور ابراہیم جلیس اسے چینی پگوڈا کہا کرتا تھا۔ساحر کے کمرے میں صرف ایک چارپائی،ایک میز دو کرسیاں اور ایک پرانی سی دری بچھی تھی۔اندھیرا سا چھایا رہتا تھا۔گرمیوں میں یہ کمرہ بڑا ٹھنڈا اور سردیوں میں بہت زیادہ سرد ہوتا۔

دوپہر کے بعد میں اور ساحر ہفت روزہ ''اداکار'' کے دفتر میں گئے۔قتیل شفائی پریس میں بھیجنے سے

پہلے پرچے کی کاپیاں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمارے لئے چائے منگوائی اور انگلی کھڑی کر کے بولا۔

''صرف ایک منٹ۔''

خوش شکل نوجوان، گھنے سیاہ بالوں والا سرخ وسفید، قتیل شفائی زندگی اور شعری استعداد سے بھرپور تھا۔ عشق ومحبت کے ساتھ ساتھ اس کی نظموں اور غزلوں میں طبقاتی تضاد سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی بھرپور شعور ملتا تھا۔ اس کی غزل اس عہد کی نئی آواز تھی۔ چمکتے چھنکتے اور مترنم شعر کہتا تھا۔

چائے آ گئی۔ قتیل نے کاپی پریس بھجوا دی اور سگریٹ ہماری طرف کر کے بولا۔

''یار! تم لوگ بڑے ہرجائی ہو۔ وعدے کرتے ہو مگر بھاگ جاتے ہو۔ اگلی بار اگر تم لوگوں نے اپنی کوئی چیز نہ دی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔''

قتیل شفائی کی ناراضگی ہمیں گوارا نہیں تھی۔ ساحر لدھیانوی نے کہا۔

''میں ایک نظم ضرور دوں گا۔ اے حمید سے تم بات کرلو کیونکہ اس کوئی اعتبار نہیں ہے۔''

قتیل نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

کوئی بھائی! اب بات کرو مجھ سے۔'' چلو ہو گئی بات۔ اب لو ایک عدد سگریٹ کا مجھے نقصان پہنچاؤ۔''

اس شام کو ترقی پسند مصنفین کا اجلاس تھا جس میں ساحر پر ایک صاحب مقالہ پڑھنے والے تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ شکل یاد ہے یہ صاحب پکے رنگ کے تھے اور علی گڑھ سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ ہم تینوں ''ادا کار'' کے دفتر سے اٹھ کر سیدھے دیال سنگھ کالج لائبریری میں گئے۔ جہاں انجمن کا ادبی اجلاس ہونے والا تھا۔ سبھی دوست جمع تھے۔ علی گڑھ والے صاحب نے ساحر لدھیانوی پر اپنا مقالہ پڑھا۔ بڑا پر مغز مقالہ تھا لیکن انہوں نے ساحر لدھیانوی کی رومانویت پر سخت تنقید کی۔

ویسے بھی ترقی پسند مصنفین رومانیت کے جانی دشمن تھے۔ میرے افسانوں پر انہیں سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا تھا کہ میں ناریل کے درختوں اور بدھ مندر کی دیوداسیوں، زرد گلابوں اور موتیوں کے گجروں کے بغیر ایک قدم آگے نہیں چلتا تھا۔ ساحر لدھیانوی حالانکہ اتنا زیادہ رومانٹک نہیں تھا اور اس کی شاعری میں ہمیں حقیقت پسندی اور سماج سے بغاوت بدرجہ اتم ملتی ہے۔ لیکن خدا جانے ان علی گڑھ والے صاحب کی آٹے میں نمک کے برابر رومان پسندی بھی کیوں گوارہ نہ ہوئی۔

ساحر میرے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔ ''ابھی حدیث دل کی بہت تفسیر لکھی جائیں گی پیارے۔''

ساحرلدھیانوی کو اپنی ہمہ گیر مقبولیت کا بھرپور احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عہد کی نئی نسل کا فیض احمد فیض کے بعد وہی پسندیدہ ترین شاعر ہے وہ فیض صاحب کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اور ان کا مداح تھا۔

سیف الدین سیف کی شاعری کو وہ بڑے جذبے کی شاعری سمجھتا تھا۔ غزل میں قتیل اور عبدالحمید عدمؔ کا ڈنکہ بج رہا تھا۔

کالجوں میں مشاعرے ہوتے تو یہی لوگ مشاعرہ لوٹ کرلے جاتے تھے۔ ایک روز میں ابن انشاء کے چینی مندر سے اُٹھ کر ساحر کی طرف گیا تو وہ غسل خانے کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے آگے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا تھا۔ مجھے شیشوں میں سے اس کی ایک آنکھ نظر آئی۔

''وہ چینی بھکشو کہاں ہے؟''

ساحرلدھیانوی کا مقصد ابن انشاء سے تھا۔ میں نے ساحر کے پلنگ پر بیٹھ کر نیوٹائمز کا تازہ شمارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی اپنے ٹوٹے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا تھا، ساحر تولئے سے منہ پونچھتا ہوا غسل خانے سے باہر آیا۔ وہ گنگنا رہا تھا، میں نے پوچھا۔

''آج یہ تیاری کس کیلئے ہو رہی ہے؟ کیا اس سے ملنے تو نہیں جا رہے''۔

ساحرلدھیانوی مسکرانے لگا۔

''میں پتلون پہن کر ابھی آیا۔''

میں نے کہا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

پتلون پہن کر آتا ہوں پھر سوال کا جواب دوں گا۔''

تھوڑی دیر میں وہ آگیا اس نے کریم کلر کی ٹھنڈی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پیچھے کو جمے ہوئے تھے اور چمک رہے تھے۔ بسکٹ رنگ کی پوری شرٹ نے اس کی پتلی باہوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے کارنس پر رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھا اور جھک کر آئینے میں اپنا چہرا تکنے اور بالوں میں ایک بار پھر کنگی پھیرنے لگا۔ میں نے رسالہ پھینکتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ارادے کیا ہیں آج؟''

''آؤ میرے ساتھ''۔

اور میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل کر احاطے کی روش پر سے ہو کر دوسری طرف ایبٹ روڈ

پر آ گیا۔

"ابن انشاء کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔"

"ارے خدا کا نام لو اے حمید۔"

ساحر نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کو بالکل خبر نہیں کرنی۔"

"کس بات کی؟" میں نے پوچھا۔

ساحر نے میرے کندھوں پر ہاتھ کر کہا۔

"تم آؤ تو سہی۔"

میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم لوگ کہاں گئے تھے۔

انہی دنوں انقلابی نظمیں لکھنے کی وجہ سے ساحر کے پیچھے سی آئی ڈی لگ، وہ ڈرپوک ہونے کی حد تک امن پسند تھا۔ چنانچہ گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔

انہی دنوں کیفی اعظمی لاہور آ گیا۔ کیفی کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس اور پیراڈائیز میں محفلیں سجنے لگیں۔ حمید اختر یہاں پہلے ہی سے موجود تھا لیکن ساحر کم گھر سے باہر نکلتا تھا۔

ساحر لدھیانوی نے ایک روز گھبرا کر بمبئی جانے کیا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ابن انشاء اور حمید اختر نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر ساحر کے پاؤں لاہور کے میدان سے اکھڑ چکے تھے۔ ہم اسے بار بار سمجھاتے کہ لاہور سے نہ جائے وہ بار بار یہی کہتا،

"نہیں اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

کیفی اعظمی بمبئی جا چکا تھا۔ اس نے بمبئی سے ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ پیارے بس آ جاؤ۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ ہم نے ایک بار پھر ساحر کو بمبئی جانے سے روکا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی تھی کہ وہ ہماری نصیحتوں پر عمل نہیں کر رہا تھا۔

پھر ایک روز ہم ساحر لدھیانوی کو الوداع کہنے والٹن ائیر پورٹ پر جا رہے تھے۔

ابھی لاہور کا ہوائی اڈا تعمیر نہیں ہوا تھا اور فوکر طیارے والٹن کے ہوائی اڈے سے اڑا کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بڑی مشکل سے اڑا کرتے تھے۔

ساحر لدھیانوی نے شنڈ کر دار رکھی تھی اور فلیٹ ہیٹ کھینچ کر کانوں تک پہن رکھی تھی۔ وہی پرانا پھٹا ہوا کوٹ زیب تن تھا جس کو میں اور احمد راہی باری باری پہنا کرتے تھے۔ ہوائی اڈے پر بھی وہ کسی ملک کے

بڑے اہم جاسوس کی طرح بار بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں لگا ہوا۔
حمید اختر نے کہا۔
''اگر پیچھے لگا بھی ہوگا تو اب تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ ساحر لدھیانوی نے سوکھا لمبا جسم جھکا جھکا کر ہم سب سے ہاتھ ملایا اور میلے کچیلے کوٹ کے ساتھ سب سے باری باری بغل گیر ہوا۔ ہم سے کسی دوست نے مذاقاً کہا۔

''لیکن ساحر لدھیانوی کی قسمت یاوری کر رہی تھی۔ وہ فوکر جہاز میں سوار ہو گیا۔ اور جہاز کے دونوں پنکھے طوفانی گردش میں آگئے۔ چند لمحوں کے بعد ہوائی جہاز لاہور کی فضا سے نکل کر بمبئی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

بمبئی جا کر ساحر لدھیانوی کا سب سے زیادہ روشن اور سنہری دور شروع ہوتا ہے۔
فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' نے اس کی زندگی کو کامیابی اور عروج کی راہ پر ڈال دیا۔ دیکھتے دیکھتے ساحر لدھیانوی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ جن لوگوں نے اس کے زوال کے خواب دیکھے تھے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے۔

ساحر لدھیانوی ایک بار دہلی آیا تو ہم نے سنا کہ اس نے اپنی نئی کار بھی ریل گاڑی میں ساتھ رکھوالی تھی تا کہ دہلی میں اسے سواری کی دقت نہ ہو۔ ہم نے سنا تو خوش ہوئے کہ ساحر نے اچھا کیا جو دہلی کے پبلشروں کے آگے ایک شاعر کی حیثیت بلند کر کے دکھایا۔ آخر شاعر اور ادیب کے پاس کار کیوں نہیں ہو سکتی؟
پھر وقت گزرتا چلا گیا اور ساحر لدھیانوی کامیابی کی منزلیں طے کرتا ایک مقام پر جا کر سکون پذیر ہو گیا۔ کبھی کبھی اس کا کوئی خط لاہور کے دوستوں کے نام آجاتا۔ کبھی یہاں کے دوست بمبئی جا کر اسے مل آتے۔

واپس آکر بتاتے کہ ساحر نے بمبئی میں اپنے فلیٹ بنوا رکھے ہیں جہاں ہندوستان اور پاکستان کا کوئی بھی ادیب شاعر جا کر جتنے روز چاہے ٹھہر سکتا ہے۔
ساحر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ایک دوست نے بمبئی سے آکر بتایا۔
''وہاں سب ادیب اپاہج ہو گئے ہیں۔ ساحر چل پھر نہیں سکتا۔ کیفی اعظمی وہیل چیئر پر بیٹھتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کسی آدمی کے کندھے کا سہارا لے کر اسٹوڈیوز میں آتا ہے۔ خدا بچائے بمبئی سے۔''

اپنے اپنے سفر پہ ہیں کب سے رواں، پھر بھی کیا بات ہے دونوں تھکتے نہیں
آپ راہوں میں کانٹے بچھاتے ہوئے، ہم زمینوں کو گلزار کرتے ہوئے
خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

حافظ لدھیانوی

کچھ یادیں بھولی بسری سی

ساحر لدھیانوی کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کر رہا تھا کہ اس کی وفات کی خبر سنی۔ قلم گر گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ساحر کی زندگی، اس کی شاعری، اس کے معاشقے، اس کی جدو جہد، ناکامیاں، کامیابیاں، ایک ایک کر کے افق ذہن پر اجاگر ہو گئیں۔ کالج کی زندگی سے لے کر تقسیم پاک و ہند تک کے سیکڑوں واقعات متحرک فلم کی صورت نظروں کے سامنے آگئے۔ رفاقت کا ایک ایک لمحہ یادوں کو لئے ذہن کے افق پر طلوع ہوا۔ ان یادوں نے ماضی کے سیکڑوں واقعات کو حال کے آئینے میں سجا دیا۔ ماضی کی البم کے ورق کھلنا شروع ہو گئے۔ وہ البم جس میں تصویریں تسلسل کے ساتھ لگائی گئیں تھیں۔ ہر ورق ایک کہانی، ہر تصویر ایک افسانہ تھی۔ اس البم سے رفاقتوں کی منزلیں تاباں ہو گئیں۔

لوگ بچھڑ جاتے ہیں مگر زندگی کی شاہراہوں پر اپنی جدو جہد کے ایسے تابندہ نقوش اور ایسے ایسے سنگ میل چھوڑ جاتے ہیں جن سے ان کی داستان زندگی مرتب کی جاسکتی ہے۔ ان کے افعال و کردار کے ماضی وحال اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار کو پرکھا اور جانچا جاسکتا ہے۔ ان کے کارناموں اور دلچسپیوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ زندگی بے ثبات میں مشہور و معروف شخصیتوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جنہوں نے ان کو ایک مستقل حیات بخش دی۔ ان کی یاد، ان کا ذکر ابدی ہو گیا۔ وہ اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ مگر ان کی تحریریں ان کی زبان بن گئیں۔ جن کے واسطے سے وہ آنے والی نسلوں سے ہمیشہ ہم کلام رہیں گے۔ لوگ یہ بے صوت آوازیں سنتے رہیں گے ان کے الفاظ کی صدا فضائے دہر میں گونجتی رہے گی اور ان آوازوں سے، ان صداؤں کے حسن سے، جذبے کی صداقت سے زندگی کے ان گنت گوشوں میں رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

ساحر کا گھرانہ علمی وادبی گھرانا نہ تھا، نہ اسے شاعری ورثے میں ملی، نہ ہی اس کی آنکھ کسی پاکیزہ اور خوبصورت ماحول میں کھلی، جہاں چاروں طرف علمی وادبی مہک پھیلی ہو۔ ماحول نے اس کو بے اطمینانی، تاریکی، ذہنی خلفشار اور روحانی کرب دیا۔ وہ خود کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کرنے لگا۔ معاشرے کا زہر اس کے رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ اس نے اس زہر کا تریاق شاعری میں ڈھونڈا۔ اپنے جذبۂ نفرت کو تسکین

دینے کے لئے، معاشرے کے کوڑھ کو دکھانے کے لئے، مشاہدے کی اذیت کو کم کرنے کے لئے اس نے شاعری کا سہارا لیا۔ جو اس کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔ مگر یہ فریضہ چند دنوں کا نہ تھا۔ اس کے لئے عمر درکار تھی...

ساحر مبلغ تھا نہ مصلح، مگر اس کے اندر بدنما ماحول کے خلاف بغاوت کا جذبہ موجود تھا۔ وہ شاعری کے ذریعے اپنے ذہن کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی نظم 'ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں' اس کے مشاہدے کی غماز اور گھناؤنے ماحول کے تجزیے کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کا ایک ایک بند طنز کا زہریلا اور تیز نشتر ہے۔ اس نظم میں جذبات واحساسات کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ نظم زندگی کے چہرے پر بدنما داغوں کو نمایاں کرتی ہے، اس نظم کا عنوان 'چکلے' ہے۔ ساحر نے اس نظم میں عصمت فروشی کے اڈوں، بے حیائی کے مراکز اور انسانی ہوس کی جگہوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ نظم کے چند بند ملاحظہ کیجئے۔

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

یہ صدیوں سے بے خواب سہمی سی گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ
ثناخوان تقدیس مشرق کولاؤ
ثناخوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

یہ ساحر کا اپنے ماحول کے خلاف فکری اور ذہنی احتجاج تھا جس نے اس نظم میں چیخ کی صورت اختیار کرلی۔ نظم کا ایک ایک بند معاشرے کی گھناؤنی تصویر سے پردہ اٹھاتا معلوم ہوتا ہے۔ اسی نفرت کے جذبے، ماحول کی اسی بدصورتی اور اسی حقائق کی تلخی نے ساحر کو شعر کہنے پر اکسایا، اس کی شاعری کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اس کی شاعری کا دائرہ غیر ملکی تسلط کے خلاف، غلامانہ زندگی سے بے زاری اور بھیانک ماحول سے بغاوت تک پہنچ گیا۔ اس نے سامراج کے خلاف اپنی نحیف آواز بلند مینار پر کھڑے ہوکر بلند کرنا چاہی، اس کی شاعری کا آغاز جذباتی انقلابی شاعری سے ہوا۔ اس کی ابتدائی شاعری میں شعری لطافتیں کم تھیں، نعرہ زیادہ تھا۔ شعر میں اشاریت، رمزیت، پختگی، بات کرنے کا اسلوب اور شعریت کافی حد تک مفقود تھی۔ اندر کے لاوے کو، ذہن میں برپا ہونے والے طوفان کو، دل سے اٹھنے والی نفرت اور بغاوت کی لہروں کو وہ شعر کی زبان دینا چاہتا تھا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ نوجوانی میں جب انسان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے تو شدتِ جذبات کا اظہار حدود وقیود سے آزاد ہوتا ہے۔ مجھے اس کی طالب علمی کے دور کے چند اشعار اب تک یاد ہیں جن سے ساحر کی ابتدائی شاعری کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مرا کیا ہے مجھے تو کھانسنے میں خون آتا ہے
چراغ زندگی بجھنے کو ہے اب ٹمٹماتا ہے
مزے سے دن گزارو اور بہاریں لو جوانی کی
بھلا میعاد ہی کیا ہے جہاں میں حسن فانی کی
مجھ کو جانے دے کہ میرا منتظر ہے انقلاب
دیکھ ابھرا چاہتا ہے عصر نو کا آفتاب

آغا امام اکرم یوسفی لدھیانے میں میرے ہمسائے تھے۔ زندگی بھر شعر و شاعری سے شغف رہا۔ تمام عمر مجرد رہے۔ حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اس حلقے میں انور افسانہ نگار بھی شامل تھا، جس کے افسانے اس زمانے کے ادبی مجلوں میں شائع ہوتے تھے۔ نوجوان شعرا بھی آغا اعجاز اکرم یوسفی سے اکتساب ہنر کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اس حلقے میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ صبح سے شام تک آغا صاحب کے مکان پر احباب کی آمد و رفت

جاری رہتی۔ ان میں شعرا کرام، سیاسی حضرات، کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگ، تاش کے کھلاڑی، شطرنج کے شوقین، سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ آغا صاحب کا مکان اچھا خاصا تفریحی کلب تھا۔ آغا صاحب حقہ سامنے رکھے ہر ایک کے ذوق کی تسکین کا باعث تھے۔ ساحر لدھیانوی بھی اس حلقۂ احباب میں شرکت کرتا تھا۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، اس کی شاعری انقلابی نعرہ بازی تھی۔ آغا اعجاز اکرم یوسفی ایک جوشیلے نوجوان تھے۔ ساحر کے دل میں بغاوت کی چنگاری لگانے میں آغا اعجاز اکرم یوسفی کی صحبت اور رفاقت کا بہت بڑا دخل تھا۔ اسی مجلس میں سب سے پہلے ساحر لدھیانوی کا تعارف ہوا۔ وہ اپنا تازہ کلام آغا صاحب کو دکھاتا تھا وہ ان اشعار کی تصحیح کرتے، اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ آغا صاحب خود بھی انقلابی شاعر تھے۔ ان کو ہنگاموں سے محبت تھی۔ سیمابی طبیعت تھی۔ انہیں ہر روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ درکار تھا۔ بقول غالب:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ان دنوں جو مشاعرے ہوتے تھے، ان میں انقلابی نظمیں پسند کی جاتی تھیں۔ غلامانہ زندگی کی گھٹن کو دور کرنے، مافی الضمیر کو بیان کرنے اور غیر ملکی تسلط کے خلاف آواز بلند کرنے میں ذہنی آسودگی میسر آتی تھی۔ مشاعروں میں ساحر کی نظمیں پسند کی جانے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مشاعرے کی صدارت خواجہ عبدالرحیم مرحوم کر رہے تھے جو اس وقت لدھیانہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ خواجہ عبدالرحیم علامہ اقبال کے صحبت یافتہ تھے۔ ان کی صدارت میں انتہائی باغیانہ نظمیں پڑھی گئیں۔ خیال تھا کہ ساحر اور آغا اعجاز اکرم یوسفی مشاعرہ ختم ہوتے ہی گرفتار کر لئے جائیں گے۔ مگر ڈپٹی کمشنر صاحب نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس سے انقلابی شعرا کے حوصلے اور بلند ہو گئے اور وہ کھلم کھلا انگریزوں کے خلاف، سامراج کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ساحر نے ایسے ماحول میں تربیت پائی کہ وہ لاوا جو اس کے اندر ہی اندر پک رہا تھا اس کو باہر نکلنے کے مواقع میسر آتے رہے۔ اس نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہہ کر اپنی نفرت کے جذبے کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ یہ اس کی شاعری کا مزاج بن گیا۔ یہی شاعری نوجوانوں میں مقبولیت کا باعث ہوئی۔

انہی دنوں میں کالج میں داخل ہو گیا۔ میں نے ینگ کرسچن ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ وہ اسکول مثالی اسکول تھا۔ جہاں طالب علم کی ہر طرح سے تربیت کی جاتی تھی۔ اس اسکول کی فضا دوسرے تعلیمی اداروں سے یکسر مختلف تھی۔ انگریز پرنسپل تھے۔ اسکول کے اساتذہ انتہائی مشفق تھے۔ مگر کالج کی فضا اسکول کی فضا سے مختلف ہوتی ہے۔ طالب علم کے اندر خود اعتمادی، برتری اور قدرے آزادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ وسیع اور کھلی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کالج میں داخل ہونے سے پہلے ساحر سے دوستی کے مراسم

استوار ہو چکے تھے۔ ساحر کے قرب اور رفاقت نے میری شاعری کا رخ بھی انقلابی شاعری کی طرف موڑ دیا۔ مخلوط تعلیم تھی، ہندو اور سکھ لڑکیاں ہماری ہمنوا تھیں۔ ان میں سے اکثر کانگریسی لیڈروں کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ خاندانی تربیت کی وجہ سے وہ انقلابی شاعری کی دلدادہ تھیں۔

لدھیانہ سیاست کا مرکز تھا۔ یہاں ملک گیر شہرت کے کانگریسی لیڈر تھے۔ جنہوں نے جدوجہد آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ گھریلو تربیت اور ماحول نے ان کو بھی غلامانہ زندگی سے متنفر کر دیا تھا۔ طلبا کا ایک گروہ ہمارے انقلابی محاذ کا رکن بن گیا۔ اس سے ہمارے انقلابی نظریے کو اور بھی تقویت ملی۔ کالج کی اسٹیج سے اہم اپنے نظریات کی ترجمانی کرنے لگے۔

ساحر کالج یونین کا صدر تھا۔ اس کے ہفتہ وار اجلاس میں باغیانہ نظمیں پڑھی جاتی تھیں، انقلابی تقریریں ہوتی تھیں۔ طلبا میں جوش و خروش بڑھتا گیا۔ غلام مرتضیٰ، فیض، علاالدین اختر کی تقریریں دلوں میں ہیجان پیدا کر دیتی تھیں، پروفیسر صاحب دانستہ ہمارے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتے۔ کالج کے پرنسپل جناب ہاروے، انگریز تھے، جو اردو بالکل نہیں جانتے تھے۔ ان کو بگڑے ہوئے ماحول کا بالکل اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ یونین کے اجلاس میں شرکت کرتے، انقلابی اشعار پر جب ہال تالیوں سے گونج اٹھتا تو وہ بھی تالیوں میں شریک ہو جاتے۔ تالیوں کے شور میں قہقہے بلند ہو جاتے۔ پرنسپل صاحب یہ جوش و ولولہ دیکھ کر چند منٹ کے بعد دفتر چلے جاتے۔

یونین کے علاوہ دوسری ادبی انجمن بزم ادب تھی۔ جس کا میں بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گیا تھا۔ وہ دوسرا انقلابی محاذ تھا۔ جب ان انجمنوں کا اجلاس ہوتا تو ہال کھچا کھچ بھر جاتا۔ طلبا ذوق و شوق اور ایک ولولہ تازہ لے کر اجلاس میں شرکت کرتے، لڑکیاں پیش پیش ہوتیں۔

چند پروفیسر صاحبان بھی شرکت کرتے۔ اس جوش و خروش کو دیکھ کر ان کی خاموشی ہمارے لئے خاموش داد ہوتی۔ وہ اس محاذ میں عملی طور پر حصہ نہ لے سکتے تھے۔ مگر ہماری جدوجہد کو ہمارے انقلابی نظریے کو ہماری پرجوش تقاریر اور نظموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ یہ ان کے خاموش تعاون کا نتیجہ تھا کہ کالج کی اندرونی فضا کی پرنسپل کو خبر نہ ہوئی....

پرنسپل ہاروے صاحب نے طلبا میں میوزک اینڈ ڈانس شو کے سلسلے میں ٹکٹ فروخت کئے۔ روپیہ امداد کے لئے اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ شہر میں بھی اس شو کا بہت پروپیگنڈہ کیا گیا۔ سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ضمیر فروشانِ قوم نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس محفلِ رقص و سرود کو کامیاب بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ہم نظریاتی طور پر اس کے خلاف تھے۔ چند نوجوان رفقائے کار سے مل کر ہم نے اس محفل رقص

وسرود کو ناکام بنانے کی مہم شروع کردی۔ طلبا کو ٹکٹ خریدنے سے روکا۔ طلبا اور طالبات نے بھرپور تعاون کیا۔ چند طلبا کے علاوہ طلبا کی اکثریت نے شو کا بائیکاٹ کردیا۔
شام کو کالج میں اس محفل رقص وسرود کا آغاز ہوا۔ ہم نے طلبا کو اکٹھا کرکے پرجوش تقاریر کیں۔ انہیں غیرت دلائی اور انگریزوں کے مظالم بیان کئے۔ انگریز نے ہمارے مغل بادشاہوں اور قومی رہنماؤں پر جو ظلم وستم توڑے تھے ان کو جوشیلے انداز میں بیان کیا۔ ہماری مہم کامیابی رہی۔ جب لڑکوں نے شرکت نہ کی تو ہاروے صاحب پر حقیقت واضح ہوگئی اور ان کو ہماری مہم کا علم ہوگیا۔ شہر کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ وقت کی نزاکت کے پیش نظر ہاروے صاحب نے کوئی قدم نہ اٹھایا جس سے فضا کے مزید بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

ساحر اور راقم الحروف نے ان لڑکیوں اور لڑکوں کے خلاف نظمیں لکھیں، جنہوں نے اس میں عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ ان شہریوں کے خلاف بھی آواز بلند کی، جنہوں نے سرکار کی خوشنودی کے لئے ضمیر کا سودا کیا تھا۔

ساحر نے معرکتہ الآرا نظم لکھی، جس کا عنوان ہی 'میوزک اینڈ ڈانس شو' تھا۔ ہنگامی نظم ہونے کے علاوہ یہ ادبی شہ پارہ تھا۔ اس نظم میں ماحول کی جس خوب صورتی سے عکاسی کی گئی تھی۔ وہ اپنی مثال آپ تھی۔ دوسرے ہفتے کے پروگرام میں ساحر نے یونین کے اجلاس میں اسے پڑھنا تھا۔ طلبا کا اشتیاق مثالی تھا۔ وہ بے تابی سے اس وقت کے منتظر تھے، جب ساحر اپنے مخصوص انداز میں نظم پڑھ کر ان کے جذبات ونظریات کی ترجمانی کرے۔ اس روز کا اجلاس تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ غلام مرتضیٰ نے انتہائی جوشیلی تقریر کی، ساحر نے یہ نظم پڑھی، ہاروے کو ایک ایک پل کی خبر تھی۔ اس نے اس اجلاس کی کارروائی کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے حکومت سے مدد لی تھی۔ سی آئی ڈی کے آدمی اس میں شریک تھے، جنہوں نے ڈپٹی کمشنر اور حکام بالا کو اس اجلاس کا ایک ایک لفظ پہنچایا... چالیس برس گزرنے کے بعد بھی یہ نظم میرے حافظے میں موجود ہے۔ ساحر کے جتنے دیوان شائع ہوئے ہیں، کسی میں یہ نظم نہیں۔ اس دور کے جدوجہد کی ایک تصویر دکھانے کے لئے اب نظم ہدیۂ قارئین ہے:

محفل رقص وسرود

شب مرے کالج کی وادی ایک کوہ طور تھی
حسن کی تابانیوں سے ہر روش پرنور تھی
منعقد تھی ہال میں اک محفلِ رقص وسرود
ہو رہا تھا نازنینانِ تمدن کا ورود
رخ پہ رقصاں مستیاں، لب گلفشاں، رفتار تیز

جلوے آوارہ، جبیں تاباں، نگاہیں بادہ ریز
قمقموں کی روشنی میں جھلملاتی ساڑھیاں
جیسے لہراتی ہوں دامانِ افق پر بجلیاں
آنچلوں کی سرسراہٹ سے فضا میں ارتعاش
گفتگو سے شیشۂ تقدیسِ مشرق پاش پاش
آ رہی تھیں نازک اندامی سے بل کھاتی ہوئیں
ہر روش پر برق کی مانند لہراتی ہوئیں
لگ رہی تھیں چار سو تانگوں کی اور کاروں کی بھیڑ
مغربی طرزِ تمدن کے پرستاوں کے بھیڑ
ٹولیاں باندھے چلے آتے تھے بے فکرے جواں
ہو رہا تھا بزم کالج پر تھیٹر کا گماں
لوگ آئے تھے، نشاطِ دل کا ساماں دیکھنے
مرکزِ تعلیم و فن میں رقصِ خوباں دیکھنے
تالیوں سے گونج اٹھتی تھی فضا ہر تال پر
وجد آگیں کیفیت طاری تھی سارے ہال پر
وائلن لے لے کے نکلی تھیں وطن کی بیٹیاں
ناز سے گاتی ہجوم مرد و زن کے درمیاں
جن کے آبا کٹ مرے قوموں کی عزت کے لئے
ناچتی ہیں بیٹیاں ان کی حکومت کے لئے
خوش ہوا اے برطانیہ کے حاکم ذی احتشام
تیرے ہاتھوں میں ہے مشرق کے تمدن کی لگام
خوش ہوا اے چرچل کہ اب اس سرزمیں کے نونہال
کھو چکے ہیں صف شکن اسلاف کا جاہ و جلال
لٹ کے بھی یہ ناچتے اور گیت گاتے جائیں گے
ظلم سہہ کر عافیت کی تان اڑاتے جائیں گے

راقم الحروف نے بھی باغیانہ نظم لکھی اور اسی اجلاس میں پڑھی۔ ان نظموں کے علاوہ ہمارے ساتھیوں نے انگریز کے خلاف حکومت کے حاشیہ برداروں کے خلاف چند مفاد پرستوں کے خلاف اور بے ضمیر لوگوں کے خلاف تقریریں کیں۔ انگریزوں کے خلاف چنگاری نے لاوے کی صورت اختیار کرلی۔ پورے شہر میں اس اجلاس کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ طلبا کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ ہمیں ہیرو سمجھنے لگے تھے، گویا کہ ہم نے ان کے گنگ جذبات کو زبان عطا کردی اور برسوں سے پیٹ میں پلنے والی آگ کو باہر نکال دیا ہے۔ ہمیں نتیجے کی پروانہ تھی، ہمارا ضمیر مطمئن تھا کہ ہم نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا... اجلاس کی کارروائی سی آئی ڈی کے ذریعے ڈپٹی کمشنر تک پہنچ چکی تھی۔ بہی خوانِ حکومت اور غلامانِ قدیم نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ ہمارے خلاف کارروائی کی جائے اور کالج کی فضا کو درست کیا جائے ورنہ کسی بڑے ہنگامے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔

پرنسپل صاحب معاملے کی تہہ کو پہنچ چکے تھے۔ ڈپٹی کمشنر نے پرنسپل صاحب کو خط لکھا کہ ساحر کو کالج سے نکال دیا جائے تاکہ ان کے خلاف ڈفنس انڈیا ایکٹ کے تحت کارروائی کی جاسکے۔ ہر چند یہ سب کچھ صیغہ راز میں رکھا گیا، مگر کسی نہ کسی طرح طلبا کو اس اقدام کی خبر ہوگئی اور خط کی واضح ہوگئی۔ طلبا میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی، وہ ہمیں قدم قدم پر روک کر عملی تعاون کا یقین دلاتے۔ اکثر لڑکے اور لڑکیوں نے تحریری طور پر پرنسپل صاحب کو کہہ دیا کہ اگر حافظ صاحب اور ساحر کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تو اس کے نتائج کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ کلاسز کا بائیکاٹ کردیا گیا۔ انقلاب متشکل ہوکر سامنے آگیا۔ پرنسپل صاحب کے لئے حالات کی تشویشناک تھے۔ وہ کسی اقدام سے قصداً گریز کررہے تھے۔ ہاروے صاحب کو طلباء سے انتہائی محبت تھی وہ کسی طور پر اپنے ہاتھوں لگائی ہوئی پھلوں کی کیاری کر برباد ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کو کئی بار سرکاری اعلیٰ عہدے کی پیشکش ہوئی۔ مگر انہوں نے مسترد کردی۔ ان کو لاج کی فضا سے، طالب علموں سے، اس تعلیمی ادارے سے عشق تھا۔ انہوں نے کالج کے معیار کو بلند کیا، پنجاب میں گورنمنٹ کالج لاہور کے بعد لدھیانہ گورنمنٹ کالج طلبا کی توجہ کا مرکز تھا۔ یہ تعلیمی ادارہ ان کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ ایسے شخص کے لئے یہ فضا انتہائی تکلیف دہ تھی۔ دو ہفتے کالج بند رہا، لڑکے کالج آتے، مگر کلاسز میں نہ جاتے۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے، آئندہ کے لئے لائحہ عمل مرتب کرتے اور پرنسپل صاحب کے حکم کے منتظر رہتے کہ اس کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ انہیں کیا کرنا ہے...

چند روز بعد ہاروے صاحب نے مجھے اور ساحر کو بلایا۔ ڈی سی صاحب کے خط کا متن پڑھ کر سنایا، جس کا ہمیں پہلے ہی علم ہوچکا تھا۔ پرنسپل صاحب کا انداز مشفقانہ تھا۔ دفتر کے باہر طلبا کا ہجوم تھا۔ پرنسپل

صاحب نے ہمیں نہ سرزنش کی تھی نہ ہی کسی کارروائی کا اعلان کیا، اتنا کہا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ مجھے حکومت ایک ایک لمحے سے آگاہ کرتی رہی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود میں اپنے کسی طلب علم کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں ان کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں، میں اپنی اولاد کے خلاف کیسے کارروائی کرسکتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ محبت اور پیار نے مجسم صورت اختیار کرلی۔ کچھ دیر خاموش رہے، ہم سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی محبت نے ہمیں جیت لیا تھا۔ فرمایا کہ امید ہے آئندہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھاؤ گے، جس سے کالج کی بدنامی ہو، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے اور مجھے آپ کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

ہم نے لڑکوں کو ساری گفتگو سے آگاہ کیا۔ ہمارے دلوں میں پرنسپل صاحب کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی...اور اس طرح یہ معاملہ ختم ہوگیا...

ساحر فطرتاً کمزور انسان تھا۔ لہجے کی تلخی، الفاظ کی بلند آہنگی، صوتی طنطنے کی باوجود بہادر انسان نہ تھا۔ وہ دیوار کے پیچھے چیخ و پکار سکتا تھا۔ مگر میدان عمل میں ایثار و قربانی کا متحمل نہ ہوسکتا تھا۔ جس شدت سے وہ ماحول کے خلاف آواز بلند کرتا تھا۔ محبت میں بھی وہ انتہائی شدت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ کالج میں اس نے کئی معاشقے کئے۔ مگر جذباتی ہونے کی وجہ سے ہر رومان چند دنوں کا کھیل ثابت ہوا۔ ہر معاشقے کے آغاز میں ہم نے محسوس کیا کہ ساحر کا یہ آخری معاشقہ ہے۔ شاید اس معاشقے کے ناکام ہونے کی صورت میں وہ زندہ نہ رہے گا۔ اس کی اشک آلود آنکھیں، اس کی بے خوابی، اس کے اضطراب اور بے کلی سے ہم یہ اندازہ لگاتے کہ ساحر اس معاشقے میں جذب ہوکر رہ گیا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ معاشقے کا شدید اثر لئے ہوتا۔ مگر ہر بار ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوتا...

میں ایف اے کا طلب علم تھا۔ ساحر سے شب و روز کی رفاقت تھی۔ مجھے ساحر کو قریب سے دیکھنے، اس کی افتاد طبع کا مشاہدہ کرنے، اس کے معاشقوں کی تفصیل سے آگاہ ہونے، اس کے مزاج کے تلون کو دیکھنے، اس کی شاعری، اس کی زندگی، اس کے نظریات کو سمجھنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ بہت کم دوست ساحر کو اتنا قریب سے دیکھ سکے ہیں۔ اگر ان تمام معاشقوں، ان تمام واقعات و حادثات، ان شب و روز کا تفصیل سے ذکر کروں تو ایک ضخیم رومانی ناول مرتب ہوسکتا ہے۔ اس کی شاعری کا پس منظر سمجھنے کے لئے، اس کی نظموں سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے، چند ایک معاشقوں کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ ان معاشقوں سے، ان واقعات سے ساحر کی انقلابی اور رومانی شاعری کے خد و خال سمجھ میں آسکیں گے اور ساحر ادب کی جن منزلوں سے گزرا ہے، ان کے نقوش، ان کے سنگ میل سے قاری آگاہ ہوسکے گا۔

لدھیانہ کے سرکردہ و سربرآوردہ کانگریسی لیڈر تلک رام چودھری تھے، پیشہ وکالت تھا۔ کانگریس کے معزز اور باوقار لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی بیٹی پریم چودھری کالج کی طالبہ اور میری ہم جماعت تھی۔ گھریلو ماحول اور خاندانی تربیت نے اس کے دل میں سامراج کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مگر وہ کھل کر اس جذبے کا اظہار کرنے کی قدرت نہ رکھتی تھی۔ اس اشتراکِ احساس اور نظریے کی ہم آہنگی نے اسے ساحر کے قریب کر دیا۔ ساحر کی شخصیت اور شاعری سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ ساحر کا انقلابی نعرہ اس کے دل کی آواز، اس کی روح کی پکار اور اس کے جذبات کا ترجمان تھا...

پریم چودھری کوئی سرو قامت اور حسین لڑکی نہ تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایسی کشش، ایسی جاذبیت تھی جس سے کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلے ہوئے کنول کی طرح تھیں۔ اس میں سحر کے تمام انداز موجود تھے۔ وہ آنکھیں ہم کلام ہوتیں اور زندگی کی تہوں میں جھانکتی نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھوں کو حسین سے حسین شے سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کی آنکھیں کنول سے زیادہ روشن اور جھیل سے زیادہ گہری تھیں۔ اس کی مسحور کن آنکھیں ایک سحر آلود نغمہ تھیں، ایک آواز تھی، محبت کا پیغام زندگی کا حسن اور جاذبیت کا عجیب و غریب مرقع تھیں۔

ساحر کی شاعری شعور کی حدوں کو چھو چکی تھی۔ جہاں ادراک رہنمائی کرتا ہے، شعور راستہ دکھاتا ہے، فکر و خیال کو روشنی ملتی ہے۔ انہی دنوں ساحر نے کالج یونین کے اجلاس اور بزم ادب میں انقلابی نظمیں سنائیں اور کالج کے طلبا میں انتہائی مقبول ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا، جب ساحر نے کھل کر اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ماحول کی زنجیروں سے آزاد ہو گیا ہے۔ اسے اپنے نظریات کو بیان کرنے کے لئے پلیٹ فارم مل گیا تھا۔ اس کو جذبات کے اظہار کے لئے راستہ مل گیا تھا۔ ان نظموں پر اسے خوب داد ملی۔ اس کو کالج میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ان مداحوں میں پریم چودھری بھی تھی۔ اگر کسی فنکار کے فن کو سراہا جائے تو اس میں خود اعتمادی، حوصلہ اور فکر کی بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے فن کو عروج نصیب ہوتا ہے۔

پریم چودھری کے دل میں ساحر کا بے پناہ احترام پیدا ہو گیا۔ اس کی شخصیت، اس کے خوابوں کی تعبیر، اس کے جذبات کی تفسیر، اس کے نظریات کی وضاحت، اس کی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی سوچ، اس کے فکر میں ایک ایسی شخصیت شریک ہو گئی ہے جس کے اشعار، جس کے خیالات، جس کے نظریات کی وہ ترجمان ہے۔ نظریاتی ہم آہنگی، فکری مطابقت اور ہم خیالی اسے ساحر کے قریب لے آئی۔ ساحر اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جذب ہو جاتا۔ اس کی روح کی تشنگی بڑھتی گئی۔ وہ ہر وقت ہر لمحے پریم چودھری کی رفاقت چاہتا تھا، تاکہ انقلابی نغمے تخلیق کر سکے، اس کا قرب اس کو حوصلہ دے۔ وہ سہارا چاہتا تھا۔ مگر یہ بات ممکن نہ

تھی... پریم چودھری کے قرب کا ہر لمحہ ساحر کے زخموں کا مرہم، اس کی تسکین روح کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ ہر لمحہ پریم چودھری کی یاد کو سینے سے لگائے رکھتا۔

ساحر سے دن رات کی رفاقت تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ساحر اور میں بے مقصد گھوم رہے تھے۔ ہم چلتے چلتے پریم چودھری کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ ساحر گلی کے نکڑ پر ٹھہر گیا۔ جیسے کوئی درماندہ مسافر منزل پر پہنچ کر آسودہ ہو جاتا ہے۔ وہ دیر تک پریم چودھری کے گھر کی طرف تکتا رہا۔ پریم چودھری کسی کام کے لئے مکان کی چھت پر آئی اور چند لمحے بعد واپس چلی گئی، اس کو ساحر کی موجودگی کا کوئی علم نہ تھا۔ ساحر کے لئے پریم چند چودھری کی ایک جھلک زندگی کی ایک لہر تھی۔ ساحر خاموش چلتا رہا۔ آخر اس نے مہر سکوت توڑی اور قطعہ سنایا:

سامنے اک مکان کی چھت پر
منتظر ہے کسی کی اک لڑکی
مجھ کو اس سے نہیں تعلق کچھ
پھر بھی سینے میں آگ سی بھڑکی

میں نے ازراہ مذاق کہا ساحر تو پاگل ہو گیا ہے۔

پریم چودھری ہنس مکھ، خلیق، مؤدب اور دلکش شخصیت کی مالکہ تھی۔ ہر طالب علم اس کے اخلاق، حسن کردار کی وجہ سے اس کا احترام کرتا تھا۔ میری ہم جماعت ہونے کی وجہ سے اس سے اکثر گفتگو رہتی۔ میری اور ساحر کی نظموں کے کئی اشعار اسے یاد تھے۔ اکثر کہا کرتی تھی کہ پرماتما نے آپ کو شاعری کا جوہر دے کر کتنا بڑا کرم کیا ہے۔ آپ کو مافی الضمیر بیان کرنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ ہماری زبان ہیں۔ جو ہمارے دل میں ہوتا ہے آپ وہ الفاظ میں ادا کر کے ہماری گھٹن دور کرتے ہیں۔ وہ بڑی سادگی سے کہتی آپ کتنے خوش نصیب ہیں۔ پریم چودھری ساحر کے قریب ہوتی گئی۔ اگر پریم چودھری ایک دو روز کالج نہ آتی تو ساحر بے کل رہتا۔ کبھی کبھی اکیلا بیٹھ کر رونے لگتا۔ اس کی باتیں کر کے دل بہلاتا۔

ایف اے کے سالانہ امتحانات قریب تھے۔ میں کالج میں دیر تک امتحان کی تیاری کرتا رہا شام کو دیر سے کالج سے لوٹا۔ ساحر کا مکان راستے میں تھا۔ میں نے ساحر سے چائے کی فرمائش کی، میں بہت تھکا ہوا تھا۔ ساحر کی والدہ ساحر کے دوستوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتی۔ جب کوئی دوست آتا تو پر تکلف چائے بھجواتی۔ ساحر کے گھر دن میں کئی کئی مرتبہ چائے کا دور چلتا۔ ساحر کے دوستوں کی خاطر تواضع سے اس کی والدہ کو روحانی مسرت ہوتی۔ وہ چند لمحے اپنی زندگی کے سارے دکھ بھول جاتی۔ اس روز ساحر بجھا بجھا سا تھا۔ اس کے چہرے کی اداسی کسی گہرے صدمے کی غماز تھی۔ اس کے چہرے پر محرومی کے اثرات تو بارہا دیکھے تھے۔ مگر شکستگی

کے آثار پہلی بار نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی عظیم حادثے نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔
چائے میز پر رکھی گئی۔ حسب معلوم پر تکلف چائے تھی، مٹھائی، پھل اور گھر کی تیار کی ہوئی چیزیں موجود تھیں۔ میں دن بھر کا بھوکا تھا۔ اشتہا نے ضعف کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دو چار اور دوست بھی موجود تھے۔ وہ بھی ساحر کی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ ساحر مسکراتے ہوئے لبوں سے احباب کا استقبال کیا کرتا تھا۔ مگر آج وہ خاموش کسی گہری سوچ میں تھا۔ وہ اپنا دکھ بانٹنا چاہتا تھا۔ وہ کسی سے اچانک رونما ہونے والے صدمے کا ذکر کر کے اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ وہ طوفان کو روکے ہوئے تھا جو اس کی روح کو متلاطم کئے ہوئے تھا۔ ساحر زیادہ دیر ضبط نہ کر سکا۔ مجھے اشارے سے ملحقہ کمرے میں آنے کو کہا۔ ساحر مجھ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ساحر کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا۔ وہ طوفان جو وہ اتنی دیر سے روکے ہوئے تھا، پھوٹ بہا۔ ساحر کی خوب صورت آنکھوں سے اشک اس طرح بہنے لگے جس طرح بارش کے قطرے گرتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے غم کا آبشار جاری ہو گیا۔ آنسوؤں کی قطاریں اس کے چہرے پر کسی ناگہانی حادثے کا عنوان بن گئیں۔ ساحر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "پریم چودھری مر گئی۔"

میں یہ غیر متوقع خبر سن کر ششدر رہ گیا... یک بیک پریم چودھری کا شگفتہ چہرہ، سحر آلود آنکھیں، خوب صورت فقرے، ادب و احترام کے ان گنت نقوش آنکھوں کے سامنے تابندہ ہو گئے... پریم چودھری تو شگفتگی اور زندگی کی علامت تھی وہ کیسے مر گئی۔ میں حیران و پریشان ساحر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساحر مجھ سے لپٹ کر روتا رہا۔ اس کی ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یقین نہ آتا تھا، دوبارہ میں نے ساحر سے پوچھا، کیا واقعی پریم چودھری مر گئی۔ میرے استفسار پر وہ بے جان بت کی طرح مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ بہار کے پہلے پھول کو بے دردی سے شاخ سے نوچ لیا گیا ہے...

پریم چودھری کچھ مدت سے بیمار تھی، رفتہ رفتہ بیماری طول پکڑ گئی۔ اس کے والدین نے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر باوجود اعلیٰ طبی سہولتوں کے وہ موت کے چنگل سے نہ نکل سکی۔ اسے تپ دق ہو گئی تھی۔ آخر وہ چلتا پھرتا حسین پیکر، ہنستا بولتا شاداب پیکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ آنکھیں جو شاعر کو نئے نئے عنوانات سجھاتی تھیں، وہ آواز جو نغمہ بن کر روح میں اتر جاتی تھی، وہ محبت کی نشانی، وہ خُلق کا پیکر، وہ ہر دل عزیز لڑکی، وہ موہنی صورت، موت کی تاریک وادیوں میں اتر گئی جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا...

چائے دھری کی دھری رہ گئی۔ ساحر نے انتہائی ملتجیانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا مجھے کہیں سے پریم چودھری کی تصویر مہیا کر دو۔ حافظ میں عمر بھر تمہارا احسان نہ بھولوں گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس وقت ساحر کو پریم چودھری کی تصویر نہ ملی تو وہ صدمے سے پاگل ہو جائے

گا۔حافظ تم نے ہر محاذ پر میرا ساتھ دیا ہے۔آج مجھ پر یہ احسان بھی کر دو۔خدا جانے وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کیا کچھ کہتا رہا۔اس کے بے ربط جملے،اس کے ہونٹوں میں ٹوٹے ہوئے الفاظ،اس کی اداس اور اشک بار آنکھیں اس کے گہرے غم کی غماز تھیں۔

پریم چودھری کی ایک سہیلی شیلا تھی۔میری ہم جماعت ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ عزت واحترام سے ملتی۔اس نے مجھے کئی دفعہ اپنے گھر آنے کے لئے کہا تھا۔وہ اپنے والدین سے میری نظموں کا تذکرہ کرتی تھی۔میں ساحر کے ساتھ شیلا کے گھر کی طرف چل پڑا۔شیلا کا گھر کافی دور تھا۔ہم راستے میں خاموش رہے۔بار بار ذہن میں پریم چودھری کا خیال آتا تھا۔اس کے والدین پر قیامت ٹوٹ گئی ہوگی۔اس کی چھوٹی بہن پر اس صدمے سے کیا بیتی ہوگی۔نجانے کون کون سے خیال ذہن کو گھیرے رہے۔

میں نے شیلا کو آواز دی۔اس نے دروازے پر آتے ہی پریم چودھری کی وفات کی خبر سنائی۔وہ پریم چودھری کے گھر جا رہی تھی۔شیلا کا گھر پریم چودھری کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔وہ پریم چودھری کی بیماری کے دوران کئی بار پریم چودھری کے گھر گئی۔پریم چودھری اس سے کالج کی باتیں دریافت کرتی۔یونین کے اجلاس کے بارے میں پوچھتی۔ساحر کی تازہ نظم کے متعلق پوچھتی۔شیلا سے کہتی کہ میری ایک حسرت ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار کالج جاؤں۔ہم جماعتوں سے ملوں،ان فضاؤں کو دیکھوں،جس میں ساحر کے انقلابی نغمے بکھرے ہوئے ہیں۔وہ ایک ایک ہم جماعت کا پوچھتی...پھر اس کی خوب صورت آنکھوں سے جھرنے کی طرح اشک بہنے لگتے۔شیلا بھی اس کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگتی۔شیلا راستے میں پریم چودھری کی باتیں کرتی رہی۔

پریم چودھری اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو چکی تھی۔اس کی خوبصورت آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔بیماری نے اس کو معذور کر دیا تھا۔اس کو اپنے انجام کی خبر تھی۔وہ آنکھیں بند کئے کالج کے ایک ایک دن کا نقشہ سامنے لاتی۔یہی یادیں اس کا سہارا تھیں۔

میں نے شیلا کو پریم چودھری کی تصویر لانے کے لئے کہا،اس نے ساحر کی طرف دیکھا،جو سراپا التجا تھا۔ہزار ضبط کے باوجود پھر ساحر کی پلکیں بھیگ گئیں۔شیلا کو ساحر کی حالت پر ترس آگیا۔اس نے تصویر مہیا کرنے کی حامی بھر لی۔شیلا پریم چودھری کے گھر چلی گئی۔

ہم باہر کھلے میدان میں شیلا کا انتظار کرنے لگے۔ساحر بار بار پریم چودھری کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔جہاں اس کی محبت کا سورج غروب ہو چکا تھا۔شام کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ہر طرف مہلک سیاہی چھا گئی،ساری فضا ماتمی معلوم ہوئی اور ساحر اس ماتم کدے میں اکیلا بت بنا ہوا تھا۔جو اپنے آنسوؤں کا

آخری قطرہ بہا چکا ہو اور بے جان ہو چکا ہو۔
کافی دیر کے بعد شیلا باہر آئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ پریم چودھری کی لاش دیکھ کر آئی تھی۔ وہ صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس میں بات کرنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ خدا جانے اس نے کس طرح پریم چودھری کی تصویر حاصل کر لی۔ اس نے پریم چودھری کی چھوٹی سی تصویر ساحر کے ہاتھ میں دی اور خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

ساحر نے ممنون نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ بار بار تصویر دیکھ رہا تھا۔ چودھری پھر اس سے ہم کلام ہوگئی ہو۔ وہ خدا جانے تصویر سے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ میں ساحر کو راستے میں چھوڑ کر گھر لوٹ آیا۔
دوسرے روز ساحر سے ملاقات ہوئی۔ صدمے کی شدت کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ ساحر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہنے لگا میں لاہور کے کسی اعلیٰ فوٹو گرافر سے پریم چودھری کی تصویر بڑی کرواؤں گا، نہایت قیمتی فریم میں اسے سجاؤں گا، میں اسے سامنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کروں گا۔ چودھری ہر وقت ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہے گی، وہ مجھ سے باتیں کیا کرے گی، اس کی خوب صورت آنکھیں میری شاعری کے عنوانات بن جائیں گی۔ میں اپنی ہر تازہ نظم سب سے پہلے اسے ہی سناؤں گا۔ وہ میری انقلابی نظم سن کر کتنا خوش ہوگی، وہ میرے خیالات، میرے افکار میری شاعری زندہ رہے گی۔ ساحر جذبات میں بہتا گیا۔ خدا جانے وہ کیا کچھ کہتا رہا۔ میں اس کی افتادِ طبع سے تھک چکا تھا۔ اس کے اس سے پہلے کے معاشقوں کا انجام میرے سامنے تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ جذبہ وقتی ہے۔ یہ تاثرات، یہ جذبات ایک دو روز کے مہمان ہیں۔
شام کو ساحر سے ملاقات ہوئی، وہ لاہور نہیں گیا تھا۔ چند دن اور گزر گئے۔ پریم چودھری کا تصور ساحر کے ذہن میں عود کر چکا تھا۔ اس کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ وہ اسی طرح بالوں کی خوب صورتی اعلیٰ لباس پہنے، سگریٹ سلگائے اس طرح نظر آیا، جیسے وہ کسی حادثے سے دوچار ہوا ہی نہ تھا۔

اس رومانس نے ساحر کے دیوان میں ایک نئی نظم کا اضافہ کیا۔ وہ شمشان گیا اس نے پریم چودھری کو منوں لکڑیوں کے نیچے جلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے اعضا کو آگ کھا رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آگ کی چنگاری کی نذر ہوگئیں، چند ساعتوں میں یہ خوب صورت پیکر، ہنستا بولتا، پیکر راکھ بن کر رہا گیا۔ اس کے وجود کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ ساحر نے شمشان سے واپس آ کر نظم لکھی، جس کا عنوان تھا 'مرگھٹ کی سرزمین' پہلے ایڈیشن کے بعد یہ نظم دوسرے ایڈیشنوں سے نکال لی گئی۔ اس نظم میں جذبے کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ اس نے اندوہناک منظر کا نقشہ اس نظم میں کھینچا۔ جو شاعر کے تصورات کا مرکز تھیں، جو خاموش رہ کر بھی ہم کلام رہتی تھیں۔ وہ محبت کا پیکر تھا، شاعر کا خواب، تمناؤں کا مرکز، آرزو کا گلستان گھڑی بھر میں جل کر راکھ ہوگیا۔

چند دنوں کے بعد پریم چودھری کا خیال بھی ساحر کے دل و دماغ سے نکل گیا۔ وہ کسی دوسری نظم کا عنوان تلاش کرنے لگا، جو اس کے دیوان میں ایک اور خوبصورت نظم کا اضافہ کرے۔

میں نے ابتدا میں تحریر کیا ہے کہ ساحر انتہائی جذباتی انسان تھا، اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہ تھا۔ اس کے جذبات، اس کے احساسات وقتی ہوتے تھے۔ وہ اتنی شدت سے کسی واقعے سے متاثر ہوتا تھا کہ احباب اور اس کے ساتھی حیران رہ جاتے تھے۔ دوست ہر بار دھوکہ کھا جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ساحر کا یہ آخری رومان ہے۔ اس کے ناکام ہونے کی صورت میں ساحر زندہ نہ بچے گا۔ مگر ہر بار ساحر کا رومان اسٹیج کا کھیل ثابت ہوتا۔ جیسے ایکٹر اپنا کردار ادا کرنے کے بعد اپنے مکالمے بھول جاتا ہے۔ اسی طرح ساحر نظم لکھنے کے بعد معاشقے کی کیفیات کو یکسر فراموش کر دیتا تھا۔ ساحر نظم تحریر کر کے شاید یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کر چکا ہے۔

ساحر کے دیوان کی ہر نظم کسی حادثے، کسی رومان، یا کسی واقعے کا نتیجہ ہے۔ مجھے ساحر کی ہر نظم کے پس منظر کا علم ہے۔ ان نظموں میں ساحر کے معاشقے، اس کے نظریات، اس کی ماحول سے بغاوت، اس کی محرومیاں، اس کے جذباتی ہونے کے نقوش ملتے ہیں۔ ساحر کی زندگی پر سیکڑوں صفحات کی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر طوالت کے خوف سے چند ایک واقعات کا پس منظر، چند ایک معاشقوں کے نقوش پیش کر رہا ہوں، جن سے ساحر کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آجائیں گے۔

ساحر کا والد جاگیر دار تھا۔ لدھیانے کے مضافات میں اس کی زمین تھی۔ ساحر کی والدہ سے اس کے تعلقات کشیدہ رہتے تھے۔ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ ان حالات کے باوجود ساحر ہمیشہ خوش حال رہا۔ اس کو کبھی عسرت و تنگدستی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس کی والدہ اس کی ہر آرزو پوری کرتی۔ اس نے آسودہ زندگی بسر کی۔

ساحر کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت تھی۔ چہرے پر خفیف سے چیچک کے نشان تھے۔ لمبی ناک، باریک دانت، گھنے بال ساحر کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں، جو اس کے چہرے کا حسن بن گئی تھیں۔ آنکھوں پر دراز پلکیں تھیں، جیسے کسی خاموش گہری جھیل پر پتلی شاخیں سایہ کئے ہوئے ہوں۔ اس کی آنکھیں، اس کی محبت کی ترجمان بن جاتی تھیں۔ ساحر کی پرکشش شخصیت کا نقطہ جمال اس کی آنکھیں تھیں۔ مخروطی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھی تھی، لہجے میں نرمی، گفتگو میں محبت اور پیار کے انداز تھے، جس سے کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

ساحر کی رہائش بالا خانے پر تھی۔ نیچے چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں کوئلہ چننے والی رہتی تھیں۔ کچھ مزدور پیشہ لوگ تھے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنی ماؤں کے ساتھ ننگے پاؤں ریلوے لائن کے ارد گرد گرے ہوئے

کوئلے چننے جاتیں، دھوپ کی تیزی اور مشقت سے ان کے جسم بھی کوئلے کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ دن بھر وہ انجن سے گرے ہوئے کوئلے اکٹھا کرتیں۔ ان کے چہرے پر مٹی کی تہیں جم جاتیں، ان کے پھیلے ہوئے لباس سے ان کے جسموں کی غلاظت پھوٹ بہتی۔ وہ میلے بدبودار کپڑوں میں کوئلہ اکٹھا کر کے دکانداروں کے پاس فروخت کر کے شکم پری کا سامان مہیا کرتیں۔ یہ غربت کے پیکر، افلاس کی تصویریں، مظلومیت کے زندہ نشان ساحر کی شاعری کے موضوعات تھے۔ جاگیردار اور ہر کمیونسٹ کی طرح ساحر بھی انسانیت کے گیت گاتا، دکھی انسانیت پر نظمیں لکھتا، ان کی محرومیوں کا رونا روتا۔ مگر اس کی ہمدری الفاظ کی خالی جھولیوں سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اس کو کبھی ان کے دکھ کے مداوا کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ کمیونسٹ متمول گھرانے کا فرد ہوتا ہے۔ بنگلے اور کار کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، زندگی کے تمام سامانِ تعیش اس کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ناداروں، غریبوں، کسانوں، بے بسوں کا نمائندہ بن کر خود کو انسانیت کا علمبردار قرار دیتا ہے۔ اس کے بیانات دکھی انسانیت کی تمام ہمدردیاں سمیٹے ہوتے ہیں، مگر اس کا اپنا عمل، اس کا کردار اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ساحر بھی قیمتی سوٹ پہنے، پیسوں سے جیبیں بھرے، سگریٹ سلگائے اک نگاہ غلط انداز ان پر ڈالتا، اور دوستوں کے قہقہوں میں تفریح کے لئے نکل جاتا۔ ساحر کی نظم 'صبح نوروز' اسی ماحول کی پیداوار ہے۔ اس نے یہ نظم ایک واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی۔ تاریکی کے گناہ کو اس سورج کی روشنی میں دکھانا چاہا، اس نظم میں ایمائیت کا حسن داستان سمیٹے ہوئے ہے۔

صبح نوروز

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقان کی بیٹی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سال نو کے
بھوکے، زرد، گداگر بچے
کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں
پیپ بھری آنکھیں سہلاتے

وقت سے پہلے جاگ اٹھے ہیں
سر کے پھوڑوں کو کھجلاتے
وہ دیکھو کچھ اور بھی نکلے
جشن مناؤ سال نو کے

پریم چودھری کی وفات کے بعد کالج میں ساحر کے دوسرے معاشقے کے چرچے ہونے لگے۔ ساحر کسی حسین وجود کو تصورات میں آباد رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ گیت بُن سکے، نظمیں لکھ سکے۔ ساحر اکیلا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ تنہائی اس کے افکار کی موت، اس کے خیالات کی صلیب تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے خود کو اس صلیب پر لٹکانا گوارا نہ کرتا تھا۔ اسی لئے اس نے پریم چودھری کی موت کے چند دن بعد ایک اور معاشقے کی ابتدا کردی تاکہ اس کے خیالات شاداب رہیں، اس کے افکار کی نمو باقی رہے اور اپنی تخلیق کو پیکر جمیل دے سکے۔

ایشور کور دبلی پتلی، تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔ خدوخال کے اعتبار سے وہ نقش چغتائی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم کے دل آویز خطوط چغتائی کے موقلم کا شاہکار نظر آتے تھے۔ اس کی نیم باز آنکھیں، اس کا نرم ونازک پیکر، اس کی خود میں سمٹ جانے کی ادا ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ اس کی معصومیت، اس کی خاموشی نے اس کے اردگرد ایک طلسماتی ہالہ بن رکھا تھا۔ ایشور کور کو دیکھ کر دن کے اجالے میں حسین خواب کا تصور پیدا ہوتا تھا۔ وہ کالج کی دوسری لڑکیوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کا مزاج، اس کی چال، اس کی گفتگو، اس کا ہر انداز شعر کی خوب صورت شکل تھا۔ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ جیسے اسے اپنے وجود میں ہی کسی اور وجود کی تلاش ہو...وہ دوسری لڑکیوں سے ہر اعتبار سے مختلف تھی۔

ایشور کور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ہوسٹل کالج کے بالکل قریب تھا۔ لڑکیاں پیدل کالج تک آسانی سے آسکتی تھیں۔ ایشور کور جب ہوسٹل سے کالج آتی تو ساحر کی نظریں ہر قدم اس کا تعاقب کرتیں اسے وہ نغمے کی ایک لہر معلوم ہوتی جو الفاظ سے بے نیاز تھا۔ ساحر گفتگو کا بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ ہوسٹل کی ایک لڑکی نے ساحر کو بتایا کہ ایشور کور کو قدرت نے آواز کا سحر عطا کیا ہے۔ ہوسٹل کی لڑکیاں اس سے گانے کی فرمائش کرتیں۔ مگر وہ بہت کم گاتی تھی۔ جب وہ گاتی تو ایسے معلوم ہوتا کہ اس کی آواز کا سحر دل کے تاروں کو ہلا رہا ہے۔ لڑکیاں دم بخود ہو جاتیں۔ سب اس مادی دنیا سے نکل کر نغمے کی لطیف و پاکیزہ دنیا میں آباد ہو جاتیں۔

ساحر کو موضوع گفتگو مل گیا۔ ساحر کے ذہن سے پرانے معاشقے گرد کی طرح جھڑ چکے تھے۔ ایک دن ساحر نے اسے راستے میں روک کر یونین کے اجلاس میں شرکت کے لئے کہا۔ اس غیر متوقع سوال پر اس کے وجود میں حیا کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ تو خود سے بھی شرمائے رہتی تھی۔ کالج کے اتنے بڑے مجمع کے سامنے وہ

کیسے کچھ کہہ سکتی تھی۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ ساحر کلام کو طول دینا چاہتا تھا۔ ساحر خدا جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے خاموش کھڑی رہی... آخر وہ کچھ جواب دیئے بغیر ہوسٹل کی طرف چل دی۔ پسینے سے اس کا جسم شرابور ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکا اس سے ہم کلام ہوا تھا۔ ایشور کور سے ساحر کی ملاقات حادثے سے کم نہ تھی۔ ہوسٹل کی چند لڑکیوں نے اسے ساحر سے گفتگو کرتے دیکھ لیا۔ ان کو ساحر کے پرانے رومانوں کا علم تھا۔ کالج کی زندگی میں بات کو پر لگ جاتے ہیں۔ ساحر کی چند منٹ ملاقات نے اس کے ذہن میں حشر بپا کر دیا تھا۔ لڑکیوں کو موضوع مل گیا۔ ایشور کور اور ساحر کے بارے میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ چند روز بعد ساحر نے پھر ایشور کور کو یونین کے اجلاس میں گیت سنانے کی فرمائش کی۔ جب وہ ہوسٹل گئی تو لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ ساحر سے گفتگو کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ ایشور کور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کی رسوائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کو ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی جھیل کے صاف وشفاف پانی میں پتھر پھینک کر اس کے سکون کو تباہ کر دے۔ وہ لڑکیوں سے علیحدہ رہنے لگی، اور کالج کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔

ساحر کسی نہ کسی بہانے اسے ملتا۔ ساحر کی جاذب شخصیت اور شدت جذبہ نے اسے ساحر کے قریب کر دیا۔ ملاقاتیں طول پکڑ گئیں۔ ایشور کور کے من کے مندر میں محبت کا پہلا چراغ روشن ہو چکا تھا۔ اس کے دل کے سادہ ورق پر محبت کا یہ پہلا نقش تھا۔ اس کو اپنے وجود میں کسی دوسرے وجود کی تلاش تھی وہ اسے مل گیا تھا۔ ساحر کی ملاقاتوں نے افسانوی رنگ اختیار کر لیا۔ کالج کے طلبا میں ان ملاقاتوں کا چرچا ہونے لگا۔ ایشور کور کی بدنامی نے ہوسٹل کی دہلیز سے باہر قدم رکھ لیا تھا۔ ایشور کور کی ہر ادا ساحر کی شاعری کا موضع بن گئی۔ گلستان ادب میں پھر سے بہار آگئی۔

ہوسٹل کی لڑکیاں ایشور کور کو ساحر کا نام لے کر چھیڑتیں، ایشور کور سے طرح طرح کی داستانیں وابستہ ہوگئیں۔ وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس معاشقے کا ذکر کالج کی حدود سے باہر تک پہنچ گیا۔ ایشور کور کو بدنامی کا خوف، رسوائی کا ڈر اور والدین کی عزت کا خیال تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں الجھے ہوئے دھاگوں کی طرح ابھرتے اور وہ انہیں سلجھا نہ سکتی۔ وہ پہروں اسی خلجان میں رہتی۔ وہ رات کو دیر تک اپنی زندگی اور محبت کے مآل پر غور کرتی۔ ساحر اس کا ہیرو بن گیا تھا۔ اس کو اس سے باتیں کرنے میں ایک عجیب سی لذت محسوس ہوتی جیسے بچہ قوس قزح کے رنگ دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ مگر قوس قزح کے رنگ بکھرتے ہی اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ رات دن اسے ذہنی خلش رہتی۔ راستے مختلف تھے۔ دو مخالف سمتوں کو جاتے تھے۔ کسی نقطے پر ان کے ملنے کا امکان نہ تھا۔ اس کو اس محبت کا انجام نظر

آتا تھا۔ مگر اس کے معصوم دل پر یہ پہلا زخم تھا جو کسی صورت مندمل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ماں باپ کی عزت پر اپنی محبت قربان کر دے یا رسوائی اور بدنامی کی ظلمتوں میں ہمیشہ بھٹکتی رہے۔ کالج کی لڑکیوں کے ہاتھ تو ایک مشغلہ آ گیا۔ وہ اشاروں اشاروں میں ایشور کور کی محبت کے فسانے کہتیں۔ اس کو ایسے محسوس ہوا کہ شہر دل پر بہت بڑی یلغار ہوئی ہے۔ آخر اس نے دل پر جبر کر کے ساحر سے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس کے نتائج کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس نے ساحر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ ساحر اس غیر متوقع فیصلے کو سن کر حیران رہ گیا۔ اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے پینگ بلند ہو کر اچانک ٹوٹ جائے اور پینگ جھولنے والا دھڑام سے زمین پر گر جائے۔ جیسا کہ اوپر تحریر کر چکا ہوں، ساحر اکیلا نہ رہ سکتا تھا۔ تنہائی اس کے خیالات کے لئے زہر ہلاہل تھی۔ اس کو کوئی نہ کوئی سہارا چاہئے تھا۔ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر رو سکتا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ پہروں وقت گزار سکتا تھا۔ وہ فلمی دنیا میں وقتی طور پر خود کو گم کر سکتا تھا۔ مگر اس کی شاعری، اس کے تصورات کی دنیا خالی ہو گئی تھی جیسے بانسری نغمے سے خالی ہو جائے۔ جیسے رباب کا تار ایک جھنجھناہٹ کے ساتھ اچانک ٹوٹ جائے۔ جیسے کوئی خواب ادھورا رہ جائے۔ ساحر کو پھر زندگی میں خلا محسوس ہونے لگا۔

ایشور کور اداس رہنے لگی۔ وہ اپنا کمرہ مقفل کر کے پہروں تنہائی میں گزارتی۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی۔ وہ کسی سے بات نہ کرتی، لڑکیوں کو مذاق کا نیا موضوع مل گیا۔ وہ اسے ساحر کا نام لے کر چھیڑتیں۔ ان کی ہمدردی بھی مذاق کے پہلو لئے ہوئے تھی۔ اس کی سہیلیاں کہتیں، ''اداس کیوں ہو ہم ساحر سے ملاقات کا انتظام کر دیں گے۔'' کالج کے اندر اور ہوسٹل میں یہ موضوع تفریح کا موجب بن گیا۔ کالج کی زندگی میں ہر کوئی غم سے آزاد، ماحول سے بے پرواہ، مستقبل سے بے خبر ہوتا ہے۔ ہر طالب علم حال کے مرغزاروں میں رہتا ہے۔ ساحر کو ایشور کور کی حالت، اس کی اداسی، اس کی پریشانی کا علم تھا۔ اس نے شعر کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور ایشور کور کو مخاطب کر کے نظم لکھی جس کا عنوان تھا 'کسی کو اداس دیکھ کر'۔ نظم کا آغاز یوں ہوتا تھا:

تمہیں اداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اٹھا رہی ہو تم
چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم
مجھے تمہارے تغافل سے کیوں شکایت ہو
مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے
میں جانتا ہوں کہ دنیا کا خوف ہے تم کو

مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے

یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے

شکست ساز کی آواز روح نغمہ ہے

مجھے تمہاری جدائی کا کوئی رنج نہیں

مرے خیال کی دنیا میں میرے پاس ہو تم

یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں ملا نہ کروں

تمہیں خبر ہے مری زندگی کی آس ہو تم

اس نظم کے آخر میں وہی انقلابی نعرہ ہے جو اس زمانے کی شاعری کا طرہ امتیاز تھا۔ جو نوجوانوں کے جوان خون کی پکار تھا۔ پھر وہی ماحول کی تاریکیوں کا تذکرہ ہے۔ وہی ایک سا انداز ہے۔ اس نظم کا آخری بند ہے:

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے

حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی

یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں

خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی

یہ بات بات پہ قانون و ضابطہ کی گرفت

یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دور مجبوری

یہ غم بہت ہیں میری زندگی مٹانے کو

اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں، ہوسٹل میں چند لڑکیاں تھیں۔ ساحر نے خدا جانے ایشور کور کو کس بہانے کالج بلوایا۔ کالج خالی تھا۔ برآمدے میں ملاقات ہوئی۔ ساحر ایشور کور کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ایشور کور کا وجود تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے اپنا سر ساحر کے کندھے پر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ پرنسپل صاحب کا اچانک ادھر سے گزر ہوا... ساحر کو جبراً کالج چھوڑنا پڑا۔ ایشور کور کو کالج سے نکال دیا گیا۔

ایشور کور کا گاؤں لدھیانے سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ ساحر تو اس شکست سے شکستہ ہوگیا تھا۔ اس کی کائنات لٹ گئی تھی۔ وہ زندگی پر کھیل کر بھی ایشور کور سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے زندگی کی بازی لگانے کو تیار ہوگیا۔

ایک دن میں علاالدین اختر کے گھر تھا، غلام مرتضٰی بھی آگیا۔ ہم کوئی تفریحی پروگرام مرتب کرنے میں مصروف

تھے کہ ساحر آ گیا۔ اس کا چہرہ افسردگی کا آئینہ تھا۔ اس کی گفتگو اس کے جسم کی طرح ٹوٹ چکی تھی۔ ساحر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور ہمیں ایشور کور کے گاؤں چلنے کو کہا۔ ہم نے ساحر کو خوفناک انجام سے آگاہ کیا۔ یہ سارا گاؤں سکھوں کا تھا۔ ایشور کور کا والد گاؤں کا معزز زمیندار اور ذیلدار تھا۔ ہم نے ساحر کو سمجھایا کہ وہاں جانا موت کو دعوت دینا ہے۔ اگر وہاں تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو تمہارا وجود تک مٹا دیں گے۔ ان کی عزت کا معاملہ ہے، یہ اس کے والد کے وقار کا مسئلہ ہے۔ مگر ساحر کو ان باتوں کے سوچنے اور انجام پر غور کرنے کو ہوش کہاں تھا۔ وہ تو زندگی کو داؤ پر لگا کر ایشور کور سے ملنا چاہتا تھا۔

ساحر نے مجبور کیا، بہت منتیں کیں، رویا، ہمیں مجبوراً ساحر کی رفاقت کرنا پڑی۔ ہم سائیکلوں پر سوار ایشور کور کے گاؤں کی طرف چل دیئے۔ آندھی اور بارش سے سائیکل کی رفتار پیدل سے بھی کم تھی۔ ہم نے پھر ساحر کو واپس لوٹ چلنے کا مشورہ دیا۔ مگر ساحر تو زندگی کے آخری لمحے ایشور کور کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ ہم ساحر کو گاؤں سے باہر چھوڑ کر آ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ساحر زندہ بچ کر نہ آ سکے گا۔ خدا جانے ساحر رات کہاں رہا، ایشور کور سے کیسے ملاقات کی۔ دوسرے روز ساحر کو زندہ سلامت دیکھ کر ہم نے خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ساحر کو جبراً کالج بدلنا پڑا۔ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی زندگی کا باب ختم ہو گیا۔ مگر اس کے معاشقوں کا ذکر، اس کی شاعری کے چرچے، دیر تک کالج کی فضا میں ہوتے رہے۔ ساحر کے پہلے شعری مجموعے کی زیادہ تر نظمیں اور غزلیں کالج کے دور کی تخلیق ہیں۔ خانہ آبادی، سرزمین یاس، میرے گیت، طرح نو، طلوع اشتراکیت، شعاع فردا، فنکار اور دوسری نظمیں اسی دور میں لکھی گئیں۔ جنہوں نے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔

ساحر کی ہندوستان گیر شہرت کا سبب اس کی نظم 'تاج محل' ہے۔ یہ نظم دہلی کے ماہانہ ادبی مجلے 'آج کل' میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے بارے میں جناب احمد ندیم قاسمی نے نہایت خوب صورت تبصرہ کیا جو نظم کے ساتھ شائع ہوا۔ تاج محل کے بارے میں یہ نیا انداز فکر تھا، نئی سوچ تھی۔ جو نوجوانوں کے طبقے میں بے حد مقبول ہوئی۔ یہ نظم ساحر کی شاعری کا تعارف ثابت ہوئی۔ ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں ساحر کے فن کو سراہا جانے لگا۔

ساحر کی نظم 'تاج محل' احساس کمتری کا شاہکار ہے۔ تاج محل محبت کے علاوہ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اس کی خوبصورتی، اس کا جمال، اس کا فنی معراج، اس کی زیبائی و دلکشی نے ایک عالم کو مسحور کیا۔ معماروں نے پتھروں کو زبان عطا کی۔ بے جان پتھروں کو حسن زیبائی عطا کی اور انہیں پیکر محسوس بنا دیا۔ ہر آدمی اگر 'تاج محل' تعمیر نہیں کر سکتا تو 'تاج محل' کے مذاق اڑانے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ ہر ملک میں فلک بوس عمارتیں ہیں جو فن تعمیر کا شاہکار نظر آتی ہیں۔ ہر خوبصورت تعمیر، ہر تفریح گاہ کسی نہ کسی شخصیت سے منسوب ہوتی

ہے۔ محبت کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی محبت شعر کا روپ دھار لیتی ہے۔ کبھی نغمہ بن کر روحوں کو مسرور کرتی ہے۔ کبھی نثری شہ پارے کی شکل میں ڈھل جاتی ہے، کبھی گمنام وادیوں میں دم توڑ دیتی ہے، کبھی 'تاج محل' کے حسن میں ڈھل کر دیکھنے والوں کو صدیوں تک دعوت نظارہ دیتی ہے۔ محبت کے جذبے کے لئے امیر، غریب، عالم، جاہل، بادشاہ، فقیر کی قید نہیں۔ ہر آدمی اپنے اپنے جذبات کو کوئی نہ کوئی رنگ دیتا ہے۔
'تاج محل' کو سینۂ دہر کا ناسور کہنا حسن جمیل کا فقدان ہے۔ چونکہ یہ نظم ناپختہ اور سطحی جذبات کی عکاس تھی۔ اس لئے نوجوان نسل کے جذبات کی تسکین کا سامان بنی۔
اگر ایک شہنشاہ محبت کرتا ہے تو اسے اپنی محبت کا ثبوت 'تاج محل' ہی کی صورت میں دینا چاہئے تھا۔ اس میں مذاق کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور!
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں
یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

بہر کیف عوامل چاہے کچھ ہی ہوں، تاج محل ساحر کی زندگی، اس کی شاعری، اس کی شہرت میں سنگ میل ثابت ہوئی۔

ساحر نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہ داخلہ برائے نام تھا۔ وہ سارا دن ادیبوں، شاعروں کے ساتھ رہتا، اور بی اے نہ کر سکا۔ ان دنوں لاہور ادب کا مرکز تھا۔ جتنے ممتاز ادبی پرچے شائع ہوتے ان میں سے اکثر لاہور سے نکلتے۔ ادبی دنیا، مخزن، ہمایوں، ادب لطیف، شاہکار، عالمگیر اور نیرنگ خیال اور دوسرے ادبی پرچے ادب کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ان ادبی مجلوں کے مدیرانِ کرام ہندوستان گیر ادبی شہرت کے مالک اور ممتاز نقاد تھے۔ ان ادبی پرچوں میں چھپنا سند کا درجہ رکھتا تھا۔ ان دنوں لاہور میں عالمگیر شہرت کے ادیب، شاعر اور نقاد موجود تھے۔ عابد علی عابد، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، احسان دانش، ایم ڈی تاثیر، پطرس بخاری، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی، فکر تونسوی، گوپال متل،

ہری چند اختر، عبدالحمید عدم، احمد ندیم قاسمی، تاجور نجیب آبادی اور دوسرے شعرائے کرام اور ادیب ادب کی خدمت کررہے تھے۔ ترقی پسند مصنفین میں زیادہ تر اشتراکی تھے۔ زندگی کی ناکامیوں، زندگی کی تلخیوں، مایوسیوں اور شکستوں کا علاج انہوں نے اشتراکیت میں ڈھونڈا۔ حالانکہ اسی گروہ کے ننانوے فیصد ادیبوں اور شاعروں کی زندگی ان نظریات سے قطعی مختلف تھی جس کی وہ اپنی تحریروں میں تبلیغ کرتے تھے۔ غریبوں، مفلسوں اور ناداروں کی حمایت کا جذبہ الفاظ کی جادوگری سے آگے نہ بڑھا تھا۔ بیشتر ادیب تعیش کی زندگی گزارتے۔ غریبوں کے غم کا مداوا کوئی اعلیٰ قسم کا ہوٹل ہوتا جہاں وہ احباب کے ساتھ خوش گپیاں ہانک کر غریبوں کی ہمدردی کے زخموں کا علاج کرتے۔ قول وفعل کا یہ تضاد اکثر اشتراکی ادیبوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ یعنی اشتراکی نعرہ فیشن سے آگے نہ بڑھا تھا۔ فیض کی شاعری نے نوجوان شعرا کو ایک نعرہ دیا۔

فیض احمد فیض کی نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' کے شائع ہوتے ہی ہر شاعر، ہر ادیب کے دل سے غریبوں سے غم خواری کے چشمے پھوٹنے لگے۔ رومانی شاعری کا رخ انقلابی شاعری کی طرف ہوگیا۔ اس زمانے میں، دورِ غلامی میں، سامراج کے خلاف آواز بلند کرنا سستی شہرت کا ذریعہ تھا۔ یہ خود فریبی کا سلسلہ تھا۔ ادب برائے زندگی کا نعرہ گونجا... ساحر بھی اسی رو میں بہہ گیا۔ وہ پہلے ہی ماحول سے بیزار تھا، اس کے جذبات کو، اس کے نظریات کو اظہار کا ذریعہ ہاتھ لگا۔ ساحر جاگیردار کا بیٹا تھا۔ وہ دوستوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا۔ ادیبوں، شاعروں کی خدمت کے صلہ میں اس کو ادب میں جلد ہی بلند مقام نصیب ہوا۔ اس کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کے نظریات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

لاہور کا قیام ساحر کے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کے سلسلے میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔ یہاں کئی مشاق شاعروں اور ادیبوں سے اس کے روابط قائم ہوگئے۔ ان کی صحبت اور مطالعہ نے اس کے ذوق کو نکھارا۔ اس کی جذباتی شاعری میں ٹھہراؤ، شعور، پختگی اور فنی حسن آگیا۔ ساحر کے لئے لاہور میں سب سے بڑی دلکشی ادب تھا۔ یہاں مختلف ادبی حلقے تھے۔ جہاں ہفتہ وار تنقیدی اجلاس ہوتے تھے۔ دراصل یہ ادبی حلقے نئے شاعروں اور ادیبوں کے لئے تربیت گاہیں تھیں۔ جہاں اساتذہ فن شعر کے حسن وقبح پر فنی لحاظ سے روشنی ڈالتے۔ نثر پاروں پر تنقید ہوتی... ساحر کا زیادہ وقت ادیبوں کے ساتھ گزرتا۔

ہمارے کالج کا ایک طالب علم غلام مرتضیٰ تھا جس نے لاکالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ شام کو اس کے کمرے میں ادیبوں کا اجتماع ہوتا۔ ہوسٹل کا کمرہ ادب کدہ بن جاتا۔ شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ پبلشر بھی آجاتے۔ چوہدری نذیر احمد ادبی مجلے 'ادب لطیف' کا مالک تھا۔ اس میل جول، تعلقات کا اثر یہ ہوا کہ ساحر ادب لطیف کا مدیر ہوگیا۔ اس زمانے میں کسی ادبی پرچے کا مدیر ہونا بڑا اعزاز تھا۔ ادب لطیف، ادبی پرچوں میں ممتاز

حیثیت رکھتا تھا۔ اس پرچے کو ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل تھا۔ دراصل ساحر کے مدیر ہونے میں ترقی پسند ادیب اور شعرا کی کوششوں کو زیادہ دخل تھا۔ بہر کیف ساحر کو اظہار و خیال کے لئے ایک موثر ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ ترقی پسند ادیبوں کے نظریات کو فروغ دینے کا یہ ادبی پرچہ بہت بڑا ذریعہ تھا۔

انہی دنوں ساحر کی امرتا پریتم سے ملاقات ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ پریتم پنجابی کی مشہور شاعرہ تھی۔ اس کی کئی پنجابی نظمیں اس کی شہرت کا سبب بنیں۔ امرتا پریتم کو قدرت نے حسن کلام کے ساتھ ساتھ حسن صورت اور حسن اخلاق سے بھی نوازا تھا۔ امرتا پریتم جاذب شخصیت کی مالک تھی۔ امرتا پریتم نسوانی حسن کا شاہکار اور خوبصورتی کا ماڈل تھی۔ ساحر جب کبھی لدھیانہ آتا تو امرتا پریتم کی باتیں کرتا۔ وہ اس کی ہر ایک ادا کا ذکر کر کے لطف لیتا۔ اس کی شاعری کے محاسن بیان کرتا۔ اس کے خلق کی تعریف کرتا۔ یہاں تک کہ ہم تنگ آ کر ساحر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے اور کہتے لاہور میں امرتا پریتم کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ کسی اور شاعر، کسی اور ادیب کی بات کرو، کسی ادبی جلسے کا ذکر کرو، کسی بزرگ شاعر، کسی مشاعرے کی روداد بیان کرو۔ وہ ادبی گفتگو کرتے کرتے پھر امرتا پریتم کا قصہ لے بیٹھتا۔ امرتا پریتم بہت ذہین ہے۔ اس کے اشعار سے دلوں کے تار لرز اٹھتے ہیں، ہم پھر تنگ آ کر اسے کہتے خدا کے لئے اب بس کرو۔ جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے ساحر جذباتی انسان تھا۔ وہ جس سے محبت کرتا وہ اس کے خیالات کا محور، اس کی شاعری کا حاصل، اس کے افکار کی تفسیر بن جاتا۔

ساحر امرتا پریتم کے بہت قریب آ گیا۔ ساحر کی ذات بڑی پرکشش تھی۔ اس کی گفتگو کا سحر ہر ایک کو اس کا گرویدہ بنا دیتا۔ امرتا پریتم اور ساحر کی محبت کے چرچے ہونے لگے۔ ساحر نے امرتا پریتم کی پنجابی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا اور انہیں ادب لطیف میں شائع کیا۔ اس ادارت سے ساحر کو بہت شہرت ملی اور ہندوستان بھر کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے اس کے تعلقات استوار ہو گئے۔

امرتا پریتم متمول شخص کی بیوی تھی۔ وہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتی تھی، شہرت اور دولت دونوں اس کے پاس تھیں۔ ایک روز اس نے ساحر کے دوستوں کے بارے میں ایسے کلمات کہے جو ساحر کو انتہائی ناپسندیدہ تھے۔ اس نے ان کی غربت، ناداری کے بارے میں حقارت آمیز جذبے کا اظہار کیا۔ ساحر نے اس کے جواب میں خوب صورت نظم لکھی جس کا عنوان 'مادام' ہے:

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی

میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے
نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کو جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی
لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میں جہاں ہوں وہاں انسان نہ رہتے ہوں گے

میں نے بزم ادب کی طرف سے 'یوم اقبال' کے سلسلے میں ایک عظیم الشان مشاعرہ کا اہتمام کیا۔اس مشاعرے میں ممتاز شعرانے شرکت کی۔مشاعرے میں ساحر کو بھی مدعو کیا گیا۔ساحر نے اپنی پرانی درس گاہ،اپنے پرانے کالج کو خوبصورت انداز میں خراج تحسین دیتے ہوئے 'نذر کالج' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ساحر کو گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے والہانہ محبت تھی۔یہ اس کی محبتوں کا مرکز،اس کی شاعری کا محور،اس کی زندگی کی حسین یادگار تھا۔اسی کالج کے اسٹیج پر اس کے انقلابی نغمے گونجے،محبتوں،شکستوں ناکامیوں کے بے شمار واقعات اسی خطۂ حسین سے وابستہ تھے۔یہ نظم عجیب وغریب خیالات کی حامل تھی۔جسے ساحر کے ذہن نے تخلیق کیا۔

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعر آوارہ کا سلام
اے وادیِ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں
تو آج بھی ہے میرے لیے جنت خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال

پھر پرانے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی
سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں

برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں
نغمہ نشاطِ روح کا گایا ہے بارہا
گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا
معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے

نظم کا آخری شعر یہ تھا:

ہم ان حسیں فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

ساحر مذہب سے بالکل بیگانہ تھا۔ ملحدانہ خیالات، باغیانہ افکار اور اشتراکی ذہن نے اسے مذہب سے بھی بغاوت پر آمادہ کردیا تھا۔

عقائد وہم ہیں مذہب خیال خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انسان بستۂ اوہام ہے ساقی

اس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں مذہبی اقدار کا فقدان تھا۔ مذہب سے نفرت اس کے ماحول کا نتیجہ تھی۔ جب اس کا شعور پختہ ہوا تو اس کے اردگرد کمیونسٹ احباب کا حلقہ تھا۔ جن کا مذہب، مذہب سے بیگانگی تھا۔

مذہب سے بیگانگی کے باوجود اس کے دل میں انسانیت کا احترام تھا۔ وہ دنیا میں امن چاہتا تھا، وہ ہر حادثے سے خائف تھا، وہ پیار کی جوت جگانا چاہتا تھا، وہ نفسیاتی طور پر ناکام محبت تھا۔ اس نے انسانیت اور پیار کی تبلیغ کو مقصدِ حیات بنالیا۔ اس کی بیشتر نظموں کا موضوع عالمگیر اخوت و محبت کا پیغام ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں اس نے نہایت خوبصورت نظم تخلیق کی جس کا عنوان 'شریف انسانو' تھا۔ اس نظم میں آفاقیت ہے، عالمگیر امن کا پیغام ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے نتائج کا ذکر ہے۔ نظم ساحر کے مشن کی علامت ہے۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر

بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ غیروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج دیتی ہے
بھوک اور احتیاج کل دے گی
اس لئے اے شریف انسانو
جنگ ٹلتی رہے تو اچھا ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو اچھا ہے

ساحر کی شاعری کا محور انسانیت کا فروغ ہے۔اس کے فلمی گیتوں کا مرکزی خیال یہی ہے۔اس نے فلم کو ادب سکھایا۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

ساحر کو بچپن سے ہی فلمی دنیا سے دلچسپی تھی۔اس کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔اس نے کئی فلموں کے ایکٹر اور ایکٹرس کی تصویریں ایک کاپی میں چسپاں کر رکھی تھیں۔جب اس کے دوست ملنے آتے تو وہ اکڑوں بیٹھ کر کاپی کے ورق الٹتا اور بتاتا کہ اس ایکٹر نے فلاں فلم میں کام کیا ہے۔اس ایکٹرس نے فلاں فلم میں فلاں رول ادا کیا ہے۔پھر اس فلم کے مکالمے اور گیت سنانا شروع کر دیتا۔ہم تنگ آ کر کاپی اس سے چھین لیتے۔اس کو اکثر فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور گیت تک یاد تھے۔اس کو فلموں کے پروڈیوسروں کے نام بھی یاد تھے۔وہ احباب کو زبردستی فلم دکھانے لے جاتا۔یہ اس کی تفریح کا ذریعہ تھا۔غالباً فلموں کی اس دلچسپی نے اسے رومانی شخصیت بنا دیا تھا۔

کس کو خبر تھی کہ یہ فلموں کا شائق فلمی دنیا سے وابستہ ہو کر فلمی گیتوں میں ایک نئی روح پھونک دے گا، اور بے ہنگم، بے معنی اور لایعنی گیتوں کو ادب کا حسن اور شعری لطافتوں سے مالا مال کردے گا۔
قیام پاکستان سے پہلے بھی ایک مرتبہ ساحر بمبئی گیا۔ اس کی کتاب 'تلخیاں' شائع ہو چکی تھی۔ ساحر کا نام سن کر ایک سیٹھ نے اسے فلمی گانے لکھنے کے لئے بلایا۔ سیٹھ نے ساحر کو دیکھا، پوچھا" آپ ساحر ہیں؟"
"جی میں ہی ساحر ہوں۔" ساحر نے جواب دیا۔ اس نے میز کا دراز کھولا اور ساحر کا شعری مجموعہ تلخیاں نکالا اور پوچھا" یہ کتاب آپ نے لکھی ہے۔ ادیب لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔"
"جی ہاں میں ہی اس کتاب کا مصنف ہوں۔" سیٹھ نے دوبارہ ساحر کو غور سے دیکھا کہا کہ" آپ ساحر نہیں ہو سکتے، وہ تو عظیم شاعر ہے۔ تم ابھی بچے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے کتاب پھر میز کی دراز میں رکھ دی اور ساحر کو رخصت کردیا۔

تقسیم پاک و ہند کے بعد ساحر نے فلمی دنیا میں بے پناہ شہرت حاصل کی۔ ساحر نے فلمی دنیا میں خوشگوار انقلاب پیدا کردیا۔ اس نے ایسے گیت لکھے جو ادب کے شہ پارے تھے اور خواص و عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ حکومت ہند نے اسے ادبی ایوارڈ دیا۔ اس کے فن کو مختلف مواقع پر سراہا گیا، اسے اعزاز سے نوازا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور آیا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ میکلوڈ روڈ پر ٹھہرا۔ لاہور کی فضا اسے راس نہ آئی۔ چند مہینوں بعد ہی بمبئی چلا گیا۔ بمبئی میں کچھ مدت اسے فاقہ کشی سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر جلد ہی اسے فلمی دنیا میں مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ساحر نے جس چیز کی خواہش کی اسے ملی، دولت، عزت، شہرت، بنگلہ، کار، نوکر چاکر... سب کچھ اس کے پاس تھا۔ مگر اسے گھریلو زندگی نصیب نہ ہوئی۔ یہ اس کی زندگی میں بہت بڑا خلا تھا۔ اس نے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی اور عزلت کی زندگی گزاری۔ ساحر کی والدہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ یہی اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔ والدہ کی شفقت نے اسے زندہ رکھا تھا۔ موت کے ہاتھوں نے یہ آخری سہارا بھی ساحر سے چھین لیا۔ اب وہ بالکل تنہا تھا۔ والدہ اس کے ہر دکھ کا مداوا تھیں۔ وہ خلا کو گھورتا رہتا، جیسے فضائے بسیط میں کسی شے کو تلاش کررہا ہو۔ وہ زندگی سے بے زار ہوگیا۔ شراب نے اس کے جسم کو کھوکھلا کردیا۔ یہ کھوکھلا جسم فنا کے تند و تیز جھونکے کا منتظر تھا۔ آخر وہ جھونکا آیا اور ادب کا یہ شاداب پھول شاخ سے ٹوٹ کر زمین کا پیوند ہوگیا۔ ■■

حال نہ پوچھا جیتے جی
عرس کریں گے مرنے پر

خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

ندا فاضلی، ممبئی

ساحر۔ تجزیہ نما تاثر

''ساحر صاحب، آج موسم کچھ زیادہ گھٹا گھٹا سا ہے۔''
''ہاں موسموں کی گھٹن کا تلخیاں میں کئی جگہ ذکر ہے۔۔''
''آج کل مارکیٹ میں جاپانی گھڑی سیکو بہت سستی مل رہی ہے۔''
''جی ہاں، تلخیاں میں اسمگلنگ پر کافی گہرے طنز مل جائیں گے۔''
''آزادی کے بعد اردو کتابوں کی مارکیٹ بہت کم ہوگئی ہے۔''
''نہیں صاحب، تلخیاں کے اکتیس سے زائد ایڈیشن چھپ چکتے ہیں۔''
''اشیا کی قیمتیں دن بدن آسمان کو چھورہی ہیں۔''
'سہی ہے، لیکن 'تلخیاں' کا پہلا ایڈیشن لاہور میں چھپا تھا، اس وقت حالات ایسے نہیں تھے۔''

تلخیاں... تلخیاں... تلخیاں... ساحر لدھیانوی سے بات چیت کرنے کے لئے، ہیمنگ وے کے بوڑھے مچھیرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اتفاق سے آپ ان کے فلیٹ میں ہی بیٹھے ہوں تو یہ ضرورت مجبوری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں بھی ساحر کے ملنے جلنے والے عام طور سے وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو ساحر سے کم، ساحر کے بینک بیلنس، فلیٹس اور ساحر کی شراب سے زیادہ ملاقات کرتے ہیں۔ لیکن ایک بار ایک ایسے صاحب بھی ساحر سے ملنے چلے آئے جو شاید ممبئی میں نئے نئے آئے تھے اور صرف ساحر سے ملنا چاہتے تھے۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ وہ ابھی مشکل سے چند منٹ بیٹھے ہوں گے کہ وہسکی کے تین پیگ چڑھائے ہوئے ساحر کی اجازت کے بغیر، ساحر کے بینک بیلنس نے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ بے چارے نئے نئے تھے، اگر جانکار ہوتے تو دوسروں کی طرح وہ بھی فلمی شہرت اور ادبی وقعت میں امتیاز کرنے کی بھول نہیں کرتے۔

ساحر کی تلخیاں کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ لیکن ساحر پیدائش سے اب تک ایک ہی ایڈیشن میں چل رہے ہیں۔ ساحر دراصل اپنے آپ کو نہ بانٹ سکنے کی کشمکش کے شکار ہیں۔ وہ پیر کے انگوٹھے سے سر کے بالوں تک، ابھی تک پورے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر چہ جڑا ہوا آدمی ٹھیک وقت پر

ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنا شروع نہ ہو تو شخصیت میں نئی نئی گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ ساحر کا سب سے بڑا المیہ ان کی یہ ہی سالمیت ہے۔ جس نے ان کے اندر نرگسیت کی ٹیڑھ ابھار دی ہے۔ ساحر کی عمر بھلے ہی کچھ ہو۔ لیکن ذہنی طور پر وہ ابھی تک پندرہ سولہ سال والے کھلنڈرے پن ہی میں سانس لے رہے ہیں۔ وہ جسم سے ضرور بڑھ گئے ہیں۔ لیکن ذہن مادرانہ شفقتوں کے حصار کو پار نہیں کر سکا ہے۔ وہ ابھی تک اسی ماں کے اکلوتے بیٹے ہیں، جو خود کو اور دوسروں کو اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ساحر کی گفتگو کا پسندیدہ موضوع ساحر لدھیانوی ہی ہے۔ اس موضوع کی خشکی کو وہ طرح طرح کے اچھے برے لطیفوں سے کم بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ساحر کو اپنی اس کمزوری کا علم نہ ہو۔ لیکن رات دن محفلوں اور صحبتوں میں گھومنے والا ساحر اپنے اکیلے پن کے شدید احساس کے شکنجوں میں اس بری طرح پھنسا ہوا ہے کہ اب باوجود شعوری کوشش کے وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ ساحر قدرت کی ظرافت کا انتقام اپنے اردگرد کے ماحول سے لینا چاہتے ہیں۔ لیکن تگ ودو کی عملی دنیا میں جب وہ پچپن کروڑ کی بھیڑ میں اپنے آپ کو ایک اکائی کی حیثیت میں پاتے ہیں تو سوائے بے معنی جھلاہٹوں کے ان کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں رہتا۔ ساحر کی جھلاہٹیں ساحر کا مرض ہیں۔ ساحر کے یار دوست ان کمزوریوں کے ساتھ انہیں گوارا بھی کرتے ہیں۔ ہوش میں تو وہ تجارتی مصلحتیں نبھا بھی لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی دو تین پیگ اندر اترتے ہیں، خود ساحر کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ساحر کو فلموں میں کافی تگ ودو کرنی پڑی ہے۔ کرشن چندر کے ورانڈے میں بستر بچھا کر سونا پڑا ہے۔ فلمسازوں کے آگے پیچھے پھرنا پڑا ہے۔ میوزک ڈائرکٹروں کے گھروں کے برسوں طواف کرنے پڑے ہیں، تب کہیں جا کے رئیسانہ ٹھاٹ کے دن دیکھنے کو ملے ہیں۔

ماضی کی تلخ یادوں نے انہیں کسی حد تک Sadist بھی بنا دیا ہے۔ دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہہ کر اور ضرورت مندوں کو بار بار اپنے گھر کے بے مقصد چکر کٹوا کر انہیں اب سکون بھی ملتا ہے۔ ساحر کے پاس جو بھی کسی کام کے لئے جاتا ہے، کبھی مایوس نہیں لوٹتا۔ مگر جھوٹے وعدے کرنا اور مہینوں دوسروں کو ان میں الجھائے رکھنا ان کی مخصوص ہابی بھی ہے۔ ان بے مقصد چکر کاٹنے والوں کی مجبوریوں سے وہ نئے نئے لطیفے تراش کر اپنی شام کی محفلوں کو رنگین بھی بناتے ہیں۔

ساحر کو اپنے ہاتھ سے پیسہ دینے میں مزہ آتا ہے۔ لیکن اگر کہیں کسی کا روزگار لگ رہا ہو تو اس میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لطف کو بھی وہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لیکن ان تمام کج رویوں کے باوجود ساحر اس الٹے سیدھے سماج میں زندگی کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ وہ نئی نئی

controversies میں الجھ کر دوسروں کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کیئے رہتے ہیں۔ دوسروں کے ذہنوں میں کس طرح زندہ رہا جاتا ہے۔ اس فن سے وہ بخوبی واقف ہیں۔

کسی سے بار بار ملئے اور بھول جائیے اور پھر اچانک کبھی یوں ہی اس کے بارے میں سوچنے لگئے۔ نہ جانے کہاں کہاں ذہن لے جاتا ہے۔

ٹوٹی ہوئی زنگ لگی تلوار، بچوں کے گول گول انگوٹھے، سرکنڈوں کے سوکھے کھیت، کچی ململ کے ہلکے گہرے دوپٹے، پیتل کی ترازو اور دور دور تک پھیلا ہوا اندھیرا... عجیب عجیب رنگ پھیلتے ہیں، نئی نئی تصویریں ابھر کر آتی ہیں۔ ہر تصویر اپنے طور پر مکمل، مگر دوسری تصویر سے مختلف اور پھر سب رنگ اور تصویریں گھل مل کر ایک بالکل نئی تصویر کا روپ دھار لیتی ہیں۔ مسکراتی ہوئی ایک بڑی سی تصویر۔ نہ جسم، نہ ہاتھ، نہ پیر، نہ ناک... لیکن ایک مکمل اور زیادہ سچی تصویر...

ساحر سے ملنے سے پہلے میں بھی، 'تلخیاں' کے سرورق پر پھیلی ہوئی چوڑی پیشانی، چیچک کے داغ، گمبھیر آنکھوں اور ضرورت سے زیادہ لمبی ناک کو ہی ساحر سمجھ رہا تھا... لیکن کیمرہ کی آنکھ بھی کتنا دھوکہ باز ہوتی ہے۔ ساحر نے اپنی صحیح تصویر کبھی کسی کو نہیں سونپی۔ وہ جو نہیں تھے، وہ ہی ہمیشہ دوسروں کو دکھاتے رہے ہیں۔

ساحر صاحب، آپ تک پہنچنا بہت کٹھن ہوتا ہے۔ مجھے چار پانچ روز پریشان ہونا پڑا۔ تب کہیں جا کر آپ سے ملاقات ہو پائی ہے اور اسے بھی اتفاق کہئے۔ کمال اسٹوڈیو سے میں نے یونہی نمبر لگا دیا تھا۔ شاید آپ نے اسٹوڈیو کا نام سن کر اپنے ہونے کا اعلان کر دیا۔ ویسے عام طور سے تو آپ ''باتھ روم سے باہر ہی نہیں نکلتے'' آج سے اے مزدور کسانو، میرے گیت تمہارے ہیں۔

''اجی نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں پچھلے ہفتے سے عجیب عجیب پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ گھر میں بہت کم رہا ہوں۔ پہلے کرشن چندر اچانک بیمار ہوئے اور پھر میرے ایک ہم جماعت علیل ہوئے۔ انہیں امریکہ علاج کے لئے روانہ کرنا تھا۔ زیادہ وقت پیسہ جٹانے کی دوڑ دھوپ میں ضائع ہوا۔ جو کچھ کمایا تھا وہ مکان کی تعمیر میں لگا دیا تھا۔ اب تو معاف کیجئے...'' ساحر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ٹیلیفون ٹیبل کی طرف اٹھ کر چل دیئے۔

''...ہلو...! جی میں ساحر بول رہا ہوں۔ کون؟ اچھا ــــ کہئے کیسے ہیں۔ جی جی ــــ ارے کب...؟ اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ آپ کی بیوی... سو روپے... بہتر ہے... نیچے کھڑے ہیں اچھا میں ابھی دیئے دیتا ہوں۔ فون روکے رکھئے۔''

ریسیور نیچے رکھ کر ساحر اندر کمرے میں گئے اور دو تین منٹ بعد واپس آ کر جیسے ہی ریسیور اٹھایا۔ ان کا چہرہ جو

کچھ لمحے پہلے نہایت پسندیدہ اور فکر مند تھا۔ اچانک مسکراہٹ اٹھا "لیجئے ندا صاحب، موصوف فرمارہے ہیں ساحر کو بیوقوف بنادیا۔" کیا خوب تھوڑی دیر بعد اس کا اظہار کرتے تو کیا بگڑ جاتا۔ شاید کسی ساتھ والے سے بات کررہے ہیں۔ مگر فون پر آواز برابر سنائی دے رہی ہے۔

ساحر کافی دنوں تک فلموں کے کامیاب گیت کار رہے ہیں۔ فلموں میں گیت لکھنا تو کوئی زیادہ کٹھن نہیں، ہاں گیت لکھنے کے مواقع حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ طرح طرح سے اپنا ڈھنڈورا پیٹنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکر فلم سازوں کو گیت کاروں کی صلاحیتوں کی اطلاع ملتی ہے۔ ساحر اس راز سے واقف ہیں۔ ان کا ذہن ایسی کہانیاں گڑھنے میں زیادہ خلاق ہے۔ جس کے خالق وہ خود ہی ہوتے ہیں۔

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں

"ہاں صاحب، اب فرمایئے۔" ساحر قہقہہ لگاتے ہوئے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ وہ کہاں سے بات چھوڑ کے گئے تھے۔ اب انہیں یاد نہیں تھا۔ کبھی کبھی ادھوری بات بھی کتنی مکمل ہوجاتی ہے۔

ساحر کا مکان کافی کشادہ ہے، بمبئی میں جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے، وہ پانچ فلیٹوں کی جگہ کو ایک فلیٹ کے لئے استعمال کرتے ہیں اور پھر ساحر کی تو پرچھائیاں کے نام سے پوری بلڈنگ ہی ہے۔ پچھلے دنوں سجاد ظہیر نے جب مہندر ناتھ سے ترقی پسند تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کو کہا تو مہندر ناتھ نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا "بنے بھائی جو لوگ ترقی پسند ہیں، ان کا سوشلزم تو کبھی کا آچکا۔ آپ کے ذہن میں جو سوشلزم کا تصور ہے، وہ تو ان کے لئے اب نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اب بھلا اس تحریک سے کیا فائدہ؟"

ساحر کے مجموعہ کلام 'تلخیاں' کے پہلے ایڈیشن میں پیش لفظ کے طور پر کچھ شعر درج تھے، جو بعد کی اشاعتوں میں ترمیم واضافہ کا شکار ہوگئے۔

انہی میں یہ شعر بھی شامل تھا۔

رجعت پسند ہوں نہ ترقی پسند ہوں
اس بحث کو فضول وعبث جانتا ہوں میں

ساحر بنیادی طور سے ہلکے پھلکے رومانوی ذہن کے شاعر ہیں، ان کا لہجہ، جو موضوعی لحاظ سے فیض کا تقلیدی رنگ لئے ہوئے ہے، نیم پختہ ذہنوں کے لئے خاص دلکشی رکھتا ہے۔ ان کے یہاں نوجوانی کے کھلنڈرے پن کا سیدھا سادا اور وضاحتی اظہار کالج کے لڑکے لڑکیوں میں ایک زمانہ مقبول رہا ہے۔ محنت وسرمایہ کی فارمولائی کشمکش کے راست بیان اور محبت کے غیر تجرباتی ارشادات نے ان کے اشعار میں

Quotability کا حسن تو ابھار دیا ہے، مگر یہ صرف مشاعروں کے سامعین اور آزادی سے پہلے کم عمر لڑکے لڑکیوں کے رومانی خطوط تک ہی محدود ہے۔ ساحر کی پوری شاعری انفرادی تازگی کے بجائے تعمیمی فرسودگی لئے ہوئے ہے۔ جس میں ہر جگہ اپنے عہد کے فیشن کی چھاپ نمایاں ہے۔ مجاز اپنی موت سے کئی سال پہلے 'آوارہ' میں جس ذہنی پختگی تک پہنچ گئے تھے ساحر ہنوز اس سے کوسوں دور ہیں اور یہ ہی ان کی فلمی وادبی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ ساحر نے اپنی شاعری کو اپنی شخصیت کی پیچیدگیوں سے ہمیشہ دور رکھا۔

ساحر صاحب، ترقی پسندی ایک تنقیدی اصطلاح کے طور پر پچھلے تیس پینتیس سال سے استعمال کی جا رہی ہے۔ وہ تمام شاعر جو اس دور میں ابھر کر سامنے آئے ہیں ان کو اسی علامت سے پہچانا جانے لگا، حالانکہ ان شاعروں میں سوائے ہم عصریت کے شاید ہی کوئی فنکارانہ مماثلت ہو۔ ان شاعروں کو اپنے انداز، اسلوب اور شخصی رجحانات کے لحاظ سے کئی خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

1۔ فیض اور مخدوم 2۔ سردار جعفری، نیاز حیدر اور کیفی اعظمی، 3۔ مجاز، جذبی اور جاں نثار، 4۔ سلام مچھلی شہری، ساحر لدھیانوی اور قتیل شفائی... ان میں سے کس گروپ پر ترقی پسندی کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تو آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔ لیکن کیا آپ اس تنقیدی میکانیکیت سے متفق ہیں، جس میں اچھی اور بری شاعری کے فرق کو نمایاں کرنے کے بجائے شعری تخلیقات کو صرف نظریاتی اور موضوعاتی رخ سے پہچانا جاتا ہو۔ آپ خود کو مزاجاً ان میں سے کس گروپ سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں؟

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اپنے آپ کو فیض اور مجاز سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ سلام مچھلی شہری کے ہاں جدت ہے۔ موضوعات کا پھیلاؤ بھی ہے۔ اس نے ہیئت اور موضوع میں تجربے بھی کئے ہیں۔ اچھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص نظریہ پر پوری نہ اترتی ہو، لیکن اس سے اس کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال سے شدید ترین نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوں۔ لکھتے وقت ہر ادیب کو اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہئے۔ جو کچھ بھی کہا جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے۔ یعنی اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو۔ نہیں تو ان کہی بات اندر ہی اندر گولا بن جائے گی۔ جو کشٹ دے گی۔ شعر کہنے کے بعد اس پر کون سا لیبل چسپاں کیا جائے گا۔ یہ ادیب کی نہیں، لیبل فروشوں کے سوچنے کی بات ہے۔ ادب درحقیقت شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اگر وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی لیبل کے لئے لکھتا ہے تو اندر سے کوئی تسکین نہیں ہوگی۔ آزادی سے ساڑھے تین سال پہلے ایک چھوکرے شاعر کا مجموعہ 'تلخیاں' شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک نظم خودکشی سے پہلے بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ کے بعد کئی اصلی اور جعلی ایڈیشن چھپ کر بک چکے ہیں۔

ساحر بولتے وقت ہاتھ کے اشاروں اور چہرے کی کیفیتوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ جب یہ کام دیتے نظر نہیں آئیں گے تو کھڑے ہو کر ذرا اونچی آواز کر کے بولیں گے۔ اگر سامنے والا پھر بھی مطمئن نہ ہو تو آخری حربہ کے طور پر ایک خاص قسم کے پنجابی قہقہے کا استعمال کریں گے۔ اب آپ کی مرضی ہے جواب بھی قائل نہ ہوں۔ وہ تو اپنی بات مکمل کر چکے۔ اب آپ ہی کوئی دوسری بات چھیڑ دیں تو وہ بولیں۔ نہیں تو... آدھی سے زیادہ سگریٹ بجھانے میں مشغول ہو جائیں گے یا سگریٹ کا پیکٹ آپ کی طرف بڑھا دیں گے۔ لیکن سگریٹ پیش کرتے وقت اپنا کوئی شعر پڑھتے ہوئے اپنی عظمت کی چمک آپ کی آنکھوں میں ضرور دیکھنا چاہیں گے۔ ساحر ہر وقت ایک عجیب سی بے سکونی کے عالم میں رہتے ہیں۔ جس کو بھولنے کے لئے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے یا بولتے رہنے کا شکار ہو چکے ہیں۔

ساحر صاحب 'تلخیاں' کی بیشتر نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، آپ اپنے معاصرین میں فیض سے زیادہ متاثر ہیں۔ موضوع اور اسلوب دونوں میں یہ تاثرات نمایاں ہیں۔ لیکن ان اثرات کی رو فیض کی ابتدائی رومانی نظموں تک ہی محدود ہے اور وہ بھی موضوعات کی حد تک، فیض کے لہجہ کی گرمی و سنجیدگی اور تہہ داری ان میں نہیں ملی۔

'پرچھائیاں' (ساحر کی طویل نظم) سے پہلے کی نظموں کی کینوس بھی فیض کی ان نظموں کی طرح چھوٹی ہے۔ وہی ایک نوعمر عاشق، ایک حسین محبوبہ اور درمیان میں کھڑا ہوا کوئی سرمایہ دار جو دولت سے محبوبہ کا مول تول کر کے بیچارے عاشق کو خودکشی کرنے کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ انہیں تین کرداروں کو بار بار رومانی انداز میں دوہرایا جاتا ہے۔ کہیں غربت کے کارن محبت ٹوٹتی ہے، کہیں جہاد پر جانے کی وجہ سے ناطہ ٹوٹتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا لہجہ ایک خاص عمر میں بہت مانوس اور پرکشش لگتا ہے۔ لہجہ میں اس قسم کی رومانوی کشش الفاظ کو موضوع کے متعارف چہروں تک ہی محدود رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اچھی شاعری کے لہجہ ہی میں موضوع ہوتا ہے۔ جبکہ آپ کے یہاں یہ عمل دو متضاد رخوں کو یکجا کرنے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ لہجہ شاعر کی شخصیت کی مانند کہیں گہرا، کہیں تہہ دار اور کہیں یک سمتی ہوتا ہے۔ اس میں لفظی تزئین سے نہیں، اس شخصیت کی تزئین سے کام چلتا ہے جو از خود الفاظ کے مخصوص انتخاب اور وزن و بحر کے برتاؤ میں شامل ہو جاتی ہے۔ آپ کی نظموں شاہکار، تاج محل، نور جہاں اور پرچھائیاں آپ ہی کی دیگر نظموں سے الگ لگتی ہیں۔ ان میں فیض کی ابتدائی نظموں کے اثرات بھی کم کم نظر آتے ہیں۔ ان نظموں کو پسند کرنے والوں میں شاید عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ لیکن یہ نظمیں بھی روایتی انداز لئے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موضوع کو الفاظ کی چھوٹی چھوٹی کیلوں سے ایک خاص ترتیب سے جڑ۔

دیا گیا ہے۔ کوئی لفظ بھی دائیں بائیں نہیں جھانکتا۔

''میں عمر کے لحاظ سے صرف کیفی کو چھوڑ کر اپنے معاصرین میں سب سے چھوٹا ہوں۔ فیض، سردار، نیاز سب مجھ سے سینئر ہیں۔ مجاز کا آہنگ جب شائع ہوا تھا۔ اس وقت میں میٹرک کا طالب علم تھا اور فیض کے مجموعے کی اشاعت کے وقت میں بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ میری کچھ نظموں میں فیض کے اثرات ضرور ہیں۔ مجاز کے یہاں کلاسکی رچاؤ ہے، وہ مجھے پسند ہے۔ شاید 'چکلے' میں اس کا اثر ہو۔ ہر شاعر اپنے سینئر شاعروں سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن سرقہ اور اثرات میں فرق ہے۔ میری کئی نظموں کے موضوع 'تاج محل' 'چکلے' 'گریز' 'خوبصورت موڑ' وغیرہ مختلف ہیں۔ سو فیصدی اوریجنل تو کوئی نہیں ہوتا۔

''فیض کے یہاں تشبیہات زیادہ ہوتی ہیں۔ میری نظموں میں صفت Adjectives سے فضا پیدا ہوتی ہے۔ شاعر کی خود کی شخصیت اس کے فن اور اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک اپنا حلقہ ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق موضوع اور اسلوب کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں مزاجاً متوسط طبقے کا فرد ہوں۔ شاید میں اب تک ڈی کلاس نہیں ہو پایا۔ برسوں پہلے میری نظمیں مزدوروں میں خاموشی سے سن لی جاتی تھیں۔ لیکن تالیاں کیفی کو زیادہ ملتی تھیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے 'ساحر کالج کے لڑکے لڑکیوں میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یہ نیم پختہ ذہن کی شاعری ہے' لیکن مجھے ایسا سوچنے والوں کے ذہن کی پختگی پر شک ضرور ہوتا ہے۔ میں اسی ماحول سے نکلا ہوں۔ اس سے متاثر ہونا فطری ہے۔ لیکن شاعر کی عمر کے ساتھ شاعری کے موضوعات اور ان کا برتاؤ بھی بدلتا ہے۔ ہمارے زمانے میں حفیظ اور عدم بزرگ شاعروں میں بہت پاپولر تھے۔ ہم بھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ انہیں کے ساتھ پڑھتے تھے اور زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ آج بھی فراق کہتے ہیں، مشاعروں کے ٹکٹ ساحر صاحب کے نام پر ہی بکتے ہیں۔''

''لیکن ساحر صاحب مشاعرہ کی خاموشی یا تالیاں تو اچھی بری شاعری کی کسوٹی نہیں بنائی جاسکتیں۔ غالب پسند نہ کئے جانے والے شاعر رہے ہیں۔ فانی، حسرت، یگانہ کے مقابلے میں نوح ناروی چھتیں پھاڑ دیتے ہیں۔ ہندی کے اچھے شاعر اگیے سے لے کر دھرم ویر بھارتی اور سرویشور دیال تک نیرج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ ملارمے سیت پرس اور بودلیر وغیرہ کو ان کے عہد میں ہی بنا تشریحات کے کہاں سمجھا یا گیا۔ فرانس اور یورپ کے دوسرے علاقوں میں تو مشاعرہ نام کی چڑیا ہی عنقا ہے۔ تو کیا وہاں اچھی شاعری پیدا ہونے کا امکان نہیں۔ پچھلے دنوں ممبئی کے ایک مشاعرہ میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی سے زیادہ سامعین نے ایک سستے شاعر کو سننا پسند کیا۔ کبیر، نانک اور تکارام کے سامعین اور

مشاعرہ سننے والوں میں فرق ہے۔صوفی شعرا اور مذہبی پیشوا کے اردگرد بیٹھنے والے مخصوص عقائد کی سطح پر ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔مشترکہ اقدار کا وجود ترسیل کے لئے بہت ضروری ہے اور پھر ان کے کلام کی مقبولیت عقیدت مندانہ ہے۔ان کے عقیدت مندوں میں ان کے کلام کو سمجھنے والے کتنے ہیں۔یہ ہنوز ایک مسئلہ ہے۔کبیر کی الٹ بانیاں آج بھی اچھے اچھے اسکالرس کے لئے معمہ بنی ہوئی ہیں۔نانک اور تکارام کے ارشادات کو بنا وجدانی سوجھ بوجھ اور اس کی علامتی اظہاریت کے سمجھنا محال ہے۔آج کے عہد میں جبکہ ہر فرد اپنے وجود کی سطح پر سانس لے رہا ہے۔ماحول میں اپنے ڈھنگ سے اپنی تلاش کر رہا ہے۔شعر سنتے ہی قاری اسے کسی گولی کی طرح گٹک لے شاید اب ممکن نہیں۔اچھا شعر دھیمے دھیمے کھلنے والی کل کی مانند ہوتا ہے۔یہ سنتے ہی وہ پڑھنے والے سے معیاری سوجھ بوجھ کا تقاضہ کرتا ہے۔'''یہ صحیح ہے، مشاعرہ میں شعر کی مقبولیت کوئی معیار نہیں۔لیکن اچھے شعر کی تعریف یہ بھی نہیں کہ وہ نامقبول ہو۔آرٹ فن کار کے تجربات کا اظہار ہے۔ہر ادیب اپنی نظر سے اپنے ماحول کو دیکھتا ہے۔اور اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔اسے Convey کرنا چاہئے۔ایسا کہنے کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔اس کے لئے شوق، محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔مشاعرہ کی کامیابی میں شعر کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی کام کرتے ہیں۔کسی خاص وقت کا موڈ اس کے اعتبار سے موضوع کا انتخاب وغیرہ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کم تر درجہ کی نظم صرف اس لئے کامیاب ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی سلگتے مسئلہ کو سیدھے سادھے طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہوتا ہے۔یہ سچ ہے کہ مشاعرہ کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔لیکن بقول اہرنسبرگ، وقتی ادب کی بھی ایک خاص عہد میں بہت اہمیت ہوتی ہے۔''

اہرنس برگ کا یہ قول کئی سال پہلے 'آخر شب' میں کیفی کی احتجاجی شاعری کے ڈیفنس میں درج کیا گیا تھا۔اہرنسبرگ نے اس ایک جملہ کے علاوہ بھی کچھ کہا ہے یا نہیں، یہ تو اہرنس برگ کے مطالعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔لیکن ضرورت سے زیادہ مادی مصروفیتوں میں اتنی فرصت کہاں کہ اپنی تخلیقات کے علاوہ کسی دوسرے کی کتابوں کو پڑھا جائے۔لیکن یہ حقیقت ہے لکشمی اور سرسوتی کی برسوں پرانی رقابت کو ساحر نے جس خوبصورتی سے دوستی میں تبدیل کیا ہے وہ صرف اردو ہی نہیں عالمی ادب میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔خود ساحر کے ہی لفظوں میں: ''برنارڈ شا کو ایک لفظ کا صرف ایک پاؤنڈ ہی ملتا تھا، میں نے تو ایک ایک گیت کے پانچ ہزار سے دس ہزار لئے ہیں۔''

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

■■

واجدہ تبسم

آسماں چپ ہے

کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ایک انسان، جسے آپ دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں، وہ آپ کے بیچ موجود نہیں اور آپ سے کہا جائے کہ اس کی یاد میں کچھ لکھیں...!

جب ساحر صاحب زندہ تھے--- (کیا واقعی وہ مر چکے ہیں؟) تو میں ان سے ہمیشہ کہا کرتی تھی "ساحر صاحب آپ اتنی پیاری باتیں کرتے ہیں کہ میں آپ پر صرف ایک مضمون نہیں ایک پوری کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔ جس میں خاص طور سے آپ کی مزاحیہ باتیں شامل کروں جو ایک طرح سے لطیفوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔"

ساحر صاحب صرف ہنس دیا کرتے۔ انکار انھوں نے کبھی نہیں کیا کیوں کہ اپنی گفتگو کے سحر سے وہ خود بھی واقف تھے۔ ساحر صاحب بولتے تو بولتے ہی چلے جاتے۔ پھول ہی پھول بکھیرتے چلے جاتے۔ پھر ان کے آگے کسی کا چراغ روشن نہ ہو پاتا۔

تین سال پہلے، ہندوستان سے آٹھ شعرا کو امریکہ اور کینڈا، مشاعروں کے لئے، آنے جانے کی ٹکٹوں کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے شاعری شروع کئے ان دنوں چند ہی دن گذرے ہوں گے۔ پتہ نہیں کیسے اتنی دور شہرت جا پہونچی۔ بہرحال ہم سبھوں نے وہاں خوب مشاعرے اٹینڈ کئے۔ بے حد دھوم مچائی۔ واپسی میں بھی شاداں و فرحاں تھے کہ ایک رات پتہ چلا کہ ساحر صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ سوگوار شام مجھے بھلائے نہیں بھولتی۔ فیض احمد فیض بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اسی شام ایک تعزیتی میٹنگ کی گئی۔ ہر شاعر اور ادیب نے ساحر کو یاد کیا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ ان کے ذاتی محاسن بیان کئے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ جب آنسوؤں سے آنکھیں بھری ہوں، دل رو رہا ہو تو زبان یوں بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ اس ساؤتھ امریکہ کی ٹھنڈی، برفیلی رات کو جب ہم ساحر صاحب کا غم لے کر اپنے اپنے گھروں کو پہونچے تو اوروں کی تو خبر نہیں، لیکن میں رات بھر روتی رہی، جاگتی رہی، جاگتی رہی، روتی رہی۔

کیا اب میں ساحر صاحب کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی...؟ کیا اب میں اس عظیم انسان کی پیاری پیاری باتیں کبھی نہیں سن پاؤں گی...؟ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے امریکہ سے اپنے میاں کو ایک خط لکھا تھا کہ

''ہندوستان پہونچنے کے بعد اب میں ساحر کے گھر بہت جایا کروں گی، کیوں کہ مجھے اپنی کتاب شروع کرنی ہے۔'' ساحر صاحب کی زندگی ہی ختم ہوگئی اب وہ کتاب کبھی شروع نہیں ہوگی کیوں کہ وہ کتاب میں جس پیاری شخصیت کو اپنے ہاتھوں پر زنٹ کرنا چاہتی تھی وہی نہیں رہی۔ ساحر صاحب جانتے تھے کہ میں ان کی شاعری کی دیوانی ہوں۔ 'تلخیاں' کا نیا ایڈیشن آیا تو انہوں نے پہلی کاپی مجھے تحفہ دی۔ ''واجدہ کے لئے... خلوص اور محبت کے ساتھ، پہلی کاپی ساحر۔''

میرے میاں نے محبت بھرا اعتراض کیا۔ ''ارے واہ ساحر صاحب ہم کیا آپ کے کم دیوانے ہیں۔ یہ تو آپ نے ظلم کردیا۔'' ساحر صاحب نے فوراً میرے ہاتھ سے کتاب لی اور آگے جملہ بڑھادیا۔ ''واجدہ اور اشفاق دونوں کے لئے۔ آدھی کتاب۔'' وہ میرے میاں کو بے حد چاہتے تھے۔ ان دنوں اشفوکو ان کی پوری کتاب 'تلخیاں' زبانی یاد تھی۔ کئی سال بعد ان کی کتاب کا ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ذہانت کا یہ عالم کہ نئی کتاب پر زنٹ کرنے میں کوئی دس بارہ سال کا وقفہ تھا۔

ساحر صاحب سے پہلی ملاقات حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ ان دنوں اختر بھائی (جاں نثار اختر) سے میری خط و کتابت شروع ہوئی تھی اور میرے گھر میں ہنگاموں کا باعث بنی ہوئی تھی۔ میں ایک برس کی تھی تبھی امی کا انتقال ہوگیا تھا۔ تین برس کی ہوئی تو بھیا بھی ختم ہوگئے۔ ہم چار بہنوں اور چار بھائیوں کو نانی اماں نے پالا۔ نانی اماں کچھ بھی پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے زینات کے کاغذات پر، کورٹ کچہری کے مرحلوں کے لئے، صرف اپنا نام اردو میں لکھنا سیکھا تھا۔ لیکن ہم سب بہن بھائیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بے حد غربت کے باوجود دلوائی کہ تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھیں، لیکن حد درجہ پرانے خیالات کی تھیں۔ پردہ خود بھی کرتی تھیں ہم بہنوں پر بھی لازم تھا۔ ان دنوں ہنگاموں کی وجہ میری ذات اور اختر بھائی سے خط و کتابت تھی۔ کیوں کہ جب حیدر آباد میں مشاعرے کا اعلان ہوا اور ساتھ ہی اختر بھائی کی آمد کا بھی، تو میں نے بھی گھر میں اعلان کردیا کہ ''میں اختر بھائی سے ملوں گی، چاہے جو بھی حشر ہو۔''

بہر حال وہ ایک الگ داستان ہے۔ لیکن میں ساحر صاحب سے اختر بھائی کے ساتھ ہی ملی۔ جب کسی نے میرا تعارف کروایا تو ساحر صاحب نے سر سے پیر تک مجھے ذرا حیرت سے دیکھا اور کہا ''آپ تو بالکل بچی سی لگتی ہیں۔ اتنی بچی کہ 'آپ' کہتے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے۔''

یہ بات آج سے کوئی 26-25 سال پہلے کی ہے اور اس وقت میں اتنی دبلی تھی کہ کوئی بھی نیا ملنے والا مجھے ہائی اسکول میں پڑھنے والی بچی ہی سمجھتا۔ جبکہ کہانیاں بقول شخصے ''ایسی پکی پکی اور خون میں حدت پیدا کرنے والی'' لکھ چکی تھی کہ لوگ بوڑھی نہیں تو ادھیڑ ضرور سمجھتے۔ ان دنوں میں اپنے ایم اے کے اگزام کی تیاری کر رہی

تھی۔

"تو پھر آپ تم ہی کہئے نا" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"بھئی ادیب ہو تو مخاطب تو عزت سے ہی کرنا چاہئے نا...؟" انھوں نے بے حد اپنائیت سے کہا۔ (لیکن بعد میں ہمیشہ بے حد شفقت سے چھوٹی سمجھ کر تم ہی کہا) اس کے بعد میں ساحر صاحب سے بمبئی میں اپنی شادی کے بعد اپنے شوہر اشفاق کے ساتھ ہی ملی اور بے حساب بار ملی۔

مجھے اور اشو کو ذرا وقت ملتا اور ہم سیدھے ساحر صاحب کے یہاں پہونچ جاتے۔ ساحر صاحب کے ہاں بے حساب دعوتیں ہوا کرتیں۔ فلمی لوگوں میں بڑی سے بڑی شخصیت ان کے ہاں موجود۔ میں ان پارٹیز میں بہت کم جاتی۔ خدیجہ آپا (بیگم جاں نثار اختر) ہنس ہنس کر جوک سناتیں۔

"ارے واجدہ تم کو پتہ ہے ساحر صاحب مہمانوں کی لسٹ بنوا رہے تھے۔ واجدہ تبسم کا نام لکھوا کر کہنے لگے 'آگے قوسین میں یہ بھی لکھ دو کہ آنہ پائے گی... یا تو بچہ ہونے والا ہوگا یا ہو چکا ہوگا۔" اس میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ اتنی جلدی جلدی 5 بچے اللہ کی مہربانی سے ہو گئے کہ واقعی کہیں جانے آنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ ساحر صاحب اس بات پر میرا بے حد مذاق بناتے۔ میرا بڑا بچہ 4-6 مہینے کا ہوا تو اسے ساحر صاحب کے ہاں لے گئی۔ جاتے ہی میں نے اسے ساحر صاحب کی گود میں ڈال دیا اور کہا۔

"ساحر صاحب اب یہ زندگی بھر فخر کرے گا کہ کس بے پناہ شاعر نے اسے گودوں میں کھلایا ہے۔"

اور واقعی وہ (سراج الدولہ) آج بھی ذکر آئے تو بے حد خوش ہوتا ہے اور فخر محسوس کرتا ہے۔ جب تک دو ہی بچے تھے تو میں بھی کبھار دونوں کو ساحر صاحب کے ہاں لے کر چلی جاتی تھی۔ میرے بچے بچپن میں شریر نہیں تھے۔ دوسرے والے کا نام ٹیپو سلطان ہے۔ وہ دونوں صوفوں پر بڑے مودب بن کر بیٹھ جاتے تو ساحر صاحب ان کے ناموں کی رعایت سے (سراج الدولہ، ٹیپو سلطان) مذاق کرتے۔ "بھئی یہ انقلابی اور باغی حکمراں اس قدر چپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں۔"

کھانا کھلانے کا ساحر صاحب کو شوق ہی نہیں بلکہ 'ہوکا' تھا۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ جب میں اور میرے میاں ساحر صاحب کے ہاں پہونچے ہیں تو اس وقت صرف انور، ماں جی اور ساحر صاحب ہیں... رفتہ رفتہ لوگ آنے شروع ہوتے۔ ایک حد یہ آجاتی کہ بقیہ کسی فنکشن کے تیس تیس چالیس چالیس لوگ جمع ہو گئے۔ انور شامی کباب تل تل کر بھجواتی جا رہی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شراب کی بوتلیں کھل رہی ہیں۔ دوسرے کئی اقسام کے snacks بھی سرو کئے جا رہے ہیں۔ ساحر صاحب خود کم پی رہے ہیں دوسروں کو خوب پلا رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں نوکر سے کہہ کر مزید شراب اور لوازمات منگا رہے ہیں اور ہنس ہنس کر کہہ رہے ہیں۔

"اے بھئی اشو اور وجو، تم مسلمان کم سے کم کوک ہی پی لو۔ پھر کبابوں کی پلیٹ سامنے کھسکا کر کہتے... "ارے بھی کھاؤ۔ یہ تو حرام نہیں ہے نا۔ کھاؤ ماں جی تسی بھی کھاؤ۔" بیچ بیچ میں پنجابی بولنے کا موڈ ان پر سوار ہو جاتا۔ رات کے گیارہ بارہ بجے تک تو مے نوشی ہی جاری رہتی۔ اس کے بعد پکڑ پکڑ کر ایک ایک کو زبردستی کھانا کھلاتے۔ شعرا کے بارے میں عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ شاعری سنانے پر اتاؤلے ہوتے ہیں۔ مرے جاتے ہیں کہ کوئی ہمیں سنے۔ ساحر صاحب کے ہاں جب کبھی ادبی قسم کی محفل بج جاتی اور شعرا مجبور ہوتے تو وہ ہر ایک سے بے حد فرمائشیں کر کر کے ان کے کلام سنتے۔ بے حد داد دیتے۔ خود کبھی نہ سناتے۔ اگر حاضرین بے حد ہی اصرار کرتے تو ایک آدھ غزل سنا دیتے۔ محفل میں جتنے بھی لوگ موجود ہوتے سب سے اصرار کرتے کچھ نہ کچھ سنائیں ترنم نہ سہی تو تحت ہی میں سہی۔ میرے میاں ماشا اللہ خاصے بے سُرے ہیں، ترنم کی ان کو چھوٹ مل جاتی، لیکن تحت میں کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑتا۔ مجھ سے فرمائش کرنے سے پہلے ہمیشہ نئے مہمانوں سے مجھے یوں متعارف کرواتے۔

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ ادیبہ ہے اور صرف کہانیاں اچھی لکھتی ہے۔ جی نہیں... ہماری یہ ادیبہ بے حد اچھی گلوکارہ بھی ہے۔"

جب میں شادی ہو کر پہلی بار بمبئی آئی تو سبھی شاعروں اور ادیبوں نے ہماری دعوتیں کیں۔ ساحر صاحب نے بھی کی اور حسب عادت محفل بجی تو یہاں کے شعرا نے ان کی فرمائش پر اپنا اپنا کلام سنایا۔ شاید یہ ساحر صاحب کی ہمیشہ سے ہی عادت رہی ہوگی کہ سبھی سے کچھ نہ کچھ گانے یا اشعار سنانے کی فرمائش کرتے ہوں گے۔ بہر حال اس دن انہوں نے مجھ سے بہت کہا۔

"بھئی اب واجدہ گائے گی۔ یا کچھ اشعار سنائے گی۔" میں نے ساحر صاحب کا ہی ایک بے حد خوبصورت گیت،

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

اسی ٹیون میں سنایا جیسے 'ریلوے پلیٹ فارم' فلم کے لئے یہ ٹیون کیا گیا تھا۔ (پتہ نہیں اتنا خوبصورت گیت کیوں اس فلم سے کاٹ دیا گیا تھا۔) میں نے یہ گیت سنایا اور تالیوں کا بے پناہ شور اٹھا۔ ساحر صاحب حیران سے ہو کر کہنے لگے "واجدہ تم فلموں میں پلے بیک دینا شروع کر دو۔ میں تمہیں چانس دلواؤں گا۔ بھئی بڑا ہی اچھا گاتی ہو۔" یہ بات میں نے بطور خاص اس لئے لکھی ہے کہ اکثر لوگوں کو ساحر صاحب سے یہ شکایت رہی کہ وہ کسی کو آگے بڑھنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ کسی قسم کی ہیلپ نہیں کرتے تھے۔ میں کتنے میوزک ڈائرکٹروں کے نام گنواؤں جو صرف ساحر صاحب کی وجہ سے آج Top پر ہیں۔ جب میں شادی ہو کر بمبئی جیسی فلم نگری آ رہی تھی

تو میرے بھائیوں نے جو میری آواز سے پہلے ہی خوف زدہ تھے مجھے بتا دیا تھا کہ ''اگر تم نے بمبئی جا کر فلموں میں گانے وغیرہ گائے تو سمجھ لینا کہ تم ہمارے لیئے مر گئیں اور ہم تمہارے لیئے۔''
تو ظاہر ہے مجھے فلموں میں پلے بیک وغیرہ تو کیا دینا تھا لیکن اس دن کے بعد سے یہ ضرور ہوا کہ ساحر صاحب کے یہاں کی کوئی بھی محفل میری آواز کے بغیر ادھوری ہی مانی جاتی۔ اور حد ہے میری 'ساحر پرستی' کی کہ میں نے زندگی میں ساحر صاحب کے یہاں اس گیت کے علاوہ کبھی اور کوئی گیت نہیں گایا۔ یا پھر ساحر صاحب کی ہی کوئی غزل سنائی تو سنائی۔ اس گیت سے متعلق ایک بے حد مزے دار لطیفہ بھی ہوا۔ دہلی میں ہی ایک مشاعرہ غالباً 1961 میں ہوا۔ ہم بھی گئے تھے ساحر جب ڈائس پر آئے تو لوگوں کا یہ شور فرمائش لئے اٹھا۔
چاند مدھم ہے... چاند مدھم ہے...
ساحر صاحب نے بے حد سنجیدگی اور متانت سے عوام کو بتایا۔ ''جملہ حقوق واجدہ تبسم کے لئے محفوظ ہیں۔'' اور پھر واقعی سنایا بھی نہیں۔
بہر حال میں ذکر کر رہی تھی ان کے کھلانے پلانے کا شوق کا۔ اتنا کھلاتے کہ حد باقی نہ رکھتے۔ مجھے شامی کباب بے حد پسند ہیں۔ ہمیشہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میری کرسی کے پاس آ کر اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ میں کباب ڈالتے۔ میں کہتی ''ساحر صاحب کھڑے رہنے کا بھی دم نہیں اب تو۔''
کہتے... ''تو یہیں سو جاؤ۔'' یہ عجیب بات ہے کہ میرے اور اشو کے رشتے دار بمبئی میں ہیں۔ ہم کبھی اپنے گھر کے علاوہ کسی کے گھر کبھی نہیں سوئے۔ لیکن ساحر صاحب کے یہاں دو تین بار سوئے۔ ہوتا یوں کہ ایک ایک کر کے سارے مہمان چلے جاتے، ساحر صاحب ہمیں روکتے جاتے۔ ''ارے بھئی جوہو سے سانتا کروز کون سا دور ہے۔ اتنا قریب ہے۔ جلدی کیا ہے۔'' پھر ہنس کر کہتے۔ ''کیوں اشفاق صاحب؟؟''
اس قریب قریب کے چکر میں تین چار بج جاتے۔ پھر اندر کو آوازیں لگانے لگتے۔
''بھئی ان اشو اور دتو کے لئے کمبل، چادریں اور تکیوں کا بندوبست کر دو۔'' اور خود بڑے مزے میں اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے۔ انور مسکراتی ہوئی، نیند کے باوجود مستعدی سے ہمارے سونے کا انتظام کرتی، صبح بھی ناشتے کے بعد ہی آنے دیتے۔ میں کہتی ''ساحر صاحب قسم سے ایسا لگتا ہے کہ رگوں میں خون کے بجائے آپ کا نمک دوڑ رہا ہے۔'' تو ذرا بد مزہ ہو جاتے۔ تعریف سے دنیا میں ہر انسان خوش ہوتا ہے۔ خود خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ ساحر صاحب بھی انسان ہی تھے، لیکن کھلانے، پلانے کے بارے میں میری تعریف کے اس انداز سے وہ خوش نہیں ہوتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے۔
''ارے بھئی کوئی انسان آئے، دو گھڑی بیٹھے، باتوں میں وقت نکلتا ہی چلا جائے تو کیا بھوکا ہی جانے دیں۔''

میں نے ساحر صاحب کے دستر خوان (بائبل) سے ایسے ایسے نمک حلالوں کو بھی کھاتے دیکھا ہے جوان کے فلیٹ کے دروازے سے باہر ہوتے ہی ان کی برائیاں شروع کردیتے۔ لیکن ساحر صاحب انھیں بھی اتنے ہی خلوص اور محبت سے کھلاتے جتنا اپنے کسی عزیز ترین دوست کو۔ (انھیں پتہ تھا کون کون ان کی غیبت کرتے ہیں۔)

ساحر صاحب نماز نہیں پڑھتے تھے۔ روزہ رکھتے بھی میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ قرآن شریف کیا پڑھتے ہوں گے لیکن پھر بھی میں کہوں گی وہ جنتی تھے۔ حضور اکرمؐ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا ''یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ اسلام کیا ہے۔؟''
آپ نے فرمایا ''میٹھی باتیں کرنا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا۔'' ساحر صاحب میٹھی بات بھی کرتے تھے اور بھوکوں کو کھانا بھی کھلاتے تھے۔ (چاہے وہ امیر ہوں یا غریب) یعنی اسلام پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔
بعض لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ ساحر صاحب میٹھی بات نہیں کرتے۔ ان کی باتوں میں تلخی ہوتی تھی۔ کڑواپن ہوتا تھا۔ ممکن ہے جن لوگوں کو یہ شکایت رہی ہو وہ خود انہیں تلخ اور بدمزہ کردیتے ہوں۔ لیکن میں نے انہیں کبھی تلخ یا بدمزہ گفتگو کرتے نہیں پایا۔ ان کی گفتگو کی ایک بڑی خاص خوبی یہ تھی کہ پھلجھڑیاں سی کھلاتے ہوئے چلتے تھے۔ اکثر لوگ موضوعات کی کمی کی وجہ سے ایک ہی بات یا قصے کو بار بار ریپیٹ کرتے ہیں، ساحر صاحب ہمیشہ نئی سے نئی بات کرتے۔ محفل کو زعفران زار بنائے رکھتے۔

مجھے ان لوگوں سے سخت نفرت محسوس ہوتی ہے جو محفل میں گندی گندی گالیاں بکتے ہیں۔ خواتین کی موجودگی کا بھی لحاظ اور پاس نہیں رکھتے۔ میں نے کئی تعلیم یافتہ اور معزز مردوں کو گالیاں بکتے سنا ہے۔ لیکن صرف ایک ہی بار۔ کیوں کہ دوسری بار پھر میں ایسے لوگوں کی محفل میں بیٹھی ہی نہیں اور میرے میاں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ گالیوں سے مجھے بے حد چڑ ہے تو وہ بھی مجھے ایسی محفل میں لے جاتے ہی نہیں۔ ساحر صاحب نے یہ بات میرے منہ سے سن لی تھی۔ کم سے کم میرے سامنے انہوں نے کبھی گالی نہیں بکی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ گالیاں دیتے تھے۔ دیتے ہوں گے، میں نے کبھی نہیں سنیں۔ عورتوں کا وہ بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے ہاں سجنے والی محفلوں میں نہ کبھی کسی خاتون پر آوازے کسی گئیں۔ نہ شراب کے نشے میں آداب محفل بھولے گئے۔ ویسے بھی یہ بات تھی کہ ان کے غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود گھر میں 'گھر پن' تھا۔ انور اور ماں جی کی وجہ سے ایک گھریلو فضا بنی رہتی تھی۔ شاعروں ادیبوں کی محفل میں انور بہت کم آکر بیٹھتی تھی، صرف کھلانے پلانے کے انتظام میں ہی لگی رہتی تھی، لیکن گھر میں ماں بہن ہونے سے کسی بھی آنے والی خاتون کو اجنبیت یا ڈر کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ مردوں کی محفل ایک طرف سج جاتی اور

عورتیں ایک طرف ہو جاتیں۔ ان میں ماں جی بھی کبھی کبھار آ کر بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر کے لئے انور بھی آ کے بیٹھتی لیکن پھر کسی نہ کسی کام سے اٹھ اٹھ کر جاتی رہتی۔ ساحر صاحب بھی عورتوں کی محفل کی طرف پھیرے لگاتے رہتے اور مخصوص انداز سے مذاق کرتے رہتے۔

ساحر صاحب کے اللہ میاں سے ذرا 'غیر دوستانہ' مراسم تھے۔ میں کہیں بھی جاؤں نماز کا وقت ہو جائے فوراً پڑھ لیتی ہوں۔ ایک بار ان کے یہاں صرف فرش دیکھ کر یوں ہی کونے میں بغیر جانماز کے پڑھنے لگی۔ کھرّے فرش پر مجھے نماز پڑھتا دیکھ کر بہت بھنائے۔ اس کے بعد سے ہمیشہ انور سے کہہ کے صاف چادر نکلوا کے دیتے تھے۔ لیکن اللہ میاں سے کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی۔ ایک بار ان کے یہاں بہت بڑا ادبی فنکشن تھا۔ بے حد لوگ۔ لائٹ چلی گئی۔ اتفاق سے میں اسی وقت نماز کے لئے چادر بچھا رہی تھی۔ میں نے ساحر صاحب سے کہا، دیکھئے گا نماز کی برکت... اور میں دعا کروں گی تو اجالا ہو جائے گا انشا اللہ۔'' خدا کا کرنا، میں نے نماز ختم کی، واقعی لائٹ آنے کے لئے دعا کی اور لائٹ آ گئی۔ میں نے ساحر صاحب کو ہنس کر مخاطب کیا۔

''دیکھئے ساحر صاحب میں نے جانماز تہہ کی اور لائٹ آ گئی۔'' ساحر صاحب برجستہ بولے۔ ''تم نے جانماز تہہ کی، تب لائٹ آئی۔''

ٹیپو بچپن میں بے حد بیمار رہتا تھا۔ ساحر صاحب ہمیشہ اس کی خیریت پوچھتے تھے۔

''اب اللہ کے فضل سے بہت اچھا ہے۔''

''اور بیمار کس کے فضل سے ہوا تھا۔'' وہ ہنس کر پوچھتے۔

ساحر صاحب کے یہاں بھی لوگ بے گنتی بار جاتے۔ وہ خود بہت کم کسی کے گھر جاتے۔ ایک بار میرے گھر آئے تو خوب سارے بچے ماشا اللہ میرے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔

''کیسی ہو بھئی!'' انہوں نے ہنس کر پوچھا۔

''اللہ کا فضل ہے ساحر صاحب۔''

انہوں نے بچوں پر نظریں گھمائیں اور زور سے ہنس کر بولے۔ ''اللہ کا فضل تو میں ضرورت سے زیادہ ہی دیکھ رہا ہوں۔'' مجھے ان کے آنے پر سخت حیرت تھی۔ بولے ''بھئی بچے تو پیدا کر لئے۔ اب ایک آدھ فلمی کہانی پیدا کرو۔'' پھر تفصیل سنانے لگے کہ ایک پروڈیوسر ہیں وہ خالص مسلم سوشل فلم بنانا چاہ رہے ہیں۔ بمبئی کی زبان میں کوئی دھانسو کہانی لکھو جس میں قوالیوں اور غزلوں اور میوزک کی خوب گنجائش ہو۔ کہانی تمہاری ہوگی۔ ظاہر ہے گیت، غزلیں، قوالیاں ساحر کی۔'' اختر بھائی بھی اس دن ساتھ تھے۔ بہر حال میری بدنصیبی کہ

ساحر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ بقول ساحر صاحب کے "اللہ کا فضل" کی زیادتی کی وجہ سے فلموں میں آج تک بھی انٹری نہ ہو پائی۔ اب چاہے کبھی بھی ہو، وہ بات ہی اور ہوتی۔ کہانی واجدہ تبسم، مکالمے واجدہ تبسم، گیت ساحر لدھیانوی۔

ایسا پیارا شاعر، ایسا عظیم گیت کار، ایسا فی البدیہہ اور Impromptu ذہن۔

ساحر صاحب کے ہاں فراق گورکھ پوری آئے ہوئے تھے۔ فراق صاحب مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ کبھی آتے، کہیں ٹھہرتے، بھلے ساحر صاحب کے یہاں۔ یا نگم صاحب کے یہاں۔ مجھے ضرور اطلاع دلواتے۔ بلاتے۔ کھانا پینا، (پینا زیادہ) زوروں پر چل رہا تھا۔ سب بڑی ترنگ میں تھے۔ میں نے فراق صاحب سے کہا۔ "فراق صاحب پڑھتی بہت ہوں، تجربہ کبھی نہیں ہوا سننے کا، کہ شاعر لوگ فی البدیہہ شعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں تو تب مانوں کہ آپ مجھ پر کوئی شعر ابھی اور اسی وقت کہیں۔"

ابھی میری بات میرے منہ میں ہی تھی کہ فراق صاحب نے فوراً کہا:

تبسم سے حماقت ہو گئی ہے

ساحر صاحب نے دوسرے لمحے مصرع لگایا:

اسے جس پر ندامت ہو گئی ہے

کھانا لگا تو میں نے سب سے پہلے چاول لئے۔

عصمت آپا مجھے موٹاپے پر ہمیشہ ٹوکتی رہتی ہیں، لیکن سلطانہ آپا دو قدم آگے ہی ہیں۔ اتنے چاول مت کھایا کر، زیادہ موٹی ہو گئی تو اشفاق گھر سے نکال پھینکے گا۔

میں ہنس کر بولی "آپا چاول تو میں کبھی نہیں چھوڑنے والی۔ میں اپنے ہر انٹرویو میں پسندیدہ چیزوں میں چار ہی چیزیں تو لکھواتی ہوں۔ اشو، بچے، لپ اسٹک اور چاول۔ اور یہ دیکھئے میری پسند جو چاول ہے نا تو کیسی نادر اور بے مثال ہے کہ یہاں فراق صاحب، ساحر صاحب، سردار بھائی، اختر بھائی، کیفی صاحب جیسے شعرا موجود ہیں، کوئی بھی مجھے چاول کا قافیہ بتا دے تو میں مانوں۔"

اب سب، اور سب سے زیادہ فراق صاحب اور ساحر صاحب چاول کا قافیہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہراول، رساول، حد یہ کہ بھساول تک سوچا گیا۔ مگر خود ہی رد کرتے گئے۔ اس کے بعد جب کبھی ساحر صاحب سے ملاقات ہوتی تو یہ بات ضرور نکالتے اور ہنس کر کہتے۔

"ارے بھئی واجدہ! ہم اور فراق صاحب کوشش میں لگے ہوئے ہیں تمہارے چاول گلانے کی۔"

یہ اعلیٰ ظرفی تھی۔

کسر نفسی میں بھی ان کا ثانی کوئی نہ تھا۔

شراب پی کر تر نگ میں تو سبھی لوگ ہو جاتے ہیں۔ قے کریں گے غلاظت کریں گے وہ الگ۔ زبانی اول فول کا تو حساب ہی نہیں۔ ہم گنہ گار میاں بی بی کو ایسے پارساؤں کی محفلوں میں جانے کے ہزاروں موقع ملے ساحر صاحب کی ہی نہیں اور بھی کئی محفلوں میں۔ لیکن میں نے اپنی زندگی میں ساحر صاحب کو آؤٹ ہوتے نہیں دیکھا۔ کتنے بھی پیگ پی لیتے وہ کبھی نہ بہکتے۔ ہاں باتوں کی رفتار میں تیزی اور بہتات ضرور آجاتی۔ قصہ پر قصہ سناتے چلے جاتے۔ لیکن محفل میں موجود خواتین سے کبھی بدتمیزی یا بے ہودگی نہیں کی۔ ایک بار شعرا کی پینے کی محفل اتنی دیر چلی کہ وہ سب لوگ اکتا گئے جو شراب نہیں پیتے تھے، بھوک سے بے حال ہونے لگے۔ انور سخت پریشان کہ بھائی جان کہیں تو کھانا لگاؤں۔ میں نے انور سے کہا ''انور تو کھانا لگا دے، ساحر صاحب کے ہاتھ سے گلاس میں رکھوا دوں گی۔''

انور ڈر کے بولی۔ ''نہیں آپا۔ بھائی جان غصہ ہو جائیں گے۔ آپ کو کچھ کہہ دیں گے تو مجھے بھی برا لگے گا۔'' میں ساحر صاحب کے پاس گئی ــــ وہ گلاس اٹھا کر منہ تک لے جا رہے تھے ــــ میں نے کہا ''ساحر صاحب شراب کا پینا تو حرام ہے ہی، چھونا بھی حرام ہے، ورنہ ابھی آپ کے ہاتھ سے یہ گلاس خود لے کر پھینک دیتی ــــ آپ کا یہ چھٹا گلاس چل رہا ہے۔ آخر اور کتنی پئیں گے۔ آخر ہمیں بھی تو بھوک لگی ہے۔''

ساحر صاحب نے بہت غور سے دیکھا۔ گلاس میز پر واپس رکھ دیا۔ جھومتے ہوئے اٹھے اور بولے۔ ''ٹھیک کہتی ہے۔ روٹی بھی تو کھانا ہے! خواتین چلو کھانا کھالو۔''

جب گھر میں مرد زیادہ ہوتے اور صرف میں انور اور ماں جی ہوتیں تو ساحر صاحب ہم تینوں کو ہمیشہ خوا۔ تین (3) کہتے اور خود ہی بے حد انجوائے کرتے۔ اپنے بعض جوکس وہ دوسروں سے زیادہ خود انجوائے کرتے۔ ایک بار پاکستان سے ایک مشہور شاعر آ کے ساحر صاحب کے مہمان ہوئے۔ کافی دن ٹھہرے۔ کبھی کی دعوتیں کرتے تھے، وہ، پاکستانی شاعر کی تو بہت ہی خاطر ہوئیں۔ ان کے اعزاز میں جو ایک شاندار دعوت کی تو ممبئی کے ادیبوں، شاعروں کے علاوہ بہت سارے فلمی لوگ، بزنس مین وغیرہ بھی آئے۔ مہمان شاعر نے خوب شراب پی۔ خوب قے کی، بیحد غلاظت کی، خوب کھانا کھایا۔ اور سب سے آخر میں بیحد شاعری سنائے جا رہے ہیں۔ غزل پیچھے غزل، غزل پیچھے غزل، سارے مقامی مہمان چلے گئے۔ بس صرف میں اشو اور گھر والے رہ گئے۔ اس دن بھی ساحر صاحب نے ہمیں گھر واپس نہیں آنے دیا۔ مہمان شاعر سے ذرا سا چھٹکارا پا کر ہمارے کمرے میں آئے اور بیحد مزے لے لے کر ہنس ہنس کر کہہ رہے ہیں۔

''کم بختوں کو اپنے گھر ٹھہراؤ، شراب پلاؤ، کھانا کھلاؤ، غلاظت سمیٹو، اوپر سے شاعری سنو۔''

ہر انسان میں خامیاں ہوتی ہیں۔ بے عیب ذات اس پاک پروردگار کی ہے۔ ساحر صاحب میں بھی خامیاں رہی ہوں گی، لیکن مجھے کبھی نظر نہیں آئیں اور اس لئے نظر نہیں آئیں کہ انہوں نے اتنی محبت اور شفقت مجھے دی کہ اس میں نفرت کو کھوجنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ ورنہ ساحر صاحب سے میری کبھی ذرا تو کھٹ پٹ ہوتی۔ ماشاءاللہ بمبئی میں آج جتنے بھی ادیب اور شاعر ہیں، تقریباً سب سے جھگڑ چکی (یہ اور بات ہے کہ مل بھی چکی) لیکن جب میں یہ کہتی ہوں کہ لڑ چکی تو مطلب یہ کہ جوابی کارروائی بھی تو ہوئی ہی ہوگی۔ چلئے یہ بھی مانا کہ زیادتی میری طرف سے ہوئی ہوگی، تب بھی دوسری پارٹی بھی تو تھوڑی بہت جنگجو رہی ہوگی۔ یہ عجیب وغریب بات ہے کہ 23 سال بمبئی میں رہنے کو پورے ہوئے بفضل خدا چوبیں واں لگ جائے گا۔ بیس سال میں ساحر صاحب سے ایک دفعہ بھی خرابی نہیں ہوئی۔ لڑائی تو دور کی بات ہے۔

جو بھی لوگ ساحر صاحب کو ان کی زندگی میں برا کہتے رہے اور خاص طور سے میرے سامنے برا کہتے رہے، میں نے ان سے یہی بات کہی۔ "ایک شخص جس نے شادی کی، نہ بیوی کی قربت میسر آئی، نہ ازدواجی زندگی کا سکھ دیکھا، نہ بچوں کی جنت کے مزے لوٹے، اس کی محرومیوں کے بارے میں بھی تو سوچو۔ اگر یہ شخص اپنی ہی تقدیر لکھنے پر قادر ہوتا۔ اپنا کاتب تقدیر آپ ہوتا تو ہر مرد، ہر عورت، ہر انسان، اپنے آپ کو بے حد خوب صورت بناتا، بے حد تعلیم یافتہ بناتا، بے حد امیر بناتا۔ بے حد اچھا جیون ساتھی چنتا، خوب اولاد، خاص طور سے بیٹے اپنے لئے چنتا، لیکن ہم سب کسی اور کے قلم کا لکھا پورا کر رہے ہیں۔ اچھے سے کر رہے ہیں، یا برے سے کر رہے ہیں، بہر حال زندگی کو گذار رہے ہیں تو کتنے عظیم ہیں وہ لوگ، جو اپنی محرومیوں کے باوجود دوسروں کے لئے جئیں۔" ساحر صاحب اپنے لئے کیا جئے؟ وہ تو ہمیں لوگوں کے لئے جئے، عوام کے لئے جئے۔ سب کے لئے جئے۔ اپنے دل کا خون قلم کی نب میں سیاہی کی جگہ لگا کر، ہم لوگوں کے لئے ہی لکھتے رہے۔ آج بھی ان کے گیت، ان کی غزلیں، ان کے نغمے احساس دلاتے ہیں کہ وہ ہمارے تھے، ہمارے ہی رہیں گے۔ تین سال پہلے ساؤتھ امریکہ کی اس خون رلا دینے والی، ٹھنڈی، برفیلی اور بے رحم رات کے پچھلے پہر تک میں روتی رہی۔ وہ صاف ستھرا انسان، جو انتہائی اعلیٰ نفیس اور صاف لباس زیب تن کرتا تھا۔ آج منوں مٹی اور دھول کے انبار تلے دبا پڑا ہوا۔ جس کے محل نما فلیٹ میں فانوس جلتے تھے، آج اس کی قبر پر کسی نے ایک چراغ بھی روشن کیا ہوگا؟ وہ ہمیشہ لوگوں کے ہجوم میں گھرا رہتا تھا، کیا آج اکیلا ہی سویا پڑا ہوگا؟

کھڑکی کے شیشے سے میں نے جھانک کر دیکھا۔ آسماں چپ تھا، چاند تھا ہی نہیں۔ چاند کو ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔ آج وہ جگمگاتا چاند منوں مٹی کے نیچے ڈوب گیا تھا، جو برسوں سے دلوں کے تاریک آسمانوں پر اپنی کرنوں سے اجالے بکھیرے ہوئے تھا۔ ■■

اسیم کاویانی، ممبئی

ساحرلدھیانوی کی حیات وفن پر ایک نظر

ساحرلدھیانوی پر لکھی چند تحریروں پر ایک نظر:

ساحر کی شخصیت اور شاعری کے سلسلے میں قدر اول کے محققوں اور نقادوں نے بہت کم لکھا ہے۔ ساحر کے پرستاروں اور چند نوجوان محققوں نے کافی کچھ لکھا ہے، سحر کی زندگی اور فن کے تعلق سے لکھی ایسی ہی چند مشہور کتابوں اور خاص نمبروں کے سرسری مطالعے کے نتیجے میں کئی غلط بیانیاں، تحقیقی تضاد اور ناقص تبصرے سامنے آئے ہیں۔ انہیں یہاں اس لیے پیش کیا جارہا ہے کہ ساحر کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے ان کی شخصیت اور شاعری کی زیادہ واضح اور حقیقت افروز تصویر سامنے آسکے۔

'فن وشخصیت' کے ساحرلدھیانوی نمبر (مطبوعہ 1985ء) میں سی ایل کاوش کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ ساحر کا باپ اس کی ماں پر گیارہ سوتیں لا چکا تھا۔ (مضمون: انارکلی سے پرچھائیاں تک، ص:109) ساحر کے سوانح نگاروں نے عام طور پر یہ لکھا ہے اولادِ نرینہ سے محروم ہونے کی بنا پر چودھری فضل محمد ذیل دار یکے بعد دیگرے شادیاں کرتا گیا، جب کہ اس چکر میں اس کے قطعات زمین اس کے قرض خواہوں کے ہتھے چڑھتے گئے۔ چند ایک نے لکھا کہ کشمیری النسل سردار بیگم چودھری فضل محمد کی گیارھویں بیوی تھی کہ جس سے اولاد نرینہ کی چاہ میں بہت سی درگاہوں اور خانقاہوں پر حاضری دی گئی تھی۔ اسی ذیل میں درگاہ صابر کلیری کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ چودھری فضل محمد اپنی واحد اولادنرینہ کا نام، جو اس نے بہت منتوں اور مرادوں کے بعد پائی تھی، کیا اپنے دشمن پڑوسی عبدالحئی کے نام پر اس مقصد سے اختیار کرسکتا تھا کہ وہ اس بہانے اپنے بیٹے کا نام پکار پکار کر اپنے پڑوسی کو گالیاں دیا کرے گا اور اس طرح اپنے دشمن کو زک پہنچانے کے جذبے کی تسکین کیا کرے گا! ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا زیب داستان کے لیے حمید اختر نے جوڑا ہے۔ (بحوالہ آشنائیاں کیا کیا) ہمیں ساحر کی حیات میں ساحر پر (ایم اے کا) مقالہ لکھنے والی ناز صدیقی کا یہ بیان قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ساحر کے والد ہی نے ان کا نام قرآن شریف میں دیکھ کر عبدالحئی تجویز کیا تھا۔ اسی خاص نمبر میں محمود ایوبی کے مضمون میں انور سلطانہ کا یہ بیان بھی گمراہ کن ہے کہ 1948ء میں ساحر کی مقبولیت سے کیفی اعظمی کو یہ خطرہ منڈلانے لگا تھا کہ ساحر کہیں گیت لکھتے لکھتے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر نہ

بن جائیں۔(ص:45) چونکہ 1948ء میں ساحر دہلی میں ''شاہراہ'' کی ادارت کر رہے تھے 1949ء کے آخر میں دہلی چھوڑ کر بمبئی آئے تو وہ خود پاؤں جمانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے تھے، ایسے میں وہ کسی کے لیے خطرہ کیا بنتے! 1950ء میں بنی فلم ''بازی'' میں ایس ڈی برمن کی دھنوں پر بنے اپنے نغموں سے انھوں نے پہلی بار ہندی فلم میں کامیابی کا منہ دیکھا تھا۔

ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں، عدالت میں ساحر کی خواہش کے بموجب ان کی custody ان کی والدہ کو سونپے جانے کے وقت ساحر کی عمر دس برس تحریر کی ہے۔ ان کی تحقیق کے پیش نظر حفیظ لدھیانوی اور انیس امروہوی وغیرہ کی تحریروں میں سات برس کی عمر کا قیاس قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اظہر جاوید نے اپنی کتاب ''ناکام محبت'' (تخلیق کار پبلشرز: 2007ء اڈیشن) میں لکھا ہے کہ ساحر نے ایک ہندی فلم ساز پر اس لیے مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ اس نے ساحر کی اجازت کے بنا اپنی فلم میں ان کی نظم ''تاج محل'' استعمال کی تھی۔ اظہر کے بقول ساحر نے پچاس ہزار روپے کا دعوا کیا تھا اور ساحر کو یہ مقدمہ ان کے وکیل راجیندر پرشاد نے جتایا تھا، جو کہ بعد میں بھارت کے صدر بھی بنے تھے، (ص:118،117) ان کا یہ بیان ہندستانی اُمور پر پاکستان کے لکھنے والوں کی کم علمی کا افسوس ناک نمونہ ہے۔ ڈاکٹر راجیندر پرشاد اپنی وکالت 1920ء ہی میں ترک کر کے گاندھی جی کے تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور وہ 1950ء میں جمہوریہ ہند کے پہلے صدر بنے تھے۔ ساحر کی نظم ''تاج محل'' جس فلم میں استعمال کی گئی تھی، اس فلم کا نام ''غزل ہے''، جو کہ 1964ء میں ری لیز ہوئی تھی۔ اظہر جاوید کی کتاب اپنے کئی بے بنیاد مندرجات کی بنیاد پر غیر معتبر نظر آتی ہے۔ مثلاً فلم ''مجھے جینے دو'' کے لیے ساحر کی لوری (ع ترے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں) سے متاثر ہونے والے ڈاکو مان سنگھ کا قصہ کہ جب ساحر اپنا پدم شری کا ایوارڈ لینے کے لیے اپنے اہل خاندان کے ساتھ کار میں دہلی جا رہے تھے تو راہ میں ڈاکو مان سنگھ نے انھیں روک کر اپنا مہمان بنایا تھا، شاہانہ خاطر داری کی تھی اور ان کے لکھے نغموں کی داد دی تھی (ناکام محبت، ص:146)۔ ایک نامور ڈاکو کے حوالے سے یہ کہانی حمید اختر نے بھی اپنی کتاب ''آشنائیاں کیا کیا'' میں درج کی ہے۔ یہ قصہ سراسر بے بنیاد ہے، اس لیے کہ ڈاکو مان سنگھ جو 1939ء تا 1955ء کے درمیان میں 1112 ڈکیتوں اور 185 ہلاکتوں میں ملوث تھا، وہ 1955ء میں بھنڈ (مدھیہ پردیش) کے ایک گانو میں گورکھا سپاہیوں کے ایک دستے کے ہاتھوں اپنے بیٹے صوبیدار سنگھ کے ساتھ اُس وقت ہلاک کر دیا گیا تھا، جب وہ دونوں ایک برگد کے پیڑ کے تلے سوئے ہوئے تھے، اور ساحر کے نغموں سے سجی سنیل دت کی فلم ''مجھے جینے دو'' 1963ء میں ری لیز ہوئی تھی۔ ان کے اس دعوے کی بھی کوئی حقیقت نہیں کہ ساحر جب تک فلم رائٹرس ایسوسی ایشن اور فلم فیڈریشن کے صدر رہے، انھوں نے فلموں کے سنسر

سرٹیفیکٹ پر ہندی زبان کی فلم کی جگہ اردو زبان کی فلم درج کرایا۔

لاہور اور امرت سر کے درمیان ایک صلح کل مشرب کے سادھو سردار گورو بخش سنگھ کی بسائی ہوئی ایک بستی ''پریت نگر'' تھی۔ جہاں پر لوگوں کو رنگ، نسل، ذات، مذہب سے اوپر اٹھ کر ایک دوسرے سے اخوت ومحبت کا سلوک کرنے کا درس دیا جاتا تھا۔''پریت نگر'' سے ایک جریدہ 'پریت لڑی' اردو، ہندی اور پنجابی (نہ کہ انگریزی، جیسا کہ تیسری زبان کے طور پر اظہر جاوید نے لکھا ہے، ص:62) زبانوں میں چھپتا تھا۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس پریت نگر کے متوالوں میں بھیشم ساہنی، بلراج ساہنی، بلونت گارگی، جگجیت سنگھ اروڑا (لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا بنگلا دیش کی آزادی کی جنگ میں انڈین آرمی کے مشرقی کمانڈر تھے۔) شوبھا سنگھ (آرٹسٹ)، کرتار سنگھ دگل جیسے لوگوں کے ساتھ ساتھ ساحر اور امرتا پریتم بھی شامل تھے، اور ان کی پہلی ملاقات 1944ء میں 'پریت نگر' ہی میں ہوئی تھی۔ اسی سال ساحر 'ادب لطیف' کے مدیر بنے تھے اور امرتا کی پنجابی نظموں کا اردو ترجمہ اپنے جریدے میں شائع کر رہے تھے۔ کلام ایں جاست کہ اظہر جاوید نے لکھا ہے کہ امرتا کی اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ بلونت سنگھ کی زبان مین ڈبل ڈوز سکھنی تھی (ص:62) جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امرت کور (پیدائش:1919ء) کی شادی سولہ سال ہی کی عمر میں پریتم سنگھ کو اترا سے ہو چکی تھی، جو کہ ایک متمول اور آزاد خیال شخص تھا۔ اپنی شادی کے بعد امرت کور نے اپنا نام امرتا پریتم رکھ لیا تھا۔ انیس امروہوی نے ساحر پر لکھے اپنے خاکے میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں بی اے کے سال اول میں جس لڑکی کے عشق کی پاداش میں ساحر کے کالج سے نکالے جانے کا ذکر کیا ہے، وہ ایشور کور تھی اور وہ بھی کالج سے نکالی گئی تھی اور اس کا باپ زمین دار تھا جیسا کہ ساحر کے ہم جلیسوں مثلاً حفیظ لدھیانوی وغیرہ نے بیان کیا ہے نہ کہ وہ کالج کے پرنسپل کی بیٹی تھی جیسا کہ انیس صاحب نے بیان کیا ہے (وہ بھی کیا زمانہ تھا: ص 221) ان کا یہ قیاس بھی غلط ہے کہ 1948ء میں جب دہلی میں ساحر 'شاہراہ' کے مدیر تھے، (ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے 1949ء کا سال لکھا ہے۔) تب ساحر سے امرتا کی دوستی میں شدت آ گئی تھی اور شاید اسی زمانے میں ان کی اپنے شوہر پریتم سنگھ سے علاحدگی ہوگئی تھی (وہ بھی کیا زمانہ تھا ص:224)۔ سچائی یہ ہے کہ امرتا پریتم نے سردار پریتم سنگھ کو اترا کے ساتھ پچیس سال تک ازدواجی زندگی کا لطف اٹھایا اور 1960ء میں وہ دونوں الگ ہوگئے۔ انیس صاحب کا یہ بیان بھی محل نظر ہے اور اس کا ماخذ غالباً ڈاکٹر انور ظہیر کا مقالہ ہے کہ 'شاہراہ' کی ادارت کے زمانے میں 1948ء میں ساحر 'پریت لڑی' کی ادارت بھی کر رہے تھے (وہ بھی کیا زمانہ تھا، ص:224) جب کہ صحیح یہ ہے کہ لاہور میں 1944ء میں 'نیا ادب' کی ادارت کے زمانے میں وہ ''پریت لڑی'' کی ادارت سے بھی منسلک تھے اور اس بات کو یوں بھی تقویت ملتی ہے کہ ''تلخیاں'' کا پہلا

اڈیشن اسی سال 'پریت نگر بک شاپ' لاہور نے شائع کیا تھا۔ اسی طرح ساحر نے اپنی مشہور نظم "ع چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں" شام ساحرؔ کے نام سے منعقد ایک محفل میں سدھا ملہوترا کی موجودگی میں سنائی تھی ، نہ کہ سدھا کے منگنی کے فلمی سین میں جو کہ انیس صاحب کے زور قلم نے پیش کیا ہے۔ (ایضاً ص:228)

ڈاکٹر انور ظہیر انصاری صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے (ساحر لدھیانوی ، حیات اور کارنامے: مطبوعہ 2004ء) میں ساحر کے سوانحی حالات کو بمشکل پچیس صفحات میں پیش کیا ہے اور بقیہ تین ابواب میں ساحر کی شاعری پر بحث ہے۔ اس مقالے کی اشاعت کے وقت جو چار ابواب حذف کر دیے گئے تھے، ان کا تعلق موضوع کی بہ نسبت موضوع کے پس نظر سے زیادہ تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک قابل محقق نے اصل موضوع سے کہیں زیادہ متعلقات موضوع پر اپنی تحقیق کا زور صرف کر دیا۔ اس لیے خاص طور پر ساحر کے حالات زندگی کے حصے میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر انور ظہیر انصاری اپنی کتاب کے ص:19 پر رقم طراز ہیں۔

"اس انقلابی دور میں حکومت کی طرف سے پریس پر شدت کے ساتھ پابندی لگائی جا رہی تھی اور نہ صرف شعرا و ادبا کی تخلیقات ہی ضبط کی جا رہی تھیں بلکہ رسائل و جرائد پر بھی ان ضابطوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' و 'البلاغ' اور ترقی پسند رجحانات کے نقیب 'نیا ادب' کے شماروں کا حشر محتاج بیان نہیں۔ ایسی صورت میں ساحر جیسے جذباتی شاعر کی انقلابی نظمیں شائع کرنا گویا گھر بیٹھے مصیبت مول لینا تھا۔"

یہ ذکر ہے 1938ء گورنمنٹ کالج لدھیانا میں ساحر کے زمانۂ تعلیم کا، جب ساحر مختلف رسائل و جرائد میں اپنی نیم انقلابی نیم رومانی نظموں کی اشاعت کی کوشش کرنے لگے تھے۔ میں یہاں پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ 'الہلال' و 'البلاغ' کا زمانہ ربع صدی قبل کا ہے اور اس مقام پر 'نیا ادب' کے ساتھ مولانا آزاد کے اس جرائد کا ذکر قطعاً غیر ضروری ہے۔

اپنی اسی کتاب میں انصاری صاحب نے ساحر کی فلمی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ساحر کے گیت 'ع یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے' کی ادبی و فکری اعتبار سے جو ستائش کی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اس گیت کے مقابل وہ 'ع بجر لاگی راجا تو ہے بنگلے پر' اور 'ع ان ہی لوگوں نے لی لینا دوپٹا میرا' جیسے مقبول اور اپنے ماحول اور منظرنامے کے عکاس گیتوں کو کاروباری نقطۂ نظر سے لکھے گئے اور ساقط المعیار ہونے کا اشارہ دیتے ہیں۔ (ص:196) انھیں اتنا تو خیال کرنا چاہیے تھا کہ ہر گیت اپنے موقع و محل اور کرداروں کے

جذبات کا ترجمان ہوتا ہے، اور ہر جگہ کوئی پیغام پہنچانا یا اُپدیش دینا ممکن نہیں ہوتا!

ساحر کی حیات اور شاعری کا پس منظر:

ساحر کے ماحول اور ان کے حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ قصہ نظر آتا ہے کہ طفلی کی نفسیاتی گرہوں نے زندگی بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ماں باپ کی تلخ اور بکھری ہوئی زندگی نے انھیں ازدواجی زندگی کے بارے میں ایک منفی نقطۂ نظر دیا۔ ان کی بیچلر لائف اس کا ثبوت ہے اور ان کی ایک ابتدائی نظم (خانہ آبادی) میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے۔

اپنی والدہ کی سرپرستی قبول کرنے کی بنا پر باپ کی دھمکیوں کی وجہ سے اور اس کے علاوہ ان کی ماں نے ساحر کے حق جائیداد کے لیے جو مقدمہ دائر کر رکھے تھے، ان جائیداوں اور اراضی کا استحصال کرنے والے حریفوں کے خطرے کے باعث ساحر کافی عرصے تک پاسبانوں کی نگرانی میں رہنے کے لیے مجبور ہوئے۔ اسی امر نے ان میں خوف یا ڈر کی نفسیات کو جنم دیا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی جان کے خوف نے زندگی بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اپنی موت کے خوف سے انھوں نے کبھی ہوائی سفر نہیں کیا اور زمینی سفر میں بھی ہمیشہ دو کاروں کو رکھتے رہے کہ ایک بیکار ہو جائے تو دوسری منزل پر پہنچا دے۔

ساحر نے اپنے سن شعور کی آنکھیں کھولیں تب جاگیرداری کی دم توڑتی ہوئی رعنائیوں اور لعنتوں کے اسیر ساحر کے باپ کا آمرانہ زعم رہا ہو یا لدھیانا کالج کے پرنسپل کی (انگریزی) سرکار پرستی کی فطرت یا مجبوری، ان دونوں رویوں کے مقابل ساحر نے انحراف و انکار کا جو رخ اپنایا تھا، وہی رخ ان کی شاعری میں باغیانہ لب و لہجے کا رجحان بن گیا۔ ان کے لدھیانا کالج سے نکالے جانے کی ایک وجہ ان کی طبع احرار پسند بھی تھی، جس کا ثبوت انھوں نے میوزک اینڈ ڈانس شو کی مخالفت میں نظم لکھ کر اور طلبہ کو اپنا ہم نوا بنا کر دیا تھا۔

ساحر لاہور گئے تو وہاں کے ادبی ماحول میں، بزرگ صحافیوں اور اپنے اشترا کی ساتھیوں کی صحبت میں انھیں اپنی سطحی رومانیت، اپنے ناپختہ سماجی نظریات، انقلاب کے افسانوی تصورات پر نظر ثانی کرنے اور انھیں ترقی دینے کا موقع ملا۔ اسی دور میں دوسری جنگ عظیم اور قحط بنگال کے سانحے رونما ہوئے سامراجیت نے اپنا پنجۂ تغلب سخت کیا۔ فلاکت و بے بسی نے اپنے پیر پھیلائے، نوجوانوں میں عام طور پر ماحول سے بیزاری، الحاد، سماجی بندھنوں کی گھٹن کے احساسات غالب تھے۔ کتنے ہی ایسے تھے کہ قدیم و جدید کی کشمکش میں پھنسے بے حسی کا شکار ہو رہے تھے۔

نالاں ہوں بیداریِ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی!

کچھ ایسے بھی تھے جو سوشلزم کے نیم پختہ تصورات کے سہارے رومانیت کی راہ سے بغاوت تک کے سپنے دیکھ رہے تھے۔ ساحر اور ان کے نہ جانے کتنے ہم عصر چھبیس ستائیس سال ہی کی عمر میں سامراجی جبریت، دوسری جنگ عظیم میں اپنے شریک جنگ وطن کے گھروں کی حرماں نصیبی، قحط بنگال، تقسیم وطن، اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے خوں چکاں فسادات، اس کے علاوہ تقسیم کے باعث نقل مکانی میں اپنے دیارِ جوانی (لاہور) کو ملک غیر کو حصہ بنتے دیکھنے کے کیسے کیسے اندوہ ناک اور جاں گسل مرحلوں سے گزر رہے تھے۔ قارئین ذرا ان کا دھیان کرلیں تو ساحر کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنا قطعی دشوار نہ ہوگا۔

یوں بھی ساحر کی شاعری بہت ہی واضح اور ابہام سے پاک ہے اور اس میں گہرائی، معنی آفرینی اور تہ داری کی تلاش فضول ہے کہ انھیں گفتگو عوام سے ہے، ہیئت کے اعتبار سے بھی دیکھیے تو ان کے کئی ہم عصرو ل (اختر الایمان، جاں نثار اختر اور میراجی وغیرہ) نے اپنی شاعری میں کچھ کامیاب اور قابل قدر تجربے کیے ہیں، لیکن ساحر نے بندھے ٹکے اسالیب سے ہٹنے کا بہت کم حوصلہ کیا۔

''تلخیاں''، کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ''تلخیاں''، کا پہلا اڈیشن ساحر نے ڈھائی سو کی تعداد میں چھپوا کر (روپیوں کی کمی بھی ایک وجہ تھی) دوستوں میں تقسیم کردیا تھا۔ (بحوالہ ''لاہور کا جو ذکر کیا'' از گوپال متل) پہلے اڈیشن کے اتنی جلدی ختم ہوجانے کی وجہ سے اس کی طلب بڑھی اور ساحر کو پروپیگنڈے کا یہ فن ہاتھ آگیا کہ وہ ہر بار چند سو کاپیاں شائع کرتے رہے۔ غرض کہ ان زندگی ہی میں ''تلخیاں''، کے پچیس اڈیشن اور کئی جعلی اڈیشن شائع ہونے کا یہی راز تھا۔

ان کی شاعری کے ادبی حسن نے فلمی گیتوں کو ایک نیا نکھار اور رعنائی بخشی۔ اپنے فلمی گیتوں ہی سے انھوں نے بے انتہا عزت، شہرت اور دولت پائی، دوسری طرف اس کا ایک منفی پہلو یہ رہا کہ ہمارے قدر اول کے نقادوں نے انھیں نظرانداز کردیا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ساحر، فیض کے نہایت کامیاب اور قریبی مقلد ہیں اور اپنے دور کے اختر شیرانی، ساغر نظامی، ماہر القادری، سلام مچھلی شہری جیسے درجنوں شعرا سے بہت آگے۔ جذبی، قتیل شفائی، مجاز اور شاہنامہ کے موضوعی تقدس کو الگ دھر کے دیکھیں تو حفیظ جالندھری سے بہتر ہیں۔ رومان اور انقلاب اس دور کی شاعری کے محبوب موضوع رہے ہیں اور اسے نت نئے رنگ و آہنگ سے پیش کرنے میں فیض و ساحر سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ ساحر نے فیض کے لہجے کے دھیمے پن اور نغمگی کو اپنایا۔ رومان اور روایت سے بغاوت کے جذبات کو اپنے مضامین میں سموتے رہے۔ ساحر کے یہاں انقلاب کا گہرا اور محدود سیاسی تصور سہی، لیکن وہ جوشؔ کی مصنوعی گھن گرج میں گھرے تصور انقلاب سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ مجازؔ کا ایک شعر ہے ۔

سچ تو یہ ہے مجاز کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے

سچ تو یہ ہے کہ مجاز ہی کیا رومان اس دور کے ہر شاعر کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، معصومیتِ حسن، تحیرِ عشق، نوعمری میں آغاز بلوغت کے جنسی اسرار، قربتوں اور فاصلوں سے جذبات کی دنیا میں اتھل پتھل ہو جانا، آرزومندیوں کا احتجاج، حرماں زدگیوں کے غم، محبت کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے حوصلے، جینے مرنے کے عہد و پیمان اور محبت کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ، خاندان، مذہب، ذات، حتّیٰ کہ خدا سے بھی بغاوت کے جذبات اور ناکامی و نامرادی ہاتھ آنے پر وحشت و شوریدگی کی پکار ع اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں!
کبھی ہماری زندگی ان سچے اور خالص جذبات سے عبارت ہوا کرتی تھی لیکن ہمارے عہد کی ترقیوں کی رفتار نے ہمارے ذہنی تحفظات کے وسوسوں نے اور مسائل کی ترجیحات کی مصلحتوں نے ہماری فکر کا رُخ موڑ دیا ہے، ہماری زندگی کا طور بدل دیا ہے اور ہم اپنے جذبات و احساسات کی وہ حسین دنیا نہ جانے کہاں چھوڑ آئے ہیں۔

ساحر کی شاعری اسی حسین دنیا کا دل کش مرقع ہے۔ اسے یاد کیے جانے کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ ہمیں دورِ حاضر کی بخشی ہوئی تمدنی آلات کی یورش میں مصنوعاتی زندگی کی میکانیکیت، مصلحتانہ زیست کی بے کیفی اور اس کے سیاسی تمدن کی جبریت کے بوجھوں تلے دبے اپنے ان نازک، سچے، اور خالص جذبات و احساسات کی دنیا کی مکمل موت کا اعلان منظور نہیں۔

ساحر کی شاعری:

1937ء میں عبدالحئی نے علامہ اقبال کے لکھے ہوئے مرثیۂ داغ کے اس شعر،

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

کو پڑھتے ہوئے اپنے لیے ''ساحر'' کا لفظ بطور تخلص چن لیا تھا اور پھر ساحر لدھیانوی کا نام جہاں اردو ادب میں ہزاروں شعری آوازوں کے درمیان اپنی ایک پہچان بنا لینے میں کامیاب ہو گیا وہیں فلمی دنیا میں بھی تقریباً ربع صدی تک ان کا جادو لوگوں کے سر چڑھ کر بولتا رہا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اپنے سارے کلام میں انھوں نے شاید ہی کہیں اپنا تخلص استعمال کیا ہے!

ساحر کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا باغیانہ لب و لہجہ ہے، مذہب کے تعلق سے یہ جا بجا ملحدانہ لے اختیار کر لیتا ہے۔ ساحر نے لدھیانا کالج کی گولڈن جوبلی کے موقع پر پڑھی گئی اپنی نظم میں، اس درس گاہ میں

پنپنے والے اپنے فکری میلانات کا یوں ذکر کیا ہے۔

یہیں جانچے تھے دھرم کے وشواس
یہیں پرکھے تھے دین کے اوہام
یہیں منکر بنے روایت کے
یہیں توڑے رواج کے اصنام

اس دور کے ان کے ساتھی حفیظ لدھیانوی نے بھی لکھا ہے کہ ساحر مذہب سے بیگانہ تھا، ملحدانہ خیالات کا حامل تھا۔ باغیانہ خیالات اور اشتراکی ذہن نے اسے بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔ ساحر کے درج ذیل اشعار، حفیظ لدھیانوی کے بیان کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہیں۔

عقاید وہم ہیں، مذہب خیال خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
ہر اک دور کا مذہب نیا خدا لایا
کریں تو ہم بھی مگر کس خدا کی بات کریں
بےزار ہے کنشت و کلیسا سے اِک جہاں
سوداگران دین کی سوداگری کی خیر
انسان الٹ رہا ہے رخ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمام فسوں پروری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہان نو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

اور جب لاہور میں ان کے شب و روز ترقی پسندوں کے ساتھ گزرنے لگے، قحط بنگال اور جنگ عظیم کی پیدا کردہ کساد بازاری سے لوگوں کی فلاکت و ادبار کے مناظر ساحر کے مشاہدے میں آئے تو انھوں نے ساحر کے الحاد کو اور صیقل کیا۔

من و سلوا کا زمانہ جا چکا
بھوک اور آفات کی باتیں کریں
آؤ پرکھیں دین کے اوہام کو
علم موجودات کی باتیں کریں

اور جب تقسیم وطن کے موقع پر فسادات کی موجِ خوں سر سے گزر گئی تو ان کے ملحدانہ نظریات اور راسخ ہو گئے:

مرا الحاد تو خیر اک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالم وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری
سزا کا حال سنائیں، جزا کی بات کریں
خدا ملا ہے جنھیں وہ خدا کی بات کریں
کون جانے یہ ترا شاعر آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

مندر و مسجد کو شر و فساد کا سبب سمجھتے ہوئے وہ اپنے مے خانے کی خیر مناتے ہیں۔ اپنے ایک نغمے میں وہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ آسمان پر خدا ہے تو وہ ہر طرف تباہی و بربادی کا دور دورہ دیکھ کر بھی اتنا غافل کیوں ہے!

بغض کی آگ نفرت کے شعلے، میکشوں تک پہنچنے نہ پائیں
فصل یہ مندروں، مسجدوں کی میکدوں کی زمینوں میں کیوں ہو!

آسمان پر ہے خدا اور زمین پر ہم
آج کل وہ اس طرف دیکھتا ہے کم
آج کل وہ کسی کو ٹوکتا نہیں
ہو رہی ہے لوٹ پاٹ پھٹ رہے ہیں بم

وہ عاشق و معشوق کے کرداروں کو منتہائے پرستیدگی کے مرکز خدا اور دیوتا سے نسبت دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔

مجھے دیوتا بنا کر تری چاہتوں نے لُوٹا
مرا پیار کہہ رہا ہے میں تجھے خدا بنا دوں

ان کی کلیات میں مجموعی طور پر ایک مذہب انسانیت کا جذبہ جاری و ساری ملتا ہے، اور وہی عظمتِ انسان کی کلید ہے۔ اس کے سامنے کسی بھی طرح کا افتراق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

رنگ اور نسل، ذات اور مذہب، جو بھی ہے آدمی سے کمتر ہے

اس حقیقت کو تم بھی میری طرح مان جاؤ تو کوئی بات بنے

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے۔

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

ساحر کے لکھے ہوئے فلم "چتر لیکھا" کے ایک نغمے کے اس شعر میں غالب کے فلسفے کی گونج سنی جا سکتی ہے۔

یہ پاپ ہے کیا یہ پُن ہے کیا، ریتوں پہ دھرم کی مہریں ہیں
ہر یگ میں بدلتے دھرموں کو کیسے آدرش بناؤ گے!

نریش کمار شاد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ساحر نے بتایا تھا کہ وہ اقبال کی شعری عظمت کے معترف ہیں اور انھیں صدی کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں، لیکن وہ ان کے نظریات کے قائل نہیں۔

علامہ اقبال کا مشہور زمانہ شعر ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ساحر نے اپنی نظم "ورثہ" میں ان کے نقطۂ نظر سے انحراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

جس سے دہقان کو روزی نہیں ملنے پاتی
میں نہ دوں گا تجھے وہ کھیت جلانے کا سبق
فصل باقی ہے تو تقسیم بدل سکتی ہے
فصل کی خاک سے کیا مانگے گا جمہور کا حق!

اسی نظم میں کسی طرح کے سیاسی یا نظریاتی احتجاج و اختلاف ظاہر کرنے کے لیے شہری تنصیبات اور سہولیات کو تباہ و تاراج کرنے والے تخریبی رویے کی مذمت میں یہ شعر بھی موجود ہے۔

پٹریاں ریل کی، سڑکوں کی بسیں، فون کے تار
تیری اور میری خطاؤں کی سزا کیوں بھگتیں!

ساحر نے اپنے زمانے میں بڑی طاقتوں، کی فریب کارانہ روش کو جس طرح اپنے ذیل کے شعروں میں پیش کیا تھا، کیا وہی نظارہ آج کے دور میں بھی ہمارے پیش نظر نہیں ہے!

تم ہی تجویز صلح لاتے ہو
تم ہی سامان جنگ بانٹتے ہو

تم ہی کرتے ہو قتل کا ماتم
تم ہی تیر و تفنگ بانٹتے ہو

ملک کے عوام کے لیے ہر طرح کے دستوری حقوق اور فلاحی سہولیتوں کے ہوتے ہوئے ارباب سیاست کے سست یا سازشی رویے یا ناکارہ پن کی بنا پر عوام کی کس مپرسی کی تلخ حقیقت کو ساحر نے دو آسان سے طنزیہ مصرعوں میں خوبی سے بیان کر دیا ہے۔

حکم سرکار کی پہنچ مت پوچھ
اہل سرکار تک نہیں پہنچا

ساحر کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جا بجا محاکات یا تجسیم مناظر کی کیفیت نظر آتی ہے، انتہائی موزوں، دل آویز اور حسین تشبیہات و استعارات کے ذریعے ان کی قدرت اظہار، رعنائی تخیل کے ایسے لمحوں اور نظاروں میں حرارت و حرکت تک پیدا کر دیتی ہے۔ آسان و رواں بحروں کا استعمال ان کے تاثر کی ترسیل میں مدد پہنچاتا ہے اور ان کا مرقع اشعار حسین مناظر اور لطیف کیفیات کی اسکرین بن جاتا ہے۔ چند مثالیں:

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سرمئی اجالا ہے چمپئی سویرا ہے
سرد ہوتی ہوئی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ
ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
سانسوں میں چھو رہی ہے کسی سانس کی مہک
دامن کو چھو رہا ہے کوئی ہاتھ کیا کریں
سرمگیں آنکھوں میں حسرتیں لَو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دِیے جلتے ہیں
ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیے
نیلگوں پردوں سے چھنتی ہیں شعائیں اب تک

ان کی نظم ''ایک منظر'' ساری ان ہی کیفیتوں کی حامل ہے۔

اُفق کے دریچوں سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مسکرائے

سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پراسرار لے میں رہٹ گنگنائے
حسین شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑے کے سائے
وہ دور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصور میں لاکھوں دیے جگمگائے

کہیں ان کے حسن بیان نے منظروں کو کیفیتوں میں بدل کر رکھ دیا ہے ۔

گیسوؤں کی چھانو میں دل نواز چہرے ہیں
یا حسیں دھندلکوں میں پھول ہیں چناروں کے

ع جس طرف سے بھی نظر ڈالو سہانی ہو تم

ترے ہاتھوں کی حرارت ترے سانسوں کی مہک
تیرتی رہتی ہیں احساس کی پہنائی میں
ڈھونڈتی رہتی ہیں تخیل کی بانہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

رات کے چہرے پہ اُبھرے ترے چہرے کو نقوش
وہی چپ چاپ سی آنکھیں وہی سادہ سی نظر
وہی ڈھلکا ہوا آنچل وہی رفتار کا خم
وہی رہ رہ کے لچکتا ہوا نازک پیکر

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

ساحر کے یہاں ایسے بہت سے اشعار مل جائیں گے جہاں انھوں نے اپنے دور کے لحاظ سے روایتی مضامین سے انحراف کیا ہے یا ان کے برعکس خیالات پیش کیے ہیں یا پھر انھوں نے اپنے احساسات کو بالکل نئے اور معنی خیز ڈھنگ سے پیش کیا ہے ۔

تمھارے عہد وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں
ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں
یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں
اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی
لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

ساحر کا کمال فن ذیل کے اشعار میں ظاہر ہوتا ہے جہاں انھوں نے دو مصرعوں میں توسیع خیال کے کیسے کیسے امکانات پرو دیے ہیں۔

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم
انہیں پتا بھی چلے اور وہ خفا بھی نہ ہوں
اس احتیاط سے کیا مدعا کی بات کہیں
چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم
نظر اٹھائی مگر ایسی بے یقینی سے
کہ جس طرح کوئی پیش نظر ملے نہ ملے
تو مسکرائی مگر مسکرا کے رک سی گئی
کہ مسکرانے سے غم کی خبر ملے نہ ملے

شاعر شب تاب :

ساحر کی سوانح میں کہیں مذکور ہے کہ ایک بار جوش ملیح آبادی صبح سویرے ان کے یہاں پہنچے۔ یہ پتا چلنے پر کہ ساحر اب تک سو کر نہیں اٹھے ہیں، انھوں نے انھیں اٹھوایا، پھر ثبوت حق کے لیے رسول کی بجائے صبح کو

کافی سمجھنے والے شاعر نے ساحر کی دیر خیزی کی عادت پر انہیں پھٹکار بھی سنائی۔ ہم نے ساحر کی کلام پر نظر دوڑائی تو وہاں پر ان کی شب فریفتہ شخصیت کا بھید کھلا۔ ساحر کے کل کلام (ادبی اور فلمی کے معتد بہ حصے کا 25% سے زیادہ) میں رات کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ رات کہیں سرمئی ہے، کہیں بھیگی بھیگی، کہیں برسات کی رات ہے تو کہیں رنگ اور نور کی بارات بن گئی ہے۔ کہیں چاند تاروں سے سجی ہوئی ہے تو کہیں اس میں ظلمت اور سیاہی کے سوا کچھ نہ رہا۔ یہ کہیں برہا کی رات بن گئی ہے تو کہیں اک حسینہ سے ملاقات کی رات میں بدل گئی ہے، اور ہمارا شاعر ان راتوں میں کہیں اپنے مقدر کی سحر کا منتظر ہے تو کہیں اپنے کل کے لیے خواب بن رہا ہے۔

غرض کہ رات کے تلازمے سے شام وسحر، ظلمت ونور، اندھیرا اجالا، چاندنی، چاند تارے، خواب، سپنے، نیند، آنکھ، نگاہ، نظر، چراغ جیسے الفاظ اور ان کے متعلقات ساحر کی شاعری میں جا بجا چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہم اس بات کو شاید درج ذیل مثالوں سے زیادہ اچھی طرح اور وضاحت سے سمجھ پائیں گے۔

☆ چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے، نیند کی گود میں جہاں چپ ہے، (انتظار) ☆ رات کی سرد خموشی کی جنوں خیز مہک، خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے، (شعاع راہ) ☆ اندھیری رات کے آنگن میں یہ صبح کے قدموں کی آہٹ (ایک واقعہ) ☆ اُف یہ بے درد سیاہی یہ ہوا کے جھونکے، کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو (خودکشی سے پہلے) ☆ افق روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو، شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے (احساس کامراں) ☆ رات کے خواب اجالے میں بیاں تو کردوں، ان حسین خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے (ہراس) ☆ طلوع صبح سے تاروں کو موت آتی ہے، شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے۔ ☆ یہ ہنگام وداع شب ہے اے ظلمت کے فرزندو، سحر کے دوش پہ گلنار پرچم ہم بھی دیکھیں گے (آواز آدم) ☆ صبح کے نور پہ تعزیر لگانے والے، شب کی سنگین سیاہی نے وفا مانگی ہے (بشرط استواری) ☆ کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا، مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم (غزل) ☆ وہ شخص مرگیا ہے جو ملنے کبھی کبھی، پچھلے پہر کے سر دستاروں میں آئے گا (جو لطف مے کشی ہے) ☆ دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا (بلاوا) ☆ آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر، دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسین خواب کیا ہوئے! (26 جنوری) ☆ کتنے خوابوں کے ملگجیں چہرے، کتنی یادوں کے مرمریں اجسام (اے نئی نسل) ساتھیو! میں نے برسوں تمھارے لیے، چاند تاروں بہاروں کے سپنے بُنے (آج) ☆ کہاں کا مہر منور کہاں کی تنویریں، کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی (نیا سفر ہے پرانے چراغ گُل کردو) ☆ پناہ لیتا ہے جن مجلسوں میں تیرہ نظام، وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں (لہو نذر دے رہی ہے حیات) ☆ مستقبل کی کرنیں بھی تھیں حال کی بوجھل ظلمت میں،

طوفانوں کا شور بھی تھا اور خوابوں کی شہنائی بھی (میرے گیت تمھارے ہیں) ☆ مچلتی امنگیں کہیں سو نہ جائیں، یہ سجیں یہ شامیں کہیں کھو نہ جائیں (عمر خیام، رقاصہ) ☆ یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا، اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا، ☆ دور رہ کر نہ کرو بات قریب آ جاؤ، یاد رہ جائے گی یہ رات قریب آ جاؤ۔ ☆ کشتی کا خاموش سفر ہے شام بھی ہے تنہائی بھی، دور کناروں پر بجتی ہے لہروں کی شہنائی بھی، ☆ یہ پربتوں کے دائرے یہ شام کا دھواں، ایسے میں کیوں نہ چھیڑ دیں دلوں کی داستاں ☆ راتیں قاتل صبحیں مجرم، ملزم ہے ہر شام، باہر سے چپ چاپ لگتا ہے اندر ہے کہرام، ☆ اس رات کی نکھری رنگت کو کچھ اور نکھر جانے دے ذرا، نظروں کو بہک جانے دے ذرا، زلفوں کو بکھر جانے دے ذرا ☆ تورا من درپن کہلائے، من اجیارا جب جب پھیلے جگ اجیارا ہو جائے، ☆ میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی، مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا ☆ اپنی دنیا پر صدیوں سے چھائی ہوئی ظلم اور لوٹ کی سنگ دل رات ہے، ☆ اُفق کے جھروکوں سے کرنوں نے جھانکا، فضا تن گئی راستے مسکرائے۔ یہ مثالیں محض ایک بار کی ورق گردانی کا نتیجہ ہیں اور غالباً اتنی ہی بکھری ہوئی مثالیں اور پیش کی جاسکتی ہیں علاوہ ازیں ساحر کی نظموں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن میں رات کے منظر نامے نے بنیادی کردار نبھایا ہے، مثلاً

مفاہمت:۔ اس نظم کا موضوع یہ ہے کہ باطل نے ساز باز یا مفاہمت سے فتح پائی ہے جسے شاعر نے ہزار شمع اُخوت بجھا کے چمکنے والے تیرگی کے ابھارے ہوئے حسین فانوسوں کے استعارے میں بیان کیا ہے۔

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی

متاعِ غیر:۔

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں

اس نظم میں شاعر نے اپنی محبوب کی چار دن کی رفاقت میں اپنی تمناؤں کی دنیا آباد کر لی ہے، جب کہ وہ متاعِ غیر ہے۔ خوابوں کے جھروکوں رنیند کے شبستانوں میں وہ اپنے محبوب کے پیکر خواب سے اپنی خواب کی تعبیر جاننے کا خواست گار ہے۔

شعاعِ فردا:۔

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لیے ترسے گا

پوری کی پوری نظم رات اور صبح ،تاریکی اور اجالے کے پردوں میں تہی دستوں اور درماندہ حالوں کی ستم رسیدگی اور ان میں صبح فردا کی امید جگانے کے تعلق سے ہے۔اس صبح فردا کے استعارے کا بھی اپنا حسن ہے۔

اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر

تیری آواز :۔ساحر اور لتا کے تعلقات کی یادگار اس مشہور نظم میں بھی رات نے بھر پور پس منظر فراہم کیا ہے؛

رات سنسان تھی بوجھل تھی فضا کی سانسیں
دیر تک آنکھوں میں چبھتی رہی تاروں کی چمک
رات کے چہرے پہ ابھرے تیرے چہرے کے نقوش
وہی چپ چاپ سی آنکھیں وہی سادہ سی نظر
ع تو نہ آئی مگر اس رات کی پہنائی میں

تو میرے پاس نہ تھی پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس میرے جسم کو چھو کر گزرا
اور نغموں میں چھپا کر مرے روٹھے ہوئے خواب
میری روٹھی ہوئی نیندوں کو منالائی ہے

میرے عہد کے حسینو!۔صدیوں سے ستاروں کے ساتھ وابستہ انسانی تصورات ،خواہشات ،روایتوں اور امکانوں کو شاعر نے اپنی اس نظم کے شعروں میں پرو دیا ہے:

وہ ستارے جن کی خاطر کئی بے قرار صدیاں
میری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جاگیں
کبھی رفعتوں پہ لپکیں ،کبھی وسعتوں سے الجھیں
کبھی سوگوار سوئیں ،کبھی نغمہ بار جاگیں

انتظار :۔ چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

اس نظم میں ایک سہانی رات کے خوابناک ماحول میں عاشق کے عالمِ انتظار کی مختلف کیفیتوں کا رومان انگیز

بیان ہے، جو کہ ساحر کا پسندیدہ موضوع ہے:

روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں
آ ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں

اشعار:۔ ذیل میں ساحر کے وہ چار مشہور شعر درج ہیں، جن میں انھوں نے انتہائی حسین و دل کش لفظوں کے دروبست سے تجسیم مناظر کی فن کاری اعلا نمونہ پیش کیا ہے۔ اردو شاعری میں ایسی دل نواز اور روح پرور کیفیتوں کی منظر نگاری کے نمونے کم ہی ملیں گے۔

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سرمئی اجالا ہے، چمپئی اندھیرا ہے
دونوں وقت ملتے ہیں دو دلوں کی صورت سے
آسماں نے خوش ہو کر رنگ سا بکھیرا ہے
ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگ جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے
کیوں نہ جذب ہو جائیں اس حسین نظارے میں
روشنی کا جھرمٹ ہے مستیوں نے گھیرا ہے

شکستِ زنداں کا خواب:۔ فیضؔ کے رنگ اور عنوان میں رنگی اس انقلابی نظم (چینی شاعر یانگ سو کے نام) کا آغاز شب و سحر کے حوالے سے ہوتا ہے۔

خبر نہیں کہ بلا خانہ سلاسل میں
تری حیات ستم آشنا پہ کیا گزری
خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں
تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری

اور آگے بھی صبحِ بہاراں اور خواب و حقیقت کے استعاروں نے نظم کی تعمیر میں مدد کی ہے۔

پرچھائیاں:۔ ساحر کے کلیات کی یہ طویل ترین اور شاہ کار نظم ایک رات ہی کے پس منظر میں شروع ہوتی ہے:۔

جوان رات کے سینے پر دودھیا آنچل

مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
اور یہ رات موقع موقع سے نت نئے عالم میں نمودار ہوتی ہے:
فضا میں گھل سے گئے ہیں اُفق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح

سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
ایک لہو میں لتھڑی ہوئی شام میں محبوبہ کے بھائی کا جنگ میں کام آنا اور عاشق کے سپنے بنتی محبوبہ کا پرائے ہاتھوں میں جا پڑنا جیسے کئی دل گرفتہ مناظر کی تصویر کشی میں رات کے استعاروں نے مدد دی ہے۔

آؤ کہ کوئی خواب بنیں:
آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسین خواب بن سکیں
شاعر موجودہ دور کے مصائب و مسائل کو ایک مہیب رات کے مشابہ قرار دے کر کل کے لیے اپنے میدان عمل کی اساس اپنے خوابوں کو قرار دینا چاہتا ہے، چونکہ ـ
یہ خواب مر گئے تو بے رنگ ہے حیات
یوں جیسے کہ دست تہ سنگ ہے حیات
ہراس:۔ ایک اجنبی نے شہر میں محبوب پایا ہے، اور وہ اس کے لطف و عنایت میں گم ہے:
تیرے پیراہن رنگین کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کی سرد خموشی میں ہر اک جھونکے سے
تیرے انفاس ترے جسم کی آنچ آتی ہے

اس کے ساتھ ہی وہ اجنبی مذبذب بھی ہے۔

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو!

علاوہ ازیں ان نغموں کی تخلیق میں بھی جزوی یا کلی طور پر رات ہی نے ماحول بنایا ہے اور اسی کے علائم و اشارات اور تشبیہات و استعارات نے نظم کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا ہے۔

☆ع آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

☆مجھے مل گیا بہانہ تیری دید کا، ایسی سجی رات میری، آنکھوں میں نام نہیں نیند کا

☆دور رہ کر نہ کرو بات قریب آجاؤ
یاد رہ جائے گی یہ رات قریب آجاؤ

☆ پگھلا ہے سونا دور گگن پر
پھیل رہے ہیں شام کے سائے

☆اتنی حسیں اتنی جواں رات کیا کریں
جاگے ہیں کچھ عجیب سے جذبات کیا کریں

☆رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی
چاند بھی ہے کچھ مدھم مدھم

☆ہر طرف حسن ہے جوانی ہے
آج کی رات کیا سہانی ہے

☆ع میں جاگوں ساری رات، سجن تم سو جاؤ

☆ پگھلی آگ سے ساغر بھر لے
کل مرنا ہے آج بھی مر لے
اب نہ کبھی یہ رات ڈھلے گی اب نہ کبھی جاگے گا سویرا
سوچ ہے کس کی، فکر ہے کس کی، اس دنیا میں کون ہے تیرا

☆رین گئی، بوجھل انکھین میں چبھنے لگے تارے
دیس میں میں پردیسن ہو گئی، جب سے پیا سدھارے
انتظار اور ابھی، اور ابھی، اور ابھی

بھور بھئی پر کوئی نہ آیا، سونی سیج سجانے
تارے ڈوبے، دیپک بجھ گئے، راکھ ہوئے پروانے
انتظار اور ابھی، اور ابھی، اور ابھی

☆ کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں

☆ سہاگ رات ہے گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں
سمٹ رہی ہے تو شرما کے اپنی بانہوں میں

☆ میرے پہلو میں تاروں نے دیکھا تمھیں
بھیگے بھیگے نظاروں نے دیکھا تمھیں
تم کو دیکھا کیے یہ زمین آسمان
تم ابھی تھے کہاں

☆ زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات

☆ میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
دیکھ کر تم کو کسی رات کی یاد آتی ہے
ایک خاموش ملاقات کی یاد آتی ہے
ذہن میں حسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی رات یاد آتی ہے

☆ رنگ اور نور کی بارات کسے پیش کروں
یہ مرادوں کی حسین رات کسے پیش کروں

ساحر کی فلمی شاعری کے تعلق سے چند باتیں:

ہندی سنیما میں آرزو لکھنوی کے بعد ساحر اور مجروح ہی تھے جو اپنی فلمی شاعری میں بھی اپنے اپنے ادبی آہنگ کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے، اور اپنے فن کو فلمی شاعری کی بھینٹ چڑھانے کی بجائے، اپنی فلمی شاعری کو ادبی حسن و جمال بخش گئے۔ ساحر بمبئی آئے تو مجاز نے یہاں ہمت ہار کر رخت سفر باندھ لیا تھا۔ جاں نثار اختر،

اختر الایمان اور کیفی اعظمی نے فلمی گیت نگاری میں محدود کامیابیاں ضرور حاصل کیں، لیکن آخر کار انھوں نے فلمی دنیا میں ساحر کی عظمت کو تسلیم کر لیا۔ فراق کو ساحر کی شہرت کا یہ کہہ کر اعتراف کرنا پڑا کہ مشاعرے کا ٹکٹ تو ساحر ہی کے نام سے بکتا ہے۔

فلم نگری میں ساحر کی آمد نے ڈی، این مدھوک اور پی ایل سنتوشی جیسے تک بندی کرنے والوں کو زمین دکھادی تھی اور ان کے سامنے حسرت جے پوری اور راجا مہدی علی خاں کا بازار سرد ہو گیا تھا۔ شکیل بدایونی اور راجیند ر کرشن کو ساحر سے سخت مسابقت کا سامنا کرنا پڑا، بہر کیف ساحر کی مسلسل کامیابیوں کے سامنے ان کی شہرت کے چراغ بھی جھلملانے لگے۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ کمال امروہوی نے اڈیٹر گگن، شمس کنول کو اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ ان کی فلم ''دل اپنا اور پریت پرائی'' کے ایک سین میں جہاں ہیروئن اور اس سہیلیوں کا ندی کنارے اپنی مٹکیوں میں پانی بھرتے ہوئے گیت گنگنانے کا منظر تھا۔ شکیل بدایونی نے گیت لکھا تھا۔

ع 'مٹکہ' دل اتنا نہ اچھالو'' ''یہ کہیں ٹوٹ جائے نا'' کمال امروہوی نے انھیں مشورہ دیا کہ ''شیشہ' دل اتنا نہ اچھالو'' کردو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ''دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیو رے'' (بجائے ہنسوں کا جوڑا) لکھنے والے شکیل، ساحر کے مقابلے میں کہیں نہیں ٹھہرتے۔ یہاں ایک اور موضوع موازے کا دھیان میں آتا ہے۔

ہماری رسوم و روایات میں بیٹی کی رخصتی کے گیتوں کا بھی ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اس تعلق سے ہماری فلموں میں بابل کے گیتوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ایسے ہی گیتوں میں شکیل بدایونی کے لکھے ہوئے دو گیت، بہت مشہور ہوئے تھے، بلکہ ایک زمانے تک شمالی ہند کے بیشتر گھروں میں (خصوصاً شہروں میں) بیٹی کی رخصتی کے موقع پر ان گیتوں کو گوانا یا ان کے رکارڈ بجانا شادی بیاہ کی تقریبات کا ایک لازمی حصہ بن گیا تھا۔ ان گیتوں میں سے ایک گیت فلم ''بابل'' کا ''ع چھوڑ بابل کا گھر تو ہے پی کے نگر آج جانا پڑا'' تھا، اور دوسرا فلم ''مدر انڈیا'' کا گیت ''ع پی کے گھر آج پیاری دلھنیا چلی'' ان دو گیتوں کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں آئی جب تک کہ 1968ء میں بنی فلم ''نیل کمل'' میں ساحر کے لکھے ہوئے گیت بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے، نے ان کی جگہ نہیں لے لی۔

یہ ساحر کا اپنے فن پر اعتماد ہی تھا کہ انھوں نے اپنے عہد کے بڑے بڑے موسیقاروں کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا اور خیام، روشن، جے دیو، مدن موہن، این دتا، اور لکشمی کانت جیسے نئے موسیقارو ں کے ساتھ کام کرنے اور سدھا ملہوترا اور جگجیت کور جیسی نئی گلوکاروں کو موقع دینے میں تامل نہیں کیا اور اس طرح ان کے کلام کی بدولت کئیوں نے اپنی اپنی پہچان بنالی۔

ساحر نے خالص ہندی گیت لکھ کر پردیپ اور بھرت ویاس جیسے گویوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ پیدا کر دیا تھا۔ یوں تو ان کے بہت سے گیت مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

ع آج سجن موہے انگ لگالو، جنم سپھل ہو جائے۔ ع تورا من درپن کہلائے وغیرہ لیکن ہم یہاں خاص طور پر فلم ''چتر لیکھا'' کے گیتوں کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ اس فلم کے بہت سے مشکل مقامات پر ساحر نے بڑے ہی معنی خیز اور مدھر گیت معیاری ہندی میں لکھے تھے۔ جن قارئین نے ''چتر لیکھا'' ناول پڑھا ہے، وہ ساحر کے گیتوں کی بلحاظ موقع و محل موزونیت صحیح داد دے سکتے ہیں۔

ہارون رشید (علیگ) نے اپنے ایک مضمون (مشمولہ فلمی ستارے 1981ء ساحر لدھیانوی نمبر) میں ''پیاسا'' جیسی نغماتی فلم کو چیتن آنند کی فلم ''ہیر رانجھا'' کے مساوی قرار دے کر اپنی فلم ناشناسی اور بد مذاقی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ''پیاسا'' کے دلکش نغموں کا تجزیہ نرگس نے اپنے ایک حقیقت پسندانہ مضمون میں بڑی خوبی سے پیش کیا تھا، غالباً وہ بھی ان کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ ''ہیر رانجھا'' کے ایک آدھ گیت کے سوا کسی میں وہ کیفیت نہیں جو پیاسا کے گیتوں میں ہے اور ''ہیر رانجھا'' کے منظوم مکالموں نے تو اس کلاسیکی قصے کا ناس مار کر رکھ دیا تھا اور اس کی المیہ فضا کو بُری طرح مجروح کیا تھا۔

ندا فاضلی نے کبھی کہا تھا کہ فلمی دنیا میں گیت لکھنا مشکل نہیں، گیت لکھنے کے مواقع حاصل کرنا کٹھن ہے۔ ان کی بات اگر چہ صحیح ہے، لیکن وہ پوری طرح درست یوں ہوگی کہ فلمی دنیا میں گیت ملنے کے مواقع حاصل کرنے کی کامیابی کے بعد اپنے مقام کو برقرار رکھنا زیادہ چیلینجنگ کام ہے، جو ندا نہیں کر پائے، جبکہ ساحر نے چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے تک فلمی گیتوں کی دنیا میں حکومت کی۔

رندِ شاہد باز:

ساحر کی ماں اپنی جوانی ہی میں اپنے شوہر سے تعلق توڑنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ بعد کے دور میں ان کی ماں کے دونوں بھائی بھی داغِ مفارقت دے گئے تو ساحر ہی ان کا واحد سہارا رہ گئے تھے۔ ساحر کے بچپن سے لے کر جوانی تک وہی ان کی خبر گیر و عناں گیر بنی رہیں۔ ساحر کی کمائی ہوئی دولت، عزت اور شہرت کا ڈھیر ان کے قدموں میں پڑا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ ایک ماں ہونے کے ساتھ ایک عورت بھی تھیں، اس لیے جب بھی ایک ماں کے دل میں ایک بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو جاگتی، اس کے اندر کی عورت، اپنی محبت کے مرکز اور اس کے طفیل پائی ہوئی زندگی کی آسائشوں پر اپنے اختیارِ کلی کے ختم ہو جانے کے خوف سے کانپ اٹھتی تھی، اور جب بھی کوئی ساحر کا مقصودِ دل بنتی تو وہ چاہے لتا ہو یا سدھا ہو یا کوئی اور، وہ کبھی مذہب تو کبھی خاندان کی دیوار کھڑی کر دیتی تھی یہی وجہ ہے کہ ساحر کے سہرے کے پھول نہیں کھلے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ

ان کی سیج ہمیشہ سونی رہی۔

مارک ٹوائن نے کبھی کہا تھا کہ "میں پیدا ہوا تو ایک خاتون کے ساتھ بستر پر تھا"۔ ساحر کی اپنی ماں کے ساتھ زندگی بھر کی محبت وقربت اور ماں کی موت کے بعد ان کے بجھ کے رہ جانے (اور کچھ ہی عرصے بعد انتقال) کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم انہیں Oedipus Complex کا شکار نہ سمجھنا بھی چاہیں تو ان کی شخصیت پر اس کومپلیکس کے ناپختہ اثرات کو تو محسوس کیا ہی جاسکتا ہے اور ان اثرات کے ناپختہ رہنے کا سبب یہ ہے کہ انہیں اس کے دفیعے کے مواقع حاصل ہوتے رہے۔

ساحر اپنی کم صورتی (چوڑی ہاڑ کا چہرہ، لمبی ناک، چہرے پر چیچک کے ہلکے داغ، البتہ آنکھیں خوبصورت) کے باوجود عشق کے معاملے میں خوش نصیب رہے۔ کیوں نہ ہم ان کے ماجراہائے عشق کو یہاں اس جواز کے ساتھ دہرالیں کہ حسن عشق کی کہانیوں کو کبھی زوال نہیں آتا۔ یہ وعدہ رہا کہ اس "حکایتِ لذیذ کا بیان اختصار کے ساتھ ہوگا۔

1938ء میں ساحر گورنمنٹ کالج لدھیانا میں زیر تعلیم تھے تو وہاں پر وہ سرکردہ کانگریسی لیڈر تلک رام چودھری کی بیٹی پریم چودھری کے پریم بان کے گھائل ہوئے۔ ان کا یہ عشق کچھ عرصے بعد پریم چودھری کی تپ دق کے عارضے میں ہوئی موت کے الم ناک انجام کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس عشق کی یادگار میں ان کی نظم "مرگھٹ کی سرزمین پر" تخلیق ہوئی۔ ساحر کا دوسرا عشق اسی کالج کی طالبہ ایشور کور (ڈاکٹر انور ظہیر انصاری صاحب نے نجانے کس بنا پر بریندر کور درج کیا ہے!) سے ہوا، جس کے نرم ونازک پیکر کو حفیظ لدھیانوی نے نقش چغتائی سے مشابہ بتایا ہے۔ ساحر کے اس عشق کی یادگار ان کی نظم "کسی کو اُداس دیکھ کر" ہے۔ ان کے اس عشق کا راز کالج کے پرنسپل پر افشا ہوا تو دونوں ہی کالج سے نکالے گئے۔ ایشور کور اپنے گاؤں سدھاری تو ساحر نے لاہور کی راہ لی۔

لاہور میں پہلے دیال سنگھ کالج اور بعد ازاں اسلامیہ کالج، دونوں ہی جگہ ان کا زمانہ تعلیم بہت مختصر رہا۔ اول الذکر دیال سنگھ کالج لاہور سے تو وہ چند ہی ماہ میں اپنی کالج یونین (جس کے وہ صدر تھے) کی سرگرمیوں اور احراری تحریک سے اپنی دل چسپی کی بنا پر نکالے گئے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کو انھوں نے اپنی تعلیم بیچ میں چھوڑ کر بی اے کیے بنا ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔ دراصل لاہور کی ادبی دلچسپیاں انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ 1944ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "تلخیاں" زیور طبع سے آراستہ ہو چکا تھا اور چودھری نذیر احمد نے انہیں "ادب لطیف" کی ادارت سونپ دی تھی۔ اسی دور میں پنجابی کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ امرتا پریتم سے ان کی آشنائی ہوئی، ساحر نے امرتا کی پنجابی نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر "ادب لطیف" میں پیش

کیا اور امرتا کا دل جیت لیا۔ ''پریت نگر'' کے جریدے ''پریت لڑی'' میں بھی امرتا کی نظمیں چھپیں، کچھ عرصے تک ساحر جس کے اڈیٹر رہے تھے۔

جب تقسیم کا خوں چکاں سانحہ رونما ہوا تو ان دنوں (1948ء میں) خواجہ احمد عباس کا ایک کھلا خط اخبارات میں شائع ہوا تھا، جو یوں تو ساحر کے نام تھا، لیکن اس میں ہر ترقی پسند کو ہندوستان کی تعمیر نو کے لیے یہاں آنے کا بلاوا دیا گیا تھا۔ اسی سال ساحر دہلی چلے آئے، جہاں ان کی ادارت میں دو ماہی جریدہ ''شاہراہ'' جاری ہوا۔ انھیں دنوں آل انڈیا لاہور کی ملازمت چھوڑ کر امرتا پریتم بھی دہلی آ چکی تھیں یہاں ان دونوں میں پھر پیار کی پینگیں بڑھیں اور یہ ان کے عشق کے شباب کا دور تھا۔

امرتا پریتم نے اپنی داستان عشق کے صرف ایک امر (جنسی تعلق) کو چھوڑ کر اس کے دیگر سارے اجزا کبھی اپنے ناولوں (ایک سی انیتا، دلی کی گلیاں) میں کبھی اپنی متعدد نظموں بشمول اپنی طویل نظم ''سینہڑے'' میں اور اپنی سوانح ''رسیدی ٹکٹ'' میں اس طرح بکھیر کر رکھ دیے ہیں کہ کچھ بھی چھپا نہیں رہ جاتا اور امرتا کے درج ذیل اظہار میں اس حقیقت کا اقرار بھی دیکھا جا سکتا ہے، جس کے خیال سے اس کے بیٹے نوروج (یا نوروز!) سے لیکر ساحر اور امرتا کے کسی قاری کا ذہن بیگانہ نہیں:

''دراصل محبت کے معاملے میں وہ بہت پیاسا تھا۔ اس لیے اسے محسوس کرنے والی چاہت کی بجائے نگل لینے والی محبت کی آرزو تھی: جب کہ صنف نازک اپنی نسائی مجبوریوں کے باعث کبھی بھی خود سپردگی سے آگے نہیں بڑھ سکتی''۔

1960ء میں جب امرتا نے اپنے شوہر سے علاحدگی اختیار کر لی اور نسائی مجبوریاں حائل نہ رہیں (جن کے باوصف کبھی بھی خود سپردگی کا اقرار کیا گیا ہے) اس وقت تک پل کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا تھا۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں ساحر کا طوطی بول رہا تھا، اور ان کی زندگی میں ہاجرہ، لتا، سدھا اور نہ جانے کون کون آ کے جا چکی تھیں، اس لیے امرتا نے آرٹسٹ امروز کے دامن میں پناہ لے لی۔ اگرچہ امروز کی عمر امرتا کی عمر سے کافی کم تھی پھر بھی ان دونوں فنکاروں کا ملن کامیاب رہا، انھوں نے 40 برس کی کامیاب ازدواجی زندگی گزاری۔ امرتا اور ساحر کی طرح، امرتا اور امروز کے عشق کی کہانی بھی لکھی گئی جو ایک شاعرہ اور ایک مصور کی داستان محبت کے طور پر مشہور ہوئی: Amrita Imroz: A Love Story۔ شاید آج کے قارئین نہ جانتے ہوں کہ یہی امروز اردو کے مشہور زمانہ ادارۂ شمع کے جریدوں (ماہ نامہ 'شمع'، ماہ نامہ 'بانو'، ماہنامہ 'کھلونا' وغیرہ) کے مصور بھی رہے تھے۔

اپنے بمبئی کے دور میں ساحر کا ابتدائی عشق لتا کے ساتھ مشہور ہوا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ

دونوں نے ساتھ میں کام کرنا بند کردیا۔ لتا کے لیے ساحر کی لکھی ہوئی نظم ''تیری آواز'' نے شہرت پائی اور کہا جاتا ہے کہ ان کی نظم ''انتظار'' کا تخاطب بھی لتا کی طرف ہے۔ لتا کے بعد ساحر کی زندگی میں لتا کی جگہ سدھا ملہوترا نے لینی چاہی۔ دونوں کی محبت کے چرچے پھیلے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ لگی ہوتی ہے۔ ساحر کے اس عشق کی راہ میں بھی ماں جی یا مذہب نے کانٹے بچھا دیے۔ آخر نا کام محبت سدھا کی منگنی انڈین نیوی کے کسی کمانڈر کے ساتھ طے ہوگئی۔ ان ہی دنوں ایک ''شام ساحر'' کا اہتمام ہوا، جس میں سدھا بھی موجود تھی۔ ساحر نے وہاں اپنی شاہ کار نظم ''ع چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں، پڑھی اور اپنے تعلق خاطر کو اس حسین موڑ پر ترک کرنے کا پیغام دیا۔

حمید اختر نے اپنی کتاب ''آشنائیاں کیا کیا'' میں بمبئی کے ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں ساحر اور ہاجرہ مسرور کی آشنائی ہونے کا ذکر کیا ہے، اور ہاجرہ مسرور سے ساحر کی اس منگنی کا تذکرہ ایک شاہد کے روپ میں کیا ہے جو کہ بعد میں ٹوٹ گئی تھی، اس سلسلے میں ہاجرہ کی تردید کے باوجود حمید اختر نے اپنا بیان واپس نہیں لیا تھا۔

بمبئی میں 1960ء کے آس پاس جب شکیلہ بانو بھوپالی نے قوالی کی دنیا میں اپنے قدم جمائے تو اس کے پاس حسن بھی تھا اور آواز بھی۔ ساحر کی داستان عشق میں ہمیں جہاں ساحر سے تازہ کلام حاصل کرنے کے لیے شکیلہ بانو کی ملاقاتوں کا حال ملتا ہے، وہیں اس بات کی گواہی دینے والے لوگ آج بھی مل جائیں گے کہ شکیلہ بانو کی آواز میں ساحر کی لکھی قوالی ع 'یہ عشق عشق ہے عشق عشق' نے بڑی دھوم مچائی تھی اور ایک زمانے تک شکیلہ اپنے ہر پروگرام میں لوگوں کی فرمائش پر یہ قوالی سناتی رہی تھی۔

سردار جعفری کی روایت کے بموجب حیدرآباد (دکن) کی ایک حسین خاتون ساحر پر فدا تھی اور انہیں اکثر خط لکھا کرتی تھی۔ حیدرآباد میں منعقد ایک سیمی نار میں وہ اپنے شوہر اور بچی کو چھوڑ کر ساحر سے بیاہ کرنے چلی آئی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ساحر بھی رضا مند تھے اور اس عورت کا شوہر بھی بادل نخواستہ راضی ہوگیا تھا لیکن سوئے اتفاق سے اس دن کوئی وکیل نہ مل سکا اور دوسرے دن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ وہ عورت پلٹ کر نہیں آئی۔ اظہر جاوید نے لکھا ہے (اس لیے تحقیق طلب ہے) کہ ناز صدیقی بھی، جو ساحر پر اپنے مقالے کے سلسلے میں ان سے ملتی رہی تھیں، ساحر کا دم بھرتی تھیں۔

ساحر کی بہنوں نے لکھا ہے کہ انہیں بہت سی لڑکیوں کے فون آتے رہتے تھے اور کچھ لڑکیاں چلی بھی آتی تھیں، ایسے ماحول میں کج دار و مریز کی سی احتیاط کہاں تک ممکن رہتی! ساحر کی زندگی کو کنواری سمجھ کر افسوس کرنے ولوں کی سمجھ پر ہمیں افسوس ہوتا ہے اور اس کے برعکس ان کے کردار میں رنگیلے شاہ کی سی رنگ آمیزی

تلاش کرنا بھی بے تکی بات لگتی ہے۔ جارج برنارڈ شا نے چالیس برس کی عمر پار کرنے والوں مردوں کی اس نفسیات کے تعلق سے جو لفظ استعمال کیا ہے اسے یاد کر لیجیے۔ غور کیجیے تو وہ اپنی زندگی میں غالب کے مشہور مقولے پر عمل کرتے ہوئے شہد کی مکھی کی جگہ مصری کی مکھی بنے رہنے کی احتیاط برتتے رہے۔ ایسے میں ان کی داستان حیات کو ''ناکام محبت'' کا نام دینا کہاں زیب دیتا ہے!

دراصل کسی کے عشق کی کامیابی کو دعوت ولیمہ یا Marriage certificate کے ذریعے مصدقہ سمجھنے کا لوگوں کا عام مزاج رہا ہے۔ جبکہ یہ روش صحیح نہیں ہے۔ برٹرینڈ رسل نے ایلس سے اپنے عشق کو شادی میں بدلا تھا تو شادی کے ابتدائی دور کے بعد انھوں نے ایلس سے جنسی تعلق کو اتنا غیر دلچسپ پایا کہ وہ اس سے سال میں صرف دو مرتبہ ہم بستر ہوا کرتے تھے، وہ بھی اس لیے کہ ایلس ناراض نہ ہو جائے۔ رسل نے اپنے معاشقوں میں زیادہ آسودگی پائی تھی، ذہنی بھی جسمانی بھی۔

ساحر کے شادی نہ کرنے کی بنا پر کسی فیض الحسن چودھری کے ساحر کے مخنث ہونے کے بیان (ناکام محبت، ص: 66) کی فضولیت تو ظاہر ہے، حیرت تو تب ہوتی ہے کہ حمید اختر یا اظہر جاوید بھی ساحر کو لاہور کے بازار حسن سے لے کر (ان کی جدوجہد کے دنوں میں) بمبئی کے ریڈ لائٹ ایریا تک میں شب گردی کراتے ہوئے انھیں بنا پاجامے کے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ان کا مرد ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل ساحر کا نام فلمی دنیا ہی میں نہیں ادبی دنیا میں بھی بکاؤ رہا ہے اور اس طرح کی چٹپٹی تحریریں ادل بدل کر نئے عنوان سے بازار میں آتی رہتی ہیں۔ کسی نے کہیں لکھا تھا ''شہرت کا ایک عیب یہ ہے کہ اسے پانے کے بعد کوئی اس سے فرار نہیں ہو پاتا۔''

ساحر ایک رند بلانوش بھی تھے اگر چہ ان کی رندی کے قصے جوش و مجاز کی شراب نوشی کے افسانوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے ''پرچھائیاں'' میں ان کا ایک اپنا نجی مے خانہ تھا۔ پوری طرح سفید رنگ کے اس مے خانے میں نفیس اور قیمتی شرابوں کا ذخیرہ قرینے سے سجا کر رکھا ہوا تھا، اور وہاں تک ان کا کوئی بہت ہی قریبی یا رازدار ہی رسائی کر پاتا تھا۔

ساحر کی بذلہ سنجی:

ساحر بذلہ سنج بھی تھے اور حاضر جواب بھی، واجدہ تبسم اپنے مضمون 'آسمان چپ ہے' (مشمولہ 'فن و شخصیت') میں راوی ہیں کہ انھوں نے اپنے پہلے بیٹے کا نام سراج الدولہ رکھا تھا اور دوسرے کا ٹیپو سلطان۔ وہ دونوں بچے کچھ زیادہ ہی باتمیز واقع ہوئے تھے۔ واجدہ کبھی دونوں بچوں کو ساحر کے ہاں لے جاتیں تو دونوں مودب ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے میں ان بچوں کے ناموں کی رعایت سے ساحر کا یہ کہنا مزہ دے جاتا تھا کہ

بھئی یہ انقلابی اور باغی حکمراں اس قدر چپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں۔ واجدہ نے لکھا ہے کہ ساحر کے اللہ میاں سے ذرا غیر دوستانہ مراسم تھے۔ ایک بار جب ان کے یہاں ایک ادبی فنکشن تھا، بجلی چلی گئی۔ اتفاق سے اس وقت واجدہ نماز کے لیے چادر بچھا چکی تھیں۔ انھوں نے ساحر سے کہا ''دیکھیے گا نماز کی برکت اور میری دعا سے اجالا ہو جائے گا، انشاء اللہ''۔ خدا کا کرنا، ادھر نماز ختم ہوئی، ادھر بجلی آ گئی۔ واجدہ نے ہنس کر کہا 'دیکھے ساحر صاحب' میں نے جانماز تہہ کی اور بجلی آ گئی''۔

ساحر نے انھیں برجستہ جواب دیا ''تم نے جانماز تہہ کی جب بجلی آئی''۔

اسی طرح ایک بار جب ٹیپو سلطان بیمار تھا، ساحر نے اس کی خیریت پوچھی۔

واجدہ بولیں، ''اب اللہ کے فضل سے اچھا ہے''۔

ساحر نے ہنس کر پوچھا ''وہ بیمار کس کے فضل سے ہوا تھا''۔

ساحر کی فقرے بازی سے ان کے ترقی پسند احباب بھی نہیں بچ پاتے تھے۔

ان کی اسی روش پر سردار جعفری نے ایک بار ان سے کہا تھا ''ساحر تمھاری ایسی باتوں کی وجہ سے کوئی بھی ترقی پسند تمھارے جنازے میں شریک نہیں ہوگا''۔

ساحر نے رسان سے جواب دیا تھا ''بھئی! میں تو سب ترقی پسندوں کے جنازوں میں شرکت کروں گا۔''

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ساحرؔ کی محبتیں: تتلی کی پرواز

عبدالحی ساحر لدھیانوی کی پیدائش ۸ر مارچ ۱۹۲۱ء کو ہوئی ان کے دادا کا نام فتح محمد اور والد کا نام فضل محمد چودھری تھا۔ لیکن شہرت کی بلندیوں پر صرف ساحر پہنچے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے ''تلخیاں'' ''گاتا جائے بنجارہ'' پرچھائیاں (طویل نظم) اور'' آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' منظرِ عام پر آئے جن کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے۔ ساحر کے والد متمول زمیندار تھے۔ حکام پرستی اور سرکار پرستی کی وجہ سے نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ انہوں نے بارہ شادیاں کیں اولاد دیرینہ عبدالحی گیارویں بیوں سردار بیگم کے بطن سے ہیں۔ چھ ماہ کے بچے کو لے کر ان کی والدہ فضل محمد کی عیاشیوں سے تنگ آ کر علیحدہ ہوگئی تھیں۔ بعد میں سردار بیگم اور فضل محمد میں مقدمے بھی چلے۔ ساحرؔ کے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے وہ عدالت تک گئیں۔ سردار بیگم نے ساحر کی پرورش و پرداخت اور شخصیت کو نکھارنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مالوہ خالصہ ہائی اسکول، لدھیانہ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد انہیں گورنمنٹ کالج، لدھیانہ میں داخل کرایا گیا۔ فلسفہ اور فارسی ان کے مضامین تھے۔ انگلش، ہسٹری اور اردو بھی سبجیکٹ تھے۔ بعد میں انہیں معاشیات اور سیاسیات سے دلچسپی ہوئی اور یہ دلچسپی اتنی بڑھی کہ ۴۵-۱۹۴۴ میں دو تصنیفات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جو'' کارل مارکس اور سامراج'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

ساحر لدھیانوی کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں لیکن وہ کسی سے شادی نہیں کر سکے۔ ساحرؔ جب کالج کے دوسرے سال میں تھے تو ایک سکھ ہم جماعت دوشیزہ ایشر کور کو دل دے بیٹھے۔ دونوں کے معاشقے کے اتنے چرچے ہوئے کہ کالج انتظامیہ نے انہیں نکال دیا۔ ایشر کور کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ چھٹیوں میں ساحر کے بلانے پر وہ ہاسٹل آگئی۔ پرنسپل کو ان دونوں کا ملاپ پسند نہیں آیا اور انہیں کالج چھوڑنا پڑا۔ اشیر لدھیانہ کے قریبی ایک گاؤں کے بڑے زمیندار تلک رام چودھری کی بیٹی تھی۔ کالج سے نکالے جانے بعد وہ گاؤں میں رہنے لگی تھی۔ ساحر اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گاؤں

تک چلے گئے تھے۔ وہ ساحر سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن مذہبی تفاوت اور ساحر کی بے روزگاری کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ساحر نے اس پر نظم لکھی تھی جس کا عنوان ''کسی کو اداس دیکھ کر'' ہے۔

تمہیں اداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نجانے کون سے صدمے اٹھا رہی ہو تم
وہ شوخیاں، وہ تبسم، وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تم
چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم

مری امید اگر مٹ گئی تو مٹنے دو
امید کیا ہے بس اک پیش و پس ہے کچھ بھی نہیں
مری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غم حیات، غم یک نفس ہے کچھ بھی نہیں
تم اپنے حسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے، طول ہوس ہے کچھ بھی نہیں

لیکن ایشر کور سے پہلے ساحر کی محبت پریم چودھری سے ہوئی تھی۔ خود پریم ان سے وصل کی خواہاں تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ساحر کی رومانی شخصیت میں محبت اور محبوب کے عوامل کچھ زیادہ ہیں۔ پریم کو بھی ساحر سے محبت کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ نتیجے میں دق میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اس کی وفات پر ساحر نے ''نظم مرگھٹ کی سرزمیں پر'' لکھی تھی۔ اس میں پریم سے عشق کا پس منظر ہے اور شخصی رنگ و آہنگ ہے۔ ساتھ ہی انفرادی فکر، ذاتی تجربے اور ایک شاعر کی ذہنی زندگی میں شامل تجسس سے تجزیے تک کا خاموش عمل ہے۔ اسلوب شخصیت کی متحرک پرچھائیاں اور شخصی اظہار کی صورت میں نمود گی دیکھی جا سکتی ہے۔

میرے تصورات کہن کی امیں ہے تو
مرگھٹ کی سرزمین مقدس زمیں ہے تو

اک بے وطن اسیر محن کا سلام لے
آزردۂ بہار چمن کا سلام لے
فطرت ترے حرم پہ تقدس فشار ہے
تو میرے دل کی خاک کی سرمایہ دار ہے

ویرانیاں تری مجھے جنت سے کم نہیں
یہ دھوپ مجھ کو سایہء رحمت سے کم نہیں
گو تیرے راستے میں ہر اک سو ببول ہیں
دامن میں تیرے اس کی جوانی کے پھول ہیں
جو میری زندگی کی تمنا بنی رہی
ذوق بناز روح کا کعبہ بنی رہی

ساحر لدھیانوی کے ایک اچھے دوست حمید اختر تھے۔ انہوں نے ان کی زندگی کے مخفی گوشے سے پردہ اٹھایا ہے۔ اپنی کتاب ''آشنائیاں کیا کیا'' میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ساحر کی منگنی ہاجرہ مسرور سے ہوئی تھی جو ٹوٹ بھی گئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں باقاعدگی سے شرکت کی بنا پر دونوں قریب ہوئے تھے۔

ساحر کا ایک نمایاں عشق امرتا پریتم سے تھا۔ ۱۹۴۴ میں دونوں کے مابین دوستی اور پھر باہمی پسندگی کا رشتہ پروان چڑھا۔ ان کی پہلی ملاقات امرتسر کے نزدیک پریت نگر میں ایک کانفرنس کے دوران ہوئی۔ لیکن جب دونوں لاہور لوٹے تو یہ جان پہچان روزانہ کی ملاقات، پھر دوستی اور محبت میں بدل گئی۔ یہ اعتراف کم معنی خیز نہیں ہے کہ خود امرتا پریتم نے اپنی کتاب 'رسیدی ٹکٹ' میں آپ بیتی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بیٹا نوراج بالکل ساحر کا ہم شکل ہے۔ ایک بار خود میرے بیٹے نے مجھ سے سوال کیا تو میں اسے بتایا، عورت جب حاملہ ہو تو بچے کی تشکیل کے وقت وہ جس ہستی کا سب سے زیادہ تصور کرتی ہے یا اس کی تصویر دیکھتی رہتی ہے۔ ہونے والا بچہ اسی شکل کا ہوتا ہے۔ میں نے نوراج، اپنے بیٹے کو کہا تمہاری پیدائش کے وقت ایسا ہی ہوا تھا۔ تب نوراج نے بڑی معصومیت اور بے ساختگی سے کہا تھا، ماں اگر میں انکل ساحر کا بیٹا بھی ہوتا تو کوئی بات نہیں۔ میں انہیں بے حد پسند کرتا ہوں''

ساحر کے ایک شیدائی اظہر جاوید نے امرتا کے اس بیان پر تبصرہ اس طرح کیا ہے:

''ہندو اور سکھ عورتیں خصوصیت سے امید کے دنوں میں مہاراج کرشن اور گورو نانک کا جاپ کرتی ہیں۔ بدھ خواتین مہاتما بدھ کی شبیہہ سامنے رکھتی ہیں۔ مسیحی عورتیں حضرت یسوع کی تصویر کو ہر دم دیکھتی رہتی ہیں۔ پھر آج تک کوئی ان کا ہم شکل کیوں پیدا نہ ہوا؟ مسلمان عورتیں بھی گھر میں بڑے بڑے خوبصورت بچوں کے پوسٹر لٹکائے رکھتی ہیں۔ لیکن اکثر کالے بھجنگ بچے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ میں بے شمار لوگوں سے اس مسئلے پر گفتگو کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کبھی جذباتی لمحوں میں ساحر اور امرتا کا وصل تو ہوا ہوگا۔ امرتا اپنے جسم و جاں کی وجہ سے زیادہ طالب (Dimonding) رہی ہوگی۔ بچے کی پیدائش کا عمل تو بہت مختصر ملاپ میں بھی ہو جاتا ہے۔''

ساحر نے امرتا پر جو نظم لکھی ہے وہ اس طرح ہے۔ ''ایک تصویر رنگ'':

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حسن کا نغمہء جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبہء بے تاب نظر آئی تھی
اے طرب زار جوانی کی پریشاں تتلی
تو بھی اک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا

تیرے نازک سے پروں سے یہ زر و سیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
تو نے راحت کی تمنا میں جو غم پالا ہے
وہ تری روح کو آباد نہ ہونے دے گا

یہ سچ ہے کہ ساحر نے امرتا کو بہت چاہا تھا۔ لیکن بعد میں امرتا نے بے وفائی کی تھی۔ ساحر دلی گئے تو امرتا سے تنہائی میں ملنے کے آرزو لئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فون کیا، امرتا آئی مگر ساتھ میں امروز تھے۔ دونوں کے جانے بعد ساحر نے فون پر شکوہ کیا کہ کبھی تمہارے گلاس میں۔ کبھی اپنے گلاس میں شراب ڈال کر پی رہا ہوں۔ ایک نظم ہو گئی ہے۔ سنو:

محفل سے اٹھ جانے والو، تم لوگوں پر کیا الزام
تم آباد گھروں کے باسی، میں آوارہ اور بدنام
میرے ساتھی خالی جام،
دو دن تم نے پیار جتایا، دو دن تم سے میل رہا
اچھا خاصا وقت کٹا اور اچھا خاصا کھیل رہا
اب اس کھیل کا ذکر ہی کیسا، وقت کٹا اور کھیل تمام
میرے ساتھی خالی جام،
تم دنیا کو بہتر سمجھے، میں پاگل تھا خوار ہوا
تم کو اپنانے نکلا تھا، خود سے بھی بیزار ہوا
دیکھ لیا گھر پھونک تماشہ، جان لیا اپنا انجام
میرے ساتھی خالی جام،

بعد میں یہ نظم فلم ''دوج کا چاند میں شامل ہوئی مگر اس میں ساحر اور امرتا کے تعلق کا گہرا افسانہ ہے۔

لتا منگیشکر سے ساحر کا عشق بیحد مشہور ہوا۔ لتا ان کے گھر جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ رسوئی میں جا کر توئے پر روٹیاں بھی سینکتی تھیں۔ ساحر ان سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ماں سے بات کی ماں نے شرط رکھی کہ ''اسے کہو پہلے مسلمان ہو جائے''؟ لتا اپنے گھر والوں کے مرضی کے خلاف نہیں جاسکتی تھیں۔ ان کے بس میں اتنا ضرور تھا کہ تمام عمر کنواری رہیں۔ لتا کے لئے ساحر نے نظمیں لکھیں نظم ''تیری آواز'' وجد آفریں کیفیت ہے اور جذبہ شوق کا وفور ہے۔ خود ساحر کی ذات اور لتا کی ساحرانہ ہستی اس میں گھلی ملی ہوئی ہے۔

رات سنسان تھی بوجھل تھی فضا کی سانسیں
روح پہ چھائے تھے بے نام غموں کے سائے
دل کو یہ ضد تھی کہ تو آئے تسلی دینے
میری کوشش تھی کہ کم بخت کو نیند آجائے

تو بہت دور کسی انجمن ناز میں تھی
پھر بھی محسوس کیا میں نے کہ تو آئی ہے

اور نغموں میں چھپا کر مرے کھوئے ہوئے خواب
میری روٹھی ہوئی نیندوں کو منالائی ہے

لتا کے لئے ایک دوسری نظم ''معذوری'' میں ساحر نے زندگی اور ذہن کی کہانی سنائی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کی طرح ٹوٹتے داخلی رخ کی ترجمانی کی ہے اور پیکر تراشی اور پرستاری کے منزل سے گذرتے ہوئے رقص گرداب اور موج رواں کی گل فشانی کی ہے۔

ساحر کے معاشقے کی داستاں سدھا ملہوترا سے بھی پھیلی۔ خوب چرچا ہوا۔ اخبار نے بھی اسے خوب اچھالا۔ ان کی دنیا میں مستور حیرت زا واقعات کی شناخت بھی ہوئی۔ ان کی ندرت اور جمالیاتی معنویت کا احساس بہتوں ہوا اور لگا کہ دونوں شادی کرلیں گے۔ لیکن شاید حد بندیوں سے علاقہ ہوگیا اور نشان زدگی انسلاکاتی امکانات سے جہاں دگر بن گئی۔

ساحرؔ کے معاشقے میں شکیلہ بھوپالی کا بھی نام جگمگاتا ہے۔

ساحر نے محبتیں کیں۔ چلتی ڈھلتی زندگی میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ کوئی طاقت ہے جو انسانی فیصلوں کو بدل دیتی ہے اور حالات کا رخ موڑ دیتی ہے۔

ساحرؔ نے ابتدائی زندگی میں حالات سازگار نہ رہنے کی وجہ سے رسالہ ''ادب لطیف'' کی ادارت کی، ''شاہکار'' ''سویرا'' ''شاہراہ'' اور ''پریت لڑی'' جیسے رسائل کے مدیر رہے۔ اور بعد میں فلمی دنیا سے وابستہ ہو کر نغمہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

ساحر کی زندگی کی گرہیں کھولتے وقت مداحوں کی محبت وعقیدت، حاسدوں اور منافقوں کے بغض وعناد کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ بظاہر ان کی زندگی پھول سے پھول تک ایک تتلی کی پرواز ہے۔ اور شیشہ آب سے رقص گرداب تک موج رواں ہے۔ انہوں نے فلمی مشاغل میں شاعری کی اور ترجیحات کی سطح پر نظموں اور گیتوں کو فوقیت دی۔ ان کی تخلیقی حسیت کے ریشمی پیکروں میں جتنی محبتیں ہیں ان میں سمبندھ کا فطری تقاضہ کم نظر آتا ہے!۔

تیری محفل سے اٹھنے کی تجویز پر
میں اٹھوں اور دل بیٹھتا جائے ہے

☆☆☆

سحر تک کون جانے کتنے فتنوں کو جگا ڈالے
بظاہر کافرہ سوئی ہوئی معلوم ہوتی ہے

خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

شہناز خانم عابدی، کینیڈا

ساحرؔ جو "پل دو پل" کے شاعر نہیں تھے

میں نے اپنے قلم کو افسانہ نویسی اور کہانی کاری تک محدود رکھا ہے لیکن کبھی کبھی شدت سے یہ تحریک ہو جاتی ہے کہ اس حصار سے باہر نکلوں۔ مثال کے طور پر جب کبھی ساحرؔ لدھیانوی کی شاعری سے میرا سامنا ہوا تو میں نے اپنے قلم کو آپ ہی آپ متحرک ہوتا ہوا محسوس کیا۔ ایسا کیوں ہوا۔؟ اس کا جواب ضروری نہیں لگتا کیونکہ میرے پڑھنے والے اس سوال کے جواب تک پہنچ گئے ہونگے۔ میں نے برسوں شعر و ادب کے نقادوں کی اس سرد مہری کا مشاہدہ کیا ہے جو ان میں سے بیشتر نے ساحرؔ کے ساتھ روا رکھی ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی کا تعلق شاعروں کی اس نسل سے ہے جو "انگارے" کی اشاعت کے فوراً بعد ترقی پسند تحریک کے سیلِ تند و تیز سے ابھری اور اردو شعر و ادب پر چھا گئی۔ اس نسل کو پریم چند، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، حسرتؔ موہانی جیسے بزرگوں کی سرپرستی اور آشیرواد حاصل تھی۔ ساحرؔ لدھیانوی اس نسل کے سرخیل شاعروں فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، اسرار الحق مجازؔ لکھنوی، معینؔ احسن جذبی، مخدومؔ محی الدین، احمد ندیمؔ قاسمی، علی سردارؔ جعفری وغیرہم کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ میں تو بلا مبالغہ یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ ترقی پسند شعرا میں برسہا برس پہلا نام ساحرؔ لدھیانوی کا لیا جاتا تھا۔ تقسیم برِ صغیر ہند سے قبل ہی ان کی شاعری کی گونج پورے ہندوستان کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے سیاسی معاملات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا پاکستان میں وہ اہم ادبی رسالوں اور مجلوں (شاہکار، سویرا، ادبِ لطیف) کے مدیر ہوئے۔ لیکن یا تو ان کو وہاں ٹکنے نہیں دیا گیا یا خود وہ پاکستان کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ سماج سے بددل ہو گئے اور بالآخر ۱۹۴۹ میں ہندوستان آگئے اور لدھیانہ میں کچھ دن ٹھہر کر بمبئی چلے گئے۔ یوں بھی لکھا ہوا ملتا ہے کہ جب پاکستان میں ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو وہ ہندوستان ہجرت کر گئے۔ فلموں کے واسطے سے ان کی شاعری اردو ہندی دنیا میں، گھر گھر اور گلی گلی پہنچ گئی۔ برِ صغیر اور اس کی سرحدوں کے باہر بھی جہاں جہاں ہندوستانی تھے بچے بچے کی زبان پر ان کا نام آگیا اور بیرونی دنیا میں ان کا نام ہندوستان کی شناخت بن گیا۔ وہ ہندوستان کے ثقافتی

سفیر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

ہندوستان سے ان کا نام اگر جڑا ہوا تھا تو ان کی فلمی شاعری کے علاوہ وہ شاعری بھی تھی جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی، اس کی کش مکش اور کشاکش سے عبارت تھی۔ اس شاعری کو وقتی، سطحی، سیاسی شاعری کا نام دے کر نظر انداز کرنا شاعر کے ساتھ زیادتی کے زمرے میں آسکتا ہے۔ اس مخصوص عصر کی اکائی میں ساحؔر کی اس نوع کی شاعری وطن پرستی اور غیر ملکی تسلط سے رستگاری حاصل کرنے کی فطری لگن، تڑپ، اور سوز و ساز کی شاعری ہے۔ ساحؔر لدھیانوی نے روز روز بدلتی ہوئی سیاسی جوڑ توڑ، غیر ملکیوں سے سیاسی نبرد آزمائی کو اپنے شعری وژن کی گرفت میں لے کر پورے تنقیدی شعور کے ساتھ پیش کیا۔ یوں اس نے اس اتھل پتھل عہد کی شاعرانہ تنقیدی تاریخ رقم کی۔ جس زمانے میں اس سے بزرگ شاعر مزاحمتی شاعری کر رہے تھے، جوشؔ ملیح آبادی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں کو" للکار رہے تھے۔ ساحؔر انتہائی رسان سے ہر ایک اہم معاملے کو ایک تاریخ کے طور پر لکھتا جارہا تھا۔ فلسفۂ تاریخ میں تنقیدی شعور سے معمور تحریروں کو بہ نظرِ امتیاز دیکھا جاتا ہے۔ ساحؔر کی اس نوع کی شاعری عصری اور وقتی موضوعات پر مشتمل ہونے کے باوجود تاریخ اور سیاست کے تنقیدی شعور کی نمائندہ شاعری ہے، وقتیہ شاعری نہیں ہے۔ اس کی اساس پر کسی بھی شاعر کو پسِ پشت نہیں ڈالا جاسکتا لیکن ساحؔر لدھیانوی کے ساتھ ایسا رویہ رکھا گیا جو بلا جواز تھا۔

اگر ان کو فلمی شاعر قرار دے کر نظر انداز کیا گیا تو یہ بھی زیادتی ہی تھی کیونکہ ان کی فلمی شاعری کا ننانوے فی صد حصہ معیاری شاعری پر مشتمل ہے۔ ساحؔر لدھیانوی کی شاعری کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ دی ہوئی موسیقی کی دھن پر اپنے شعر تخلیق کرتے تھے۔ میں آسانی سے اس روایت کو تسلیم کرنے کی حالت میں نہیں ہوں لیکن یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ کبھی وہ موسیقار کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر شعر موزوں کرتے ہوں گے اور کبھی موسیقار ان کے اشعار کو سُر سنگیت میں ڈھالتے ہوں گے۔ انکی نظموں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر میں رکھنا پڑے گا کہ شاعر کو فلم کے منظر اور اور دیگر معاملات کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ کوئی لاکھ یہ کہے کہ شاعری کی بھی موسیقی ہوتی ہے ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ شاعری کی موسیقی کو راگ راگنیوں اور سُر اور تال کی موسیقی میں ڈھالنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فلمی شاعری کو آورد کی شاعری سے بچا کر 'آمد' کی شاعری بنانا بھی تو فلمی شاعر کا فرضِ منصبی بنتا ہے ورنہ بقول کنھیا لال کپور ایسے شعر تخلیق ہوں گے۔

پانی میں مچھلی، مچھلی میں پانی
دنیا ہے فانی اور آنی جانی

ساحرلدھیانوی نے چند اور شعرا کی مانند فلمی شاعری کو شاعری کے اعلیٰ معیار پر قائم رکھنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ساحرؔ نے اپنی فلمی شاعری کو قبولِ عام کی سطح پر بھی استوار کیا۔اس کام کے لئے وہ اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ مہارت کے حامل ثابت ہوئے۔اس سلسلے میں ان کی خود اعتمادی بہت بڑھی ہوئی تھی۔کہا جاتا ہے کہ لتا منگیشکر نے اپنی آواز اور گائیکی کے بارے میں بات کرتے ہوئے تعلّی میں آ کر یہ کہا کہ یہ میری آواز کا جادو ہے جو کسی گیت کو مقبول بناتا ہے۔شاعر کی شاعری نہیں۔ساحرلدھیانوی نے ان کی اس تعلّی کا برا منایا اور اس لمحے کے بعد لتاؔ کے لئے کوئی گیت نہیں لکھا۔ساحرؔ لدھیانوی کے گیتوں،غزلوں اور نظموں کو دوسری گانے والیوں نے گایا اور ایسے سارے نغمے گلی گلی گونجے۔ساحرؔ نے اس کے بعد اپنے ہر گیت کا معاوضہ لتاؔ سے ایک روپیہ زیادہ طلب کرنا شروع کیا۔

ساحر کی اپنی شاعری پر اعتماد کے سلسلے میں ایک اور روایت بھی ملتی ہے ۔موسیقار ایس ڈی برمن نے بھی ساحرؔ کی شاعری کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے یہ کہا کہ گیت ان کی دی ہوئی موسیقی کے بل پر کامیاب ہوتے ہیں،شاعری کی اساس پر نہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ ساحرؔ نے موسیقار ایس ڈی برمن کا ساتھ ترک کر دیا اور انتہائی کامیاب گیت تخلیق کیے۔

اب میں اس مرحلے کا ذکر کرنا چاہونگی جس مرحلے پر ساحرؔ لدھیانوی کو پہلی مرتبہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ان کی نظم ”میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے“ شہرت اور مقبولیت کی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگی تو ان کے خلاف آوازیں اٹھیں۔ان آوازوں کا نشانہ ان کی شاعری نہیں تھی۔ان کی شاعری میں کوئی نقص نہیں نکالا گیا تھا بلکہ ’تاج محل‘ کی حمایت میں اس نظم پر اعتراض کیا گیا تھا۔

وقت کے اس مرحلے پر کافی شور وغل مچا۔تہذیب اور ثقافت پر بہت کچھ کہا گیا اور بہت کچھ لکھا گیا۔”تاج محل“ پر بھی بڑی تحقیق ہوئی۔اس کا نقشہ زیرِ بحث آیا۔اس کے پرس پیکٹو اور ڈیزائن اور اس کے عقب میں موجود فنکاروں،نقاشوں اور ماہرانِ تعمیر کو پردہ گمنامی سے باہر لایا گیا۔”تاج محل“ کی شان میں اعلیٰ معیار کی شعری تخلیقات سامنے آئیں۔اس سے قبل تاج محل پر دو ایک مستشرقین کی تحقیقات کے علاوہ کچھ دستیاب نہ تھا۔اس مرحلے پر جو کچھ ہوا اس سے تو الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساحرؔ لدھیانوی نے اپنی ثقافتی میراث

س دم کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی۔ اس نظم کا تجزیہ بھی کیا گیا۔ میں تو بس اتنا عرض کروں گی کہ ''تاج محل'' کو ساحرؔ لدھیانوی نے جس زاویے سے دیکھا اور دکھایا وہ زاویۂ نظر بھی اپنی جگہ اور اپنی قدر کا حامل ہے اور رہے گا۔ اس عصر کی فکر میں یہ زاویۂ نظر خاصا عام تھا۔ اس زمانے کی ایک مقبولِ عام اور مشہور نظم ۔

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

میں مجازؔ نے کہا۔

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں، کچھ اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں

ساحرؔ لدھیانوی نے 'تاج محل' کو بحیثیت فنِ تعمیر (آرکیٹیکچر) کے شاہکار کے کبھی مسترد نہیں کیا۔ اس کی نظم کے متن میں کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ ساحرؔ لدھیانوی کے بہت بعد ایک بڑے فلمی شاعر شکیل بدایونی نے فلم لیڈر (۱۹۶۴) کے لئے اپنے گیت میں لکھا۔

ایک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
دنیا والوں کو محبت کی نشانی دی ہے

ساحرؔ نے سماجی استعمار اور طبقاتی معاشرے کے خلاف اپنے ردِ عمل کا ایک زاویہ پیش کیا تھا۔ شکیل بدایونی نے اگر ساحرؔ کی نظم کا جواب دیا تھا تو وہ جواب قطعی اطمینان بخش نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی کچھ عرصہ ساحرؔ کی نظم کے سطحی مطالعے کے زیرِ اثر اس کے باطن سے دور رہی۔ میں نے بھی اس نظم کو اشتراکیت زدہ ترقی پسندی سے مملو دیکھ کر مسترد کیا۔ دوسری تیسری بار پڑھنے کے بعد جب میں نظم کے باطن میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سماج کے روندے ہوئے جو لوگ اپنی بقا کی جدوجہد میں گرفتار ہوں اکثر اوقات ذوقِ جمال سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ بھوکے کو آسمان کا گول چاند روٹی دکھائی دیتا ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی کی مذکورہ نظم ''میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے'' اختصار اور ارتکاز کا ایک شاہکار ہے۔ بظاہر ایک نوع کی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنے والی، یہ حقیقت پسندانہ تند و تیز اور تلخ نظم اپنے باطن میں ایک دلِ دردمند کی دھڑکنوں سے معمور ہے۔ اس کی ساخت میں علامات کا بھی ماہرانہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس نظم میں جذبے اور تعقل کی آمیزش (Intermingling of emotion and intellect) کے علاوہ فکر و احساس کا رچاؤ (

Discursive) اور منطقی سوچ (Interfusion of sensibility and thought thought) کے ایسے عوامل کارفرما ملیں گے جو اس عصر کی شاعری میں عام نہیں تھے۔ اور جہاں جہاں بطور تجربہ ان کو تخلیقی عمل کا حصہ بنایا گیا تو شعریت کو مجروح ہونے سے بچانا مشکل ہو گیا۔ نظم کے آغاز ہی سے شاعر اپنی محبوب سے اختلاف رائے اور اپنے نکتہ نظر کی افہام وتفہیم کرتا نظر آتا ہے۔

"تاج تیرے لئے اک مظہر الفت ہی سہی

ساحر لدھیانوی نے تاج محل کو، محبت کی نشانی، مظہر الفت، موجب عقیدت، الفت بھری روحوں کی گزرگاہ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس کے برعکس تاج محل کو بزم شاہی، سطوت شاہی کا نشاں، تشہیر وفا کا استعارہ، مردہ شاہوں کے مقابر میں سے ایک مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستونوں میں سے ایک، شاعر کی محبوب اور خود شاعر کے اجداد کے لہو کی گلکاری، سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں ساحر نے جو سوال یا نکتہ اٹھایا ہے اس کو نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں۔

اَن گنت، لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

مغربی تنقید نے نظم کے ڈھانچے (Structure) کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تعمیر، ہیئیت اور شکل کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اردو میں کسی طرح کی تعمیری نہج رکھنے والی نظمیں ساحر کے عہد میں بہت کم ملتی ہیں۔ ساحر نے اپنی بیشتر نظموں کو تعمیری انداز میں تخلیق کیا ہے زیر بحث نظم "میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے" کا اختتام ملاحظہ فرمائیے۔

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اس بند کے ساتھ ہی نظم کی عمارت پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ صوری، معنوی، اور منطقی تینوں اعتبار سے۔

ساحؔر کی نظم ''پل دو پل کا شاعر'' بھی اپنی علیحدہ شناخت اور انفرادیت رکھتی ہے۔ عام طور پر شاعر حضرات خواہ دنیا کو فانی خیال کریں لیکن اپنے آپکو دوام بخشنے سے نہیں ہچکچاتے خواہ اپنی شاعری کے واسطے ہی سہی لیکن ساحؔر نے اس نظم میں صاف سیدھے اور واضح الفاظ میں اپنے آپ کو''پل دو پل کا شاعر'' کہا ہے۔ اسی طرح شاعر ''ہم چو من دیگرے نیست'' کے دعویدار ہوتے ہیں۔ لیکن اس نظم میں ساحؔر نے اپنے بعد اپنے سے بہتر کہنے والے شاعروں کی نوید دینے کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا ہے کہ سخن فہم بھی اسکے دور کے سخن فہموں سے بہتر آئینگے ۔یوں ساحر کی یہ نظم حسیاتی سطح پر ایک دلدوز اور دل سوز نظم ہونے کے ساتھ معنوی سطح پر سچی اور واقعیت پسندانہ ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں بحر اور لفظوں کے صوتی بہاؤ، اتار چڑھاؤ کچھ ایسا ہے جیسے کسی درد مند کا دل دھڑک رہا ہو۔ ساحؔر نے اشیائے ہستی کے لحاتی وجود اور جدلیاتی سچائی کا وجدان اپنے لفظوں کے صوتی اور معنوی آہنگ کے وسیلے سے جس طرح دیا ہے وہ تعریف و تحسین سے ماورا ہے۔

ساحؔر لدھیانوی کی شاعری یک رُخی اور اک رنگی نہیں تھی ۔ اساسی طور پر وہ ایک سیکولر شاعر تھا، وہ اشتراکی بھی تھا کیونکہ وہ غریبوں کے استحصال سے نفرت کرتا تھا۔ وہ انسانیت اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو عزیز رکھتا تھا، وہ خواتین کے ساتھ جبر کا روادار نہ تھا۔ یوں اس کو ہیومانسٹ اور فیمینسٹ بھی کہا جا سکتا ہے ۔

نیلام ہو رہا تھا کسی نازنین کا پیار
قیمت نہیں چکائی گئی اک غریب سے

ساحؔر دنیا میں جو دیکھنا چاہتا تھا اور دنیا کو جیسا دیکھنا چاہتا تھا نہ دیکھ سکا۔ اس کو کیا دیکھنا پڑا نظم'' آج ''میں دیکھیے۔

آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں
میں تمہارا مغنی ہوں، نغمہ نہیں
اور نغموں کی تخلیق کا ساز و سامان

ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی
وحشتیں ناچتی ہیں
اور انسان کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے
بربریت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرا رہے ہیں
بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
ہر طرف شور و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفاں میں
آگ اور خون کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

درج بالا نظم کو ۱۹۴۷ء کے فسادات سے الگ کر کے دیکھئے تو بھی وہ آج کی نظم دکھائی دے گی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی
ظالم کو جو نہ روکے وہ شامل ہے ظلم میں
قاتل کو جو نہ ٹوکے وہ قاتل کے ساتھ ہے
ہم سر بکف اٹھے ہیں کہ حق فتح یاب ہو

کہہ دو اسے جو لشکرِ باطل کے ساتھ ہے — اس ڈھنگ پر ہے زور تو یہ ڈھنگ ہی سہی

جنگ کے بارے میں ساحرؔ کے اصل خیالات و جذبات کیا تھے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اس لیے اے شریف انسانو — جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں — شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

برتری کے ثبوت کی خاطر — خوں بہانا بھی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو — گھر جلانا بھی کیا ضروری ہے

ساحرؔ کا یہ شعر تو ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوا تھا ؎

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے — خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

ظلم کے بارے میں ان کا یہ مصرع کس مزاج کا ہے؟

ظلم کی بات ہے کیا، ظلم کی اوقات ہے کیا

خون کے بارے میں مزید وہ کہتے ہیں ؎

خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے — ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنیں — ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنیں

مذہب کے بارے میں ان کے خیالات ؎

ہر یگ میں بدلتے دھرموں کو — کیسے آدرش بناؤ گے

اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے　　　　تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے

ساتھ ہی علم کے بارے میں ان کا شکوہ۔

جس علم نے انسان کو تقسیم کیا ہے　　　　اس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے

عشق کے بارے میں انہوں نے کہا۔

عشق آزاد ہے　　　　ہندو نہ مسلمان ہے عشق

وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پرسوز راتوں کو
میں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا

ان کے ان مصرعوں کی اساس پر اگر ان کو صوفی منش قرار دیں تو یہ آپ کی مرضی لیکن میں ایسا نہیں کرونگی۔ انسان کے بارے میں ان کا یہ شعر دیکھئے۔

جرائتِ انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے　　　　فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی

انسان کی بات چل نکلی ہے تو ساحرؔ (انسان) کی ایک نظم سے مندرجہ ذیل اقتباس پڑھ لیجئے۔

آؤ کہ کوئی خواب بنیں:۔

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو، کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

ساحرؔ کی ایک نظم میں شامل اس امیج کو دیکھئے۔

یہ ہنستے ہوئے پھول:۔

یہ ہنستے ہوئے پھول
یہ مہکا ہوا گلشن
یہ رنگ میں اور نور میں ڈوبی ہوئی راہیں
یہ پھولوں کا رس پی کے مچلتے ہوئے بھونرے
میں دوں بھی تو کیا دوں تمہیں اے شوخ نظارو
لے دے کے مرے پاس کچھ آنسو ہیں کچھ آہیں

ساحرؔ لدھیانوی کی غزلیں اس عصر کے اچھے شاعروں کی غزلوں کے معیار کی ہیں کوئی نئی بات نہیں ملتی لیکن ان میں تغزل اور تاثر ضرور ملتا ہے۔

اب آئیں یا نہ آئیں ادھر پوچھتے چلو
کیا چاہتی ہے، انکی نظر پوچھتے چلو
جو خود کو کہہ رہے ہیں کہ منزل شناس ہیں
ان کو بھی کیا خبر ہے مگر پوچھتے چلو
کس منزلِ مراد کی جانب رواں ہیں ہم
اے رہروانِ خاک بسر پوچھتے چلو

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دہرائی گئی
اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی
دل کی دھڑکن میں توازن آچلا ہے خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

میں شاعری کی مستند پارکھ نہیں لیکن ایک بات کہے بنا رہ نہ سکوں گی۔ کہ ساحرؔ لدھیانوی فکر، جذبے اور حسیت

کے اعتبار سے ایک مختلف الجہت شاعر تھے۔ان کی شاعری میں بڑا تنوع ملتا ہے۔یہی تنوع ان کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔فیض احمد فیض کی کلیات کا ان کی شاعری کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ایک کی شاعری کا تنوع اور دوسرے بڑے شاعر کی شاعری کی یکسانیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔میں یہ تو نہیں کہتی کہ شاعر کی شاعری کے مطالعے میں اس کی ذاتی زندگی کو نظر انداز کرنا چاہئے۔ایک زمانے میں مشرق کی شاعری کی تنقید کا رویہ ایسا ہی تھا لیکن عصرِ موجود میں مشرق ہو کہ مغرب ذاتی زندگی کو پیشِ نظر رکھنا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔عبدا لحئی (ساحرؔ) ایک دولتمند گجر جاگیردار خاندان میں جو سنگِ سرخ کی عالیشان حویلی میں رہائش پذیر تھا ، ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ابھی اس کوٹھی میں اپنے بچپن کے بارہ تیرہ برس ہی گزارے ہونگے کہ وقت نے ان کو غربت ، افلاس، اور خوف کے راستے پر ڈال دیا۔ان کے والد نے دوسری شادی کی جس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ان کی والدہ نے طلاق مانگ لی۔اور دھن دولت اور ملکیت میں اپنے جائز حصے سے دستبرداری لکھدی۔والد نے بیٹے عبدالحئی (ساحرؔ) کی کفالت کے لئے مقدمہ کیا اور ہار گئے لیکن ماں اور بیٹا ''خوف'' سے آزادی نہ حاصل کر سکے۔تنگدستی کے باوجود ماموؤں نے دونوں ماں بیٹے کو سہارا دیا۔ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد عبدالحئی کالج میں داخل ہوئے۔وہاں ان کی زندگی میں امرتا پریتم داخل ہوئیں جو بعد میں مشہور صحافی، ادیبہ اور شاعرہ کے طور پر مشہور و معروف ہوئیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ امرتا پریتم کی زندگی میں داخل ہوئے۔امرتا پریتم کے والد کو یہ صورتِ حال پسند نہیں آئی اور اور نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے عبدالحئی (ساحرؔ) کو کالج سے نکلوادیا۔اور ساتھ ہی اپنی اس سولہ برس کی لاڈلی بیٹی کا چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔یہ واقعہ ۱۹۴۳ کا ہے۔ایک کو کالج سے نکلوایا گیا اور دوسری کو رشتہءازدواج میں باندھ دیا گیا۔لیکن دونوں ایک دوسرے کے رہے۔دونوں اپنے وقت کے شعروادب میں، قریباً ساری دنیائے ادب میں شہرت اور مقبولیت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچے۔دونوں نے ایک دوسرے کی جدائی کے ساتھ اور بھی بہت کچھ سہا۔ساحرؔ کو جس خوف نے بچپن سے پکڑ لیا تھا (اپنے طاقتور اور امیر باپ کے ہاتھوں) امرتا پریتم کے پتا اور سماج کے ہاتھوں اپنی گرفت کو مزید سخت کرنے کا موقع نصیب ہو گیا۔دونوں ایک دوسرے کے نہ ہو سکے۔آج ان الفاظ کو تحریر کرتے ہوئے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں ۔دونوں کے درمیان جو کچھ تھا اس سے کسی طور پست اور کم درجے کا نہ تھا جو ہمارے روایتی الوہی جوڑوں (نام نہیں لونگی) یا لوک جوڑوں کے مابین تھا۔دونوں نے ہماری اور آپ کی دنیا میں جدائی کے کرب اور والہانہ دلی و روحانی وابستگی کی زندگی گزاری

اور رخصت ہوگئے۔ ہم نے ان کا درد نہ تو جانا نہ بانٹا۔ البتہ ان پر انگلیاں اٹھائیں، ان کو اسکینڈل کا نشانہ بنایا اور حتی الوسع ان کی زندگیاں اجیرن کیں۔ دونوں میں سے کسی نے بھی ہمارے تعصبات کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اس ضمن میں امرتا زیادہ بہادر ثابت ہوئیں۔ اس نے ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کاغذ پر اپنے پریتم (ساحر لدھیانوی) کا نام سو سے زائد مرتبہ لکھا۔

ساحر نے کہا۔

کسی سوہنی، سسّی، ہیر میں
جو آگ تھی
مجھے اس آگ کی پہچان ہے

امرتا کی آگ کو بھی ساحر نے پہچانا ہوگا۔

ایسا نہیں کہ دنیا اور اہلِ دنیا نے ساحر کو اور اسکے فن کو سراہا نہیں۔ اس کے گیتوں کو فلم فیر ایوارڈ ملے، اور تو اور اسکو پدم شری ایوارڈ بھی ملا۔ لیکن جس ایوارڈ کے ملنے سے ایک نہیں دو زندگیاں خوشیوں کا گہوارہ بن جاتیں، وہ ایوارڈ نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ آخر آخر زمانے میں یہ ضرور ہوا کہ دونوں ایک ساتھ روس بلائے گئے (کسی کانفرنس کے سلسلے میں) روس میں اس تھوڑے سے ساتھ کے دوران ایک واقعہ پیش آیا۔ دونوں کو پہننے کے لئے نام کی تختیاں دی گئیں۔ غلطی سے ساحر کو امرتا پریتم کی اور امرتا پریتم کو ساحر کی تختی دی گئی۔ بعد میں اس غلطی کا تدارک کرنے کے لئے کہا گیا تو امرتا نے ساحر کے نام کی تختی ہٹانے سے انکار کردیا۔ یہ سوچ کر کہ ساحر کا نام اس کے دل کو چھو رہا تھا۔ ساحر کی وفات کے بعد اس نے بے حد پچھتاوے کے انداز میں یہ کہا کہ ساحر کے نام کی تختی پہن کر اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ موت اس کے لئے آئی تھی، اس نے ساحر کو نشانہ بنالیا کیونکہ ساحر نے اس کے نام کی تختی پہن رکھی تھی۔ کاش! وہ تختی بدلنے سے انکار نہ کرتی۔ امرتا پریتم ساحر کے سگریٹ کے ٹوٹے رکھ لیا کرتی تھی اور ساحر کے چلے جانے کے بعد ان کو گاہے گاہے پیا کرتی تھی۔ ساحر کے مرنے کے بعد وہ جب کوئی ٹوٹا پیتی تو خیال کرتی کہ اس کا دھواں ضرور اس مقام تک رسائی پالے گا جہاں ساحر ہے۔

ساحر کی زندگی میں سدھا ملہوترا (اداکارہ و نغمہ نگار) کا نام بھی آتا ہے کسی نے ہاجرہ مسرور کا نام بھی ڈال دیا ہے۔ لیکن میں ان دونوں ناموں کو نام سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ ساحر اپنی ضعیف والدہ کے

ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہی اس کے لباس کا خیال رکھتی تھیں اور انتخاب کرتی تھیں۔ وہ خاتون ایک مضبوط عورت تھیں۔ جب انکے شوہر نے دوسری شادی کی تو انہوں نے سنگ سرخ کی کوٹھی کی امیرانہ زندگی کو لات ماردی اور تنگدستی کی زندگی کو ترجیح دی۔ وہ صاحبِ کردار تھیں انکے شوہر کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ انہوں نے تیرہ شادیاں کیں۔

ساحرؔ کے بارے میں یہ شکایت ملتی ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں کے ساتھ متضاد برتاؤ کیا کرتا تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا۔ ابھی سر اور آنکھوں پر بٹھا رہا ہے تو ابھی گالیاں دینے کی حد تک بدمزگی اور چڑچڑے پن کا برتاؤ روا رکھ رہا ہے۔ اس نے اپنے بچپن کے دوست (پینٹر) سے بمبئی جا کر جس طرح آنکھیں پھیریں اس کے بارے میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند جی کا ایک دل دوز افسانہ ملتا ہے۔ ساحرؔ خوش حال لوگوں کی طرح ہی نہیں بلکہ بمبئی کے پوش علاقے میں اعلیٰ طبقے کے حامل فرد کی مانند زندگی گزارتو رہا تھا لیکن وہ بیمار تھا۔ وہ بار بار ہاتھ دھونے کی علت میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے (Obsessive Compulsive Disorder) کا مریض قرار دیا تھا۔

وہ تاش کھیل رہا تھا کہ حملۂ قلب کا شکار ہوا اور ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ۵۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے جسدِ خاکی کو بمبئی کی ایک پوش بستی جوہو کے قبرستان میں جگہ ملی۔ افسوس تازہ ترین اطلاع کی بموجب ۲۰۱۰ء میں اس کی لحد کی جگہ کسی نئی قبر نے لے لی۔

جنگل میں تو شیروں کو بھی پہنچائے غذا
ہرنوں کی حفاظت کا بھی ذمہ تیرا
سمجھا ہے بھلا کون مشیت کے یہ بھید
یارب تو ہی جانے ترا گورکھ دھندا

پہلے تو خوب کیجیے ناقدریِ سخن
پھر ان کو یاد کیجیے آنکھیں بھگوئیے
مدت سے اہلِ نقد و نظر کا طریق ہے
زندوں کو مار ڈالیے، مردوں پہ روئیے

خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

ابوالمعانی میرزا یگانہ چنگیزی کے حیات وفن پر

وسیم فرحت کارنجوی علیگ کی تحقیق

یگانہ چنگیزی۔ تحقیق وتجزیہ

اس طویل مقالے میں یگانہ کے حیات وفن

کا کوئی گوشہ باقی نہ رکھا گیا ہے

سات ابواب پر مشتمل

ایک ضخیم، بسیط ودستاویزی کتاب

اشاعت کے آخری مراحل میں (تقریباً ۶۰۰ صفحاتی)

رابطہ

وسیم فرحت کارنجوی علیگ

مدیر، سہ ماہی ''اردو''

پوسٹ باکس نمبر ۵۵، ہیڈ پوسٹ آفس

امراوتی، ۴۴۴۶۰۱ (مہاراشٹر)

موبائل: 09370222321

شیریں دلوی، ممبئی

ساحر! ''جانے کیا تو نے کہی، جانے کیا میں نے سنی''

کہ وہ سحر اب بھی باقی ہے

واقعی، ساحر نے کیا کہا اور دنیا نے کیا سنا، کہ ساحر کا سحر، اب بھی باقی ہے۔ گو کہ انہیں اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ ساحر کو ابتدا میں فلمی دنیا میں کسی نے پہچانا نہیں اور جب ان کا پہلا نغمہ ہٹ ہوا تو پھر ان کے نغموں کو اہمیت حاصل ہونے لگی۔ آیئے لدھیانہ سے ممبئی تک ان کے سفر پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

۱۹۷۱ میں صدر جمہوریہ وی وی گری نے ساحر کو پدم شری ایوارڈ سے نوازا تھا۔ ساحر مزاجاً روگ پالنے والوں میں سے نہیں تھے۔ کیمونسٹ پارٹی سے اگر وہ وابستہ تھے، تو ایسا اظہار کرتے تھے کہ تفریحاً وابستہ ہیں۔ نظریاتی بحث سے گریز کرتے تھے۔ کیمونسٹ پارٹی کے کسی شخص کو بحث کے دوران زچ ہوتے دیکھتے، تو ان کے لبوں پر پرلطف شریری مسکراہٹ ہوتی، جو دیکھنے والوں کے دل میں اتر جاتی۔

کہتے ہیں ساحر بھی کسی کے سحر میں گم تھے اور وہ سحر تھا امرتا پریتم کی محبت کا۔ وہ اپنے دوستوں سے گھنٹوں امرتا کی باتیں کرتے۔ وہ ترقی پسند شاعر تھے اور ان کے یہاں سماجی اور طبقاتی شعور کا احساس بھی شدید تھا، اس کے باوجود وہ رومانی شاعری بھی کرتے رہے، اس کے پیچھے شاید امرتا پریتم کا سحر کام کر رہا تھا۔ بہت سے ترقی پسند شعرا تحریک کا حصہ بن گئے تھے، مگر ساحر، شاعر ہی رہے۔ اسی کے ساتھ ساحر متوازن ذہن کے حساس شاعر تھے، انہیں کبھی جذبات کی رو میں بہتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ وہ خوامخواہ کی لفاظی تو نہیں کرتے مگر کبھی موقع آجائے، تو جواب دینے سے ہرگز نہیں چوکتے تھے۔

اپنی ذات کے حوالے سے ساحر کا شمار تنہا فرد میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تنہائی کی وجہ کوئی نظریاتی اختلاف نہیں تھا، بلکہ وہ ایسے مجروح انسان تھے، جنہیں محبت کی ناکامی نے کئی گھاؤ دیے تھے، جو ازدواجی

زندگی کے تجربے سے محروم تھے۔ امرتا پریتم سے ان کی محبت کی داستانیں سنائی جاتی ہیں، مگر انہوں نے اگر امرتا سے محبت بھی کی تو مختلف نام سے، اسی لیے ساحر ان کی تقدیر میں رقم نہ ہو سکے۔ ساحر کے اشعار میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ پھول چڑھاتی کیوں ہو
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر میری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے، تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

درج بالا نظم ساحر نے کس کے حوالے سے لکھی ہے، اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی، مگر ساحر نے رومانی شاعری بھی کی ہے، انسان کے لطیف جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ درج ذیل نظم ملاحظہ ہو:

میرے گلے میں تمہاری گداز باہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقین کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہے
میرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں

دبے سروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم

ساحر کی زندگی میں کوئی پچھلا دروازہ نہیں تھا، ہاں مگر ایک دیوار ضرور تھی۔ کہتے ہیں، جب پیچھے دیوار آ جائے، تو سامنے سے آتی ہوئی تلوار بھی ہاتھ میں پکڑ لی جاتی ہے، کہیں کہیں ساحر کی شاعری بھی ایسی ہی ننگی تلوار سی محسوس ہوتی ہے۔ ساحر کے گھر سے کالج کا فاصلہ ڈیڑھ میل کے قریب تھا...... ساحر رات گئے اپنے دوستوں کے ہمراہ کالج کی دیوار پر جا بیٹھتے تھے، جہاں وہ اپنی محبوبہ سے بھی ملاقاتیں کیا کرتے۔ وہ دیوار ان کی زندگی کی علامت بن گئی تھی۔ یہاں بیٹھ کر ساحر نے بہت سی نظمیں تخلیق کیں۔

ساحر نے لدھیانہ اور لاہور کے کالجوں میں پڑھائی کی، بچپن ہی سے حساس اور اصول پرست تھے۔ سچ کے اظہار میں انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، جس کے لیے انہیں تعلیمی اداروں سے نکالے جانے کی سزا بھگتنا پڑی، مگر آج ان ہی تعلیمی اداروں کو اس بات پر فخر ہے کہ عبدالحئی ساحر ان کے طالب علم تھے۔

فلمی دنیا میں متعارف ہونے کے بعد ساحر نے تقریباً تیس سال تک فلمی دنیا پر حکمرانی کی۔ مرتے دم تک اپنے اصولوں پر قایم رہے اور یہاں بھی انہوں نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، انہوں نے اپنی انا اور عزت نفس کی حفاظت کی۔

1948 میں ساحر پاکستان سے دہلی آئے اور پھر ممبئی کی فلمی دنیا سے متعارف ہوئے۔ جب وہ ممبئی آئے، تو کرشن چندر کے یہاں قیام کیا۔ فلم پرڈیوسر ان کی عزت کرتے، مگر جب فلموں میں نغمے لکھنے کی بات آتی، تو پرڈیوسر کتراتے اور کہتے۔ ''ساحر صاحب آپ برصغیر کے عظیم شاعر ہیں، ہم آپ کے مداح ہیں، فلم آٹھ لاکھ میں بنتی ہے، ہم آپ سے گیت لکھوا کر فلم کو ناکام بنانے کا خطرہ نہیں مول سکتے۔'' عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف ساحر کے دوستوں میں تھے اور فلم پرڈیوسر بھی تھے، مگر انہوں نے بھی ساحر کے نغموں کو فلموں کے ذریعے متعارف کرانے کا خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا۔ مایوسی کے عالم میں ساحر نے موہن سہگل سے ملاقات کی اور ان کے ذریعے ساحر نے ایس ڈی برمن سے ملاقات کی۔ ایس ڈی برمن نے ایک نغمے کی دھن، موسیقی اور فلم کا منظر نامہ سمجھا کر گیت لکھنے کے لیے کہا۔ ساحر نے وہیں بیٹھے بیٹھے گیت لکھ دیا، اس کے بول تھے: ''ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں'' ایس ڈی برمن گیت سن کر خود بھی خوشی سے لہرانے لگے اور ساحر کو

ساتھ لیے کاردار اسٹوڈیو پہنچ گئے اور ان کی ملاقات کاردار سے کروائی۔ یہاں سے ساحر کے فلمی نغموں کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ایس ڈی برمن کی دھن اور ساحر کے نغموں کی جوڑی نے فلمی دنیا کو سدا بہار فلمی نغمے دیے۔ ایک وقت تھا کہ فلمی دنیا میں ساحر کو کام دینے سے لوگ کتراتے تھے پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ساحر کے نغموں کو فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا۔

تم اگر مجھ کو نہ چاہو، تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہوگی تو مشکل ہوگی
بستی بستی پربت پربت گاتا جائے بنجارہ
لے کر دل کا اک تارہ
جو بات تجھ میں ہے تیری تصویر میں نہیں
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم اے جان وفا یہ ظلم نہ کر
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
میں پل دو پل کا شاعر ہوں
برباد محبت کی دعا ساتھ لیے جا
مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں
ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک
تم اگر ساتھ دینے وعدہ کرو
مرے دل میں آج کیا ہے، تو کہے تو میں بتا دوں
جب بھی جی چاہے، نئی دنیا بسالیتے ہیں لوگ

میں نے پی شراب ، تم نے کیا پیا ، آدمی کا خون
نیلے گگن کے تلے دھرتی کا پیار پھلے
جرم الفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں
یہ وادیاں یہ فضائیں بلا رہی ہیں تمہیں
جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا
جانے کیا تو نہیں کہیں ، جانے کیا میں نے سنیاتھی ہاتھ بڑھانا
جانے وہ کیسے لوگ تھے ، جن کے پیار کو پیار ملا
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے
جیون کے سفر میں راہی ، ملتے ہیں بچھڑ جانے کو
کیا ملیے ایسے لوگوں سے جن کی فطرت چھپی رہے
رنگ اور نور کی بارات کسے پیش کروں

درج بالا فلمی نغموں کے مصرعوں کو پڑھنے والا ہر شخص ان گیتوں کو ضرور گنگنائے گا اور ساحر کی یاد تازہ ہو جائے گی ۔ یہ تمام مشہور نغمے فلمی دنیا کو ساحر کی دین ہیں ۔ آسان زبان میں رواں دواں نغمے زبان زد عام ہیں ۔ یہ نغمے صرف دھنوں پر گائے جانے اور فلمی منظر نامے کا حصہ نہ ہو کر بہترین شاعری کی مثال ہیں ۔ ان نغموں میں شاعری ہے ، ایسی شاعری ، جو موسیقی کی دھن پر دل کی دھڑکن بن جاتی ہے ۔

اس کی بہترین مثال وہ نغمہ ہے ، جو آج بھی ہر دلہن کی رخصتی کے موقع پر گایا جاتا ہے ۔ ساحر لدھیانوی کا نغمہ اور محمد رفیع کی آواز کا یہ ایسا شاہکار ہے کہ آج تک اس کے مقابل کوئی نغمہ نہیں آسکا ۔

بابل کی دعائیں لیتی جا ، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے سسرال میں ایسا پیار ملے

☆☆☆☆

راشد اشرف، کراچی (پاکستان)

ساحرؔ لدھیانوی۔ایک سرکش سے محبت کی تمنا.....

ساحر لدھیانوی محبت کے آدمی تھے۔ سرحد کے اِدھر بھی اور سرحد کے اُدھر بھی.......جو دیکھتا تھا، ساحر کے سحر میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ شخصیت کا سحر تھا، سرکشی کا یا شاعری کا، خدا جانے لیکن تھا جان لیوا....لیکن ساحر کے لیے نہیں، بلکہ ان کے جادو سے گھائل ہو جانے والوں کے لیے۔ ذرا نام بھی تو دیکھیے کہ کیسے کیسے قد آور لوگوں کے آتے ہیں۔ ہاجرہ مسرور (م: ۱۵ ستمبر ۲۰۱۲) بھی خود کو نہ روک پائی تھیں۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں بمبئی کے اخبارات میں ان کی ہاجرہ مسرور سے منگنی کی خبر کی اشاعت کا تذکرہ حمید اختر (م: ۱۷ اکتوبر ۲۰۱۱) نے اپنے خاکے 'بنے بھائی' میں کیا ہے۔ لیکن ساحر ہی تھے جو بھاگ نکلے تھے۔ بنے بھائی کہ بقول حمید اختر سراپا جمال ہی جمال، انکسار ہی انکسار، لکھنؤ کی تہذیب کا نمونہ، ساحر کو ہاجرہ مسرور سے شادی پر آمادہ کرنے میں ایسے الجھے کہ خود کو الجھا بیٹھے اور ان کی پریشانی اس وقت دو چند ہوئی جب ہاجرہ مسرور کی بہنیں عائشہ جمال اور خدیجہ مستور ان سے ساحر کی شکایت کرنے آدھمکیں۔ ساحر کے اس رویے کی وجہ سے بنے بھائی کو ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچنے کا خدشہ کھائے جاتا تھا۔ مگر یہ کوئی پہلا موقع تو تھا نہیں۔ حمید اختر کے مطابق اس سے قبل امرتا پریتم، لتا منگیشکر اور سدھا ملہوترہ........ سب ساحر کی ساحری کے اسیر رہ چکے تھے۔۔۔ خالصہ اسکول لدھیانہ کی ایشر کور تو ماضی کا قصہ بن چکی تھی...... ساحر کی پہلی محبت ۔۔۔ سدھا ملہوترہ سے معاملہ ختم ہوا تو ایک فلمی اخبار نے تبصرہ کیا تھا کہ ساحر کو اپنے نام کے ساتھ اسکینڈل بنانے کا شوق ہے۔ وہ محبت کا کھیل کھیلتے ہیں اور جب تعلقات کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو خود ہی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

ایک برس ہوا جب لاہور کے ماہنامہ الحمراء میں کراچی سے تعلق رکھنے والے ادیب و مترجم قاضی اختر جونا گڑھی کا ایک مضمون شائع ہوا۔ قاضی صاحب لاہور گئے تھے اور حمید اختر سے ساحر لدھیانوی اور ہاجرہ مسرور کی منگنی ختم ہونے کا سبب کھوج لائے تھے.....لکھتے ہیں:

''اردو زبان کی ایک معروف افسانہ نگار کی جوان دنوں ممبئی ہی میں مقیم تھیں، منگنی ساحر لدھیانوی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ساحر کو ایک ایسے مشاعرے میں شریک ہو کر اپنی شہرہ آفاق نظم تاج محل سنانا تھی جس میں جوش ملیح آبادی بھی شرکت کرنے والے تھے جو الفاظ کے غلط تلفظ کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ چونکہ ساحر لدھیانوی

اہل زبان نہیں تھے لہذا انہوں نے اپنی نظم تاج محل میں استعمال کیے گئے لفظ ''مقابر'' کے صحیح اور درست تلفظ کے بارے میں ان خاتون سے رائے طلب کی۔ انہوں نے بتایا کہ صحیح تلفظ ''مقابِر'' یعنی ''ب'' کے نیچے زیر آئے گا۔ گویا یہ مصرعہ یوں ہو جائے گا: مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی...... جوش صاحب نے ساحر کو جو ملاحیاں سنائی ہوں گی، ان کا اندازہ آپ اسے واقعے سے لگا سکتے ہیں کہ اس نے فی الفور ان خاتون سے اپنی منگنی کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔''

خیر ہاجرہ مسرور کا یہ معاملہ تو ساحر لدھیانوی کی افتادِ طبع کے باعث ختم ہوا لیکن پھر امرتا پریم کو کیا کہیے کہ شادی تو امروز سے کی اور وہی امروز، سلیم پاشا کو ایک ملاقات میں بتاتے ہیں کہ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ امرتا ساحر سے پیار کرتی ہے، میں امرتا سے پیار کرتا ہوں۔ میں اسے اسکوٹر پر بٹھا کر اسٹوڈیو لے جاتا تو وہ میرے پیچھے بیٹھی میری کمر پر ساحر ساحر لکھتی رہتی۔''.... امرتا نے ''یادوں کے لمس'' میں اپنے محبوب کو کچھ ان الفاظ میں یاد کیا تھا:

''یہی وہ چہرہ تھا جس نے میرے اندر انسانیت کی وہ جوت جگائی کہ ملک کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہی سے دو چار ہو کر بھی جب میں اس حادثے کے بارے میں قلم اٹھایا تو دونوں گروہوں کی زیادتیاں بغیر کسی رعایت یا ریزرویشن کے قلمبند کر سکی۔''

اسی امرتا پریتم نے ساحر کی موت کی خبر سن کر قلم اٹھایا اور اسے یوں خراج تحسین پیش کیا تھا:

یار بدنیت یا\
تم نے تو یار ہمارے ساتھ بدنیتی کر دی\
ہم نے تو تیرے نام پر دنیا کے لاکھوں الزام لیے\
اور آج تم ہی دغا کر رہے ہو\
یار بدنیت یا\
چلو جہاں چلو گے ہم ساتھ چلیں گے\
اگر موت کے ریگستان سے بھی گزرنا ہوگا تو گزریں گے

نریش کمار شاد (م:۱۹۶۹) کو دیے ایک انٹرویو میں ساحر نے ایک قہقہے کے ساتھ شادی نہ کرنے کے سوال کے جواب میں کہا تھا ''کچھ لڑکیاں مجھ تک دیر میں پہنچیں اور کچھ لڑکیوں تک میں دیر میں پہنچا''۔ بقول کیفی اعظمی ''شادیاں ان پر منڈلائیں، منڈلاتی رہیں اور منڈلا کے رہ گئیں مگر ساحر ہر مرتبہ بچ نکلے''۔

لدھیانہ کے ایک زمیندار گھرانے میں عبدالحئی کے نام سے پیدا ہونے والا ساحر لدھیانوی، نجی زندگی میں نہایت شرمیلا اور بزدل انسان تھا، اتنا کم ہمت کہ اس میں لاہور کے ناشر چودھری نذیر سے اپنی کتاب 'تلخیاں' کی بقایا رقم مانگنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ یہ کام بھی اس کے عزیز دوست اے حمید (م: ۲۹ اپریل ۲۰۱۱) ہی کو کرنا پڑا تھا۔ غرض پوری ہوئی تو دوستوں کا یہ ٹولہ انارکلی میں واقع ممتاز ہوٹل میں چائے اور پیسٹری کھانے جا پہنچا جو ان دنوں ایک عیاشی تصور کی جاتی تھی۔ وہ زمانہ بھی خوب تھا، ممبئی کی زبان میں کہیے تو سب دوست کڑکے ہوتے تھے۔ ان سبھوں کی ایک رات ایسے ہی کٹی تھی...، مانگے کے سگرٹوں پر گزرا کرتے۔ مفلسی نے سبھوں کو دبوچا ہوا تھا لیکن حوصلے جوان تھے۔ رات کے آخر ہوتے ہوتے سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ پو پھٹے، ساحر نے اے حمید کے سامنے یہ 'حسین' راز عیاں کیا کہ اس کے پاس دو روپے ہیں۔ سالم دو روپے۔ دونوں دوستوں نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا جہاں چائے اور سگرٹ، دونوں ہی کا بندوبست تھا۔ اے حمید لاہور کے ان یادگار دنوں کا کیا خوب نقشہ بیان کرتے ہیں "ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والا بھوت گھر الاٹ ہوگیا تھا۔ اس کا کمرہ نچلی منزل پر تھا۔ بلڈنگ خستہ حال تھی۔ دیواروں کا چونا گر رہا تھا۔ اونچی چھت میں جالے لٹکتے تھے۔ غسل خانے کی کھڑکی بند نہ ہوتی تھی۔ نلکے کی ٹوٹی سے ہر وقت پانی گرتا رہتا تھا۔ اس جگہ کھڑکی میں ٹوٹا ہوا شیشہ رکھ کر ساحر لدھیانوی شیو بنایا کرتا تھا۔ روشن دان میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس عمارت کے آگے ایک لان تھا جس میں جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔" ....

کیسے خوش نما دن تھے وہ.... جیبیں خالی لیکن حوصلے جواں۔ اور جب ساحر لدھیانوی کو فلمی دنیا سے وابستگی کے بعد سب کچھ مل گیا تب، کیا اس بے چین روح کو قرار آیا تھا؟ حمید اختر اپنے ہمدم دیرینہ ساحر لدھیانوی سے اس کے عروج کے دنوں میں ملنے گئے تھے گرچہ کئی لوگوں نے انہیں وہاں جانے سے منع کیا تھا، کہا تھا کہ ساحر لدھیانوی بدل گیا ہے۔ ان میں علی سردار جعفری بھی تھے جنہوں نے حمید اختر سے کہا تھا کہ "ساحر کے یہاں ٹھہروگے تو تکلیف میں رہوگے کیونکہ ساحر وہ نہیں رہا جو ۱۹۴۸ء میں تم لوگوں کو چھوڑ کر گیا تھا"۔ لیکن حمید اختر کے دل کو قرار کیسے آتا۔ یہ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ کی صبح تھی جب حمید اختر ساحر کے گھر پہنچے تھے۔ وہ غیر شادی شدہ زندگی بسر کر رہا تھا..... دولت میں کھیل رہا تھا........ برملا کہتا تھا کہ "جارج برنارڈ شا کو تو ایک لفظ کا صرف ایک پاؤنڈ ہی ملتا تھا، میں نے تو ایک ایک گیت کے پانچ ہزار سے دس ہزار لیے ہیں۔"

ساحر لدھیانوی کو دیکھ کر حمید اختر کو خوشی نہیں ہوئی۔ وہ انہیں بدلا ہوا نہیں لگا بلکہ ٹوٹا ہوا دکھائی دیا۔ حمید اختر بیان کرتے ہیں "بیماری نے اس کے خوف میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا بیڈروم دور ایک کونے میں تھا۔ وہ سونے کے لیے جاتا تو اسے یہ خیال پریشان کرتا کہ رات کو دل کا دورہ پڑا تو یہاں سے کسی

تک اس کی آواز نہیں پہنچے گی۔ اسے سفر کرنا پڑتا تو کئی دو گاڑیوں میں ہوتا۔ اسے ہفتوں کہیں نہیں جانا ہوتا تھا مگر ڈرائیور کو حکم تھا کہ وردی پہن کر صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر آجائے۔ شاید ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت پڑ جائے۔ دن بھر وہ اپنی موٹی موٹی آنکھیں کھول کر خلا میں تکتا رہتا جیسے اسے گمشدہ کڑی کی تلاش ہو۔" (بنجارہ۔حمید اختر)

ساحر بمبئی میں کئی منزلہ عمارت کا مالک تھا۔ پرچھائیاں...... جو اسی کے ایک مجموعے کا عنوان تھا ۔اسی عنوان پر عمارت کا نام رکھا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بات خود اس کے اس بیان کے برخلاف تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ:

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی

ساحر کی غیر یقینی طبیعت و مزاج کے بارے میں ندا فاضلی بھی 'حتمی' بیان دے چکے تھے: "ماضی کی تلخ یادوں نے انہیں کسی حد تک sadist بنا دیا ہے۔ دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہہ کر اور ضرورت مندوں کو بار بار اپنے گھر کے بے مقصد چکر کٹوا کر انہیں اب سکون بھی ملتا ہے۔ ساحر کے پاس جو بھی کسی کام کے لیے جاتا ہے، کبھی مایوس نہیں لوٹتا مگر جھوٹے وعدے کرنا اور مہینوں دوسروں کو ان میں الجھائے رکھنا ان کی مخصوص ہابی بھی ہے۔ ان بے مقصد چکر کاٹنے والوں کی مجبوریوں سے وہ نئے نئے لطیفے تراش کر اپنی شام کی محفلوں کو بھی رنگین بناتے ہیں۔ ساحر کو اپنے ہاتھ سے پیسہ دینے میں مزہ آتا ہے لیکن اگر کہیں کسی کا روزگار لگ رہا ہو تو اس میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لطف کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

ایک طرف یہ رویہ بیان کیا گیا ہے لیکن دوسری جانب اس کے عہد شباب کے دوست ابراہیم جلیس کا بیان بھی مدنظر رہنا چاہیے۔ جلیس اگست ۱۹۶۰ء میں ساحر سے ملنے بمبئی گئے۔ بیان کرتے ہیں:

"وہ ساحر لدھیانوی جو بمبئی کے فیشن ایبل علاقے وارڈن روڈ کے تفریحی ساحل پر بیچ کینڈی اسکینڈل پوائنٹ کے سامنے پارسیوں کی ایک پرانی وضع کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا اور لال پارک میں بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرتا تھا اب وہی ساحر لدھیانوی اندھیری کے ایک شاندار بنگلے میں رہتا ہے۔ وہ اب ہندوستان کا امیر ترین شاعر ہے لیکن اس کے باوجود اس نے غریب عوام سے اپنے اٹوٹ رشتے کو فراموش نہیں کیا ہے اور اب بھی اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ علمی، ادبی اور عوامی اداروں کے لیے وقف ہے۔" (عبدالحیٔ سے.....)

لیکن کیا یہ کیفیت اس دنیا میں بسنے والے انسان کے لیے کوئی نئی بات ہے؟ بچپن کی نفسیاتی الجھنوں کا اثر زندگی میں آگے چل کر بعض اوقات شخصیت پر عجب خوفناک طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔۔۔ انسان جو بیک

وقت تضادات کا مجموعہ ہے۔۔۔اپنے اندر تنہائی کا بوجھ اٹھائے.....روز جیتا ہوا روز مرتا ہوا.....شہرت، دولت، عزت.....یہ تمام چیزیں تو پائیدار نہیں ہیں لیکن ساحر لدھیانوی کے یار عزیز حمید اختر اس بات پر مطمئن تھے کہ ان کے دوست سے زندگی کے نشیب وفراز میں ایک چیز کوئی نہ چھین سکا...اپنے فن سے اس کا خلوص۔

''اس نے صاف سیدھی زبان میں ملک کے کروڑوں عوام سے جو مکالمہ اٹھارہ برس کی عمر میں شروع کیا تھا، وہ ساٹھ برس کی عمر تک اسی شدومد سے جاری رہا۔ وہ لکھتا رہا لوگوں کے لیے، بہتر مستقبل کے لیے، امن اور خوشحالی کے لیے۔ اس نے فلمی شاعری کو ایک نیا حسن اور نئی جہت دی مگر وہ اپنے اصل کام، تخلیق کے عمل کو نہیں بھولا اور اس نے محبت، مسرت اور امن کے گیت گانے بند نہیں کیے۔'' (حمید اختر)

حمید اختر ساحر کے وہ دوست تھے جن کی ہم نشینی میں لدھیانہ میں ساحر نے یادگار دن گزارے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں دونوں کی آخری ملاقات ہوئی تھی، اس کے بہت برسوں بعد دسمبر ۱۹۷۸ میں حمید اختر بمبئی اپنے دوست سے ملنے گئے اور پھر اپنی وفات تک ساحر کو موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں لکھے گئے اپنے کالمز میں تواتر کے ساتھ یاد کرتے رہے۔ حمید اختر پاکستان میں ساحر پر اتھارٹی مانے جاتے تھے۔ ۱۹۴۶ میں دونوں لدھیانہ سے اکٹھے بمبئی اپنی قسمت آزمانے گئے تھے۔ ساحر کی پہلی فلم 'آزادی کی راہ پر' تھی جس کے گانے اس نے لکھے جبکہ مکالمے لکھنے والوں میں ہاجرہ مسرور، حمید اختر اور ابراہیم جلیس شامل تھے۔ حمید اختر اپنے کالم میں لکھتے ہیں'' وہ بہت دبلا پتلا بلکہ کمزور قسم کا نوجوان تھا۔ البتہ اس کا قد تقریباً چھ فٹ تھا۔ سفید پتلون قمیض اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ پاؤں میں وہ انگوٹھے والی چپل پہننے کو ترجیح دیتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں اسے اپنے بدشکل ہونے کا بہت احساس رہتا تھا۔ حالانکہ وہ اگر خوبصورت نہیں تھا تو بدصورت بھی ہرگز نہیں تھا۔ چہرے پر چیچک کے بہت ہلکے سے داغ تھے جو بہت غور سے اور قریب سے دیکھنے پر ہی نظر آتے۔ ناک خاصی لمبی تھی مگر اس کی شکل وصورت کا مجموعی تاثر خاصا خوشگوار تھا۔ اگر کوئی کمی تھی تو وہ اسے خوش لباسی اور بذلہ سنجی سے پورا کر لیتا تھا۔ وہ معاشقے سے زیادہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنے میں دلچسپی لیتا تھا اور بالعموم اس کے نتیجے میں ایک آدھ نظم لکھنے کے بعد وہ فرار کی راہیں ڈھونڈنے لگتا تھا۔ ساحر کی رہائش گاہ 'پرچھائیاں' ان دنوں خالی پڑی ہے۔ میں نے ۱۹۷۹ میں اس کے پاس قیام کے دوران اس کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر اس سے پوچھا تھا کہ اس نے اس جائداد کا کیا سوچا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں وصیت لکھ چکا ہے اور اس کا زیادہ حصہ فلاحی اداروں کو ملے گا مگر اس کی وفات کے بعد اس کی کوئی وصیت دستیاب نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے اس کی ماموں زاد بہنیں انور، سرور وہاں رہیں پھر یہ دونوں بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور اس وسیع عمارت پر کئی برس صابر 'دست' (حمید اختر نے یہی لکھا ہے) کا قبضہ رہا جہاں اس نے ساحر پبلشنگ ہاؤس قائم کر رکھا تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ الہ آباد

میں اس کے دو ماموں رہتے تھے، ان کی اولادیں بھی زندہ نہیں ہیں اور ایک طرح سے اس کی کروڑوں کی جائداد لاوارث پڑی ہے اور اپنے مالک، اس بڑے شاعر کی یاد میں سرنگوں ہے۔'' (ساحر کی یاد میں)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ساحر کے سینے میں ایک ایسا دل دھڑکتا تھا جو دوسروں کی پریشانی دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ فلمی دنیا کے خوفناک اور بے رحم نشیب و فراز کے کتنے ہی ان گنت قصے سننے میں آئے ہیں اور ہمیشہ آتے رہیں گے۔ آغا جانی کاشمیری کی خود نوشت ''سحر ہونے تک'' پڑھیں یا آغا اشرف کی ''ایک دل ہزار داستان''.... یہ قصے ہمیں اس ناپائدار زندگی کا اصلی اور تلخ چہرہ دکھاتے ہیں جس کی چکا چوند روشنیوں کے پیچھے اندھیرے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ایک وقت تھا جب امرتسر سے تعلق رکھنے والے ماسٹر نثار کا ہندوستانی فلمی صنعت میں طوطی بولتا تھا۔ مس کجن کے ساتھ جس کی جیسی جوڑی تھی، ویسی آج تک کوئی نہ بنا سکا۔ پروانے قطار اندر قطار اس کی ایک جھلک کے متمنی ہوا کرتے تھے۔ اسی ماسٹر نثار کو ساحر نے ایک موقع پر کاردار اسٹوڈیو میں اس حال میں دیکھا کہ اس کا کلیجہ خون ہو گیا۔ کرشن ادیب (م: ۷ جولائی ۱۹۹۹) اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے۔ انہوں نے ماسٹر نثار کو بی آر چوپڑہ کے ائیر کنڈیشنڈ دفتر کے باہر چپراسیوں کی وضع قطع میں سخت گرمی میں بیٹھے دیکھا جو ہر آنے جانے والے کو بلا ضرورت سلام کر رہا تھا۔ ساحر، کرشن ادیب کے ساتھ ہی وہاں آیا تھا۔ چوپڑہ کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ساحر نے ماسٹر کو اگلے روز ملاقات کے لیے بلانے کا سندیسہ بھیجا، وہ ماسٹر کو کچھ کام دینا چاہتا تھا۔ دو گھنٹے گزار کر جب یہ لوگ باہر نکلے تو ماسٹر نثار نے جھک کر ساحر کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساحر نے اسے سینے سے لگایا اور پھر بغل میں ہاتھ دے کر اپنی گاڑی تک لے گیا اور کہا ''چلیے! جہاں آپ کو جانا ہے، میں چھوڑے دیتا ہوں۔'' .... ماسٹر نثار ان دنوں ایک کھولی میں رہا کرتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ بعد میں کرشن ادیب کو ساحر نے بتایا کہ اس شخص کے پاس دنیا کی مہنگی ترین گاڑی رولز رائس ہوا کرتی تھی۔

کرشن ادیب نے اپنے مضمون ''ساحر یادوں کے آئینے میں'' میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وادی چنبل کے ڈاکوؤں کی کہانی پر مبنی فلم ''مجھے جینے دو'' نمائش کے لیے پیش کی گئی اور چنبل کے ڈاکوؤں نے بھی اسے دیکھا۔ اس فلم کا نغمہ نگار ساحر تھا۔ ساحر انہی دنوں ایک مرتبہ کرشن چندر اور اپنی والدہ اور بہن انور کے ہمراہ لدھیانہ جا رہا تھا کہ رستے میں گوالیار شوپوری کے مقام پر ڈاکوؤں کے سردار نے اس کی کار کو روک لیا۔ اسے خبر تھی کہ ساحر لدھیانوی اس رستے پر سفر کر رہا ہے۔ سردار نے ساحر سے استفسار کیا کہ کیا آپ وہی ساحر لدھیانوی ہیں جس نے ''مجھے جینے دو'' کے گانے لکھے ہیں؟ ساحر سمیت سبھوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ڈرتے ڈرتے حامی بھری اور ادھر سردار کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ان سب کو اپنے اڈے پر لے گیا، رات وہیں بسر

ہوئی، ساحر اپنا کلام سناتا رہا اور تڑ کے ڈاکوؤں نے انہیں عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا۔

معروف و بیباک افسانہ نگار واجدہ تبسم (م: ۷ دسمبر ۲۰۱۰) کو ساحر سے ایک تعلق خاطر تھا۔ ساحر ان کی ناز برداریاں کیا کرتے تھے، شفقت کیا کرتے تھے۔ واجدہ، ساحر کی غیر متوازن شخصیت پر اعتراض کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دیا کرتی تھیں، ملاحظہ ہو: ''ایک شخص جس نے شادی نہ کی، نہ بیوی کی قربت میسر آئی، نہ ازدواجی زندگی کا سکھ دیکھا، نہ بچوں کی جنت کے مزے لوٹے، اس کی محرومیوں کے بارے میں بھی تو سوچو۔ اگر یہ شخص اپنی ہی تقدیر لکھنے پر قادر ہوتا، اپنا کاتب تقدیر آپ ہوتا تو ہر مرد، ہر عورت، ہر انسان اپنے آپ کو بیحد خوبصورت بناتا، بیحد تعلیم یافتہ بناتا، بیحد امیر بناتا۔ اچھا جیون ساتھی جنتا، خوب اولاد، خاص طور سے بیٹے اپنے لیے چنتا۔ لیکن ہم سب کسی اور کے قلم کا لکھا پورا کر رہے ہیں۔ اچھے سے کر رہے ہیں یا برے سے کر رہے ہیں بہرحال زندگی کو گزار رہے ہیں۔ تو کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جو اپنی محرومیوں کے باوجود دوسروں کے لیے جئیں۔''

یاد ش بخیر، ہمارے یہاں ایک ہوتے تھے سعید رضا سعید۔ آج ان کو یاد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ نامور صحافی، ادیب، شاعر و ادیب تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سعید رضا سعید، معروف شاعرہ منور سلطانہ کے خاوند تھے تو شاید بات بنے گی۔۔۔۔ سعید رضا، جولائی ۱۹۲۹ میں اجمیر میں پیدا ہوئے اور ۲۱ جولائی ۱۹۹۵ میں لاس اینجلس میں انتقال کیا۔ سعید رضا ہمیں غیر منقسم ہندوستان اور ساحر لدھیانوی کی ایک جھلک یوں دکھاتے ہیں:

''جگر صاحب جب بھی کسی آل انڈیا مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آتے تھے، اپنے کسی ہونہار شاگرد کو ساتھ لاتے اور فلم انڈسٹری میں متعارف کرا کے چلے جایا کرتے تھے۔ شکیل اور مجروح کو بھی جگر صاحب نے دریافت کیا تھا اور انہوں نے پرانے جمے ہوئے شاعروں مدھوک، قمر جلال آبادی وغیرہ کی فصیلوں میں رخنے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ ساحر بمبئی آئے تو انہیں جگر صاحب جیسی کسی بیساکھی کا سہارا نصیب نہیں تھا۔ وہ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر چلتے ہوئے داخل ہوئے۔ مجروح ہوشیار آدمی تھے۔ باغبان اور صیاد دونوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ سیاسی مشاعروں میں آتے تو یہ پڑھ کر داد سمیٹے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے تھے کارواں بنتا گیا

اور فلموں میں اس قسم کے گیت لکھ کر پیسے سمیٹتے:

ع نجر لاگی راجہ تورے بنگلے پر

لیکن اس قسم کی سمجھوتے بازی ساحر کی فطرت کے خلاف تھی۔ کیمونسٹ ہونے کا لیبل ان پر بھی لگ چکا تھا اس لیے کہ انہوں نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اردو، مارواڑی اور گجراتی پروڈیوسر اس لفظ سے ایسے بدکتے تھے جیسے لال کپڑے سے بیل۔ شروع شروع میں ناکامیاں ہوئیں۔ ایک آدھ چانس مل جاتا تو پیسے نہیں ملتے۔ ساحر نے بہت سخت دن گزارے۔ لیکن حالات کی سختیاں اس دبلے پتلے نوجوان کو توڑ نہیں سکیں۔ اور پھر برف ٹوٹی۔ ساحر کے گیت ہندوستان کے چوٹی کے گلوکاروں کی آواز میں گونجنے لگے۔'' (ساحر چلا گیا۔ سحر باقی ہے)

شہرت آئی تو اپنے جلو میں ساحر کے لیے بہت کچھ لے کر آئی۔ ایوارڈز کی لائن لگ گئی۔ اہل لدھیانہ کیوں پیچھے رہتے، وہ تو اس کی جنم بھومی کے باسی تھے۔ ۱۹۷۵ میں سول لائن لدھیانہ میں ایک سڑک کا نام ساحر روڈ رکھا گیا۔ اس کی تقریب میں موجود تھے کشمیری لال ذاکر۔ ان کو یاد رہا کہ اسٹیج پر موجود سردار سیوا سنگھ نے سڑک کے بارے میں اعلان کیا تھا اور ساحر کو چند کلمات کی ادائیگی کی دعوت دی تھی۔ ساحر اپنے گلے میں پھولوں کا ہار پہنے آیا اور کہنے لگا ''میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے وہ اعزاز بخشا ہے جس کا میں 'مستحق' تھا'' پھر وہ تالیوں کی گونج میں ایک توقف کے بعد بولا تھا ''میں اس اعزاز کا اس لیے حق دار ہوں کہ میری تمام عمر سڑکوں پر گزری ہے''۔ اس مرتبہ تمام ہال تالیوں کے ساتھ ساتھ قہقہوں سے بھی گونج اٹھا تھا۔

۲۵ اکتوبر ۲۰۱۳ کو ساحر لدھیانوی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۳۳ برس ہو جائیں گے، ۱۹۸۰ میں اسی مہینے، اسی تاریخ کو ''تلخ بستہ اداسی کے شاعر'' نے ۵۹ برس کی عمر میں اپنے دوست ڈاکٹر آر۔ پی۔ کپور کے بازوؤں میں دم توڑا تھا۔ ؎ مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو

☆☆☆

حوالہ جات:

۔۔۔ آشنائیاں کیا کیا۔ حمید اختر۔ ۱۹۸۷۔ جنگ پبلیکیشنز، لاہور

۔۔۔ گلستانِ ادب کی سنہری یادیں۔ اے حمید۔ مکتبہ القریش، لاہور۔ ۲۰۰۷

۔۔۔ لاہور کے نوادرات۔ قاضی اختر جوناگڑھی۔ ماہنامہ الحمراء۔ فروری ۲۰۱۲

۔۔۔ میں تینوں فیر ملاں گی۔ سلیم پاشا۔ سنبل، راولپنڈی۔ ۲۰۰۹

۔۔۔ احوالِ واقعی۔ حمید اختر۔ بک ہوم، لاہور۔ ۲۰۰۵

۔۔۔ ساحر کا فن اور شخصیت۔ سلطانہ مہر۔ ادارہ تحریر، گلشن اقبال، کراچی۔ ۱۹۸۹

شفیعہ قادری، حیدرآباد

ساحر لدھیانوی
(اور اُس نے میری ہتھیلی پر اپنا نام لکھ دیا)

"مجھے یاد ہے ایک مشاعرہ میں کچھ لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے سب لوگ چلے گئے اور میں اکیلی اُس کے پاس کھڑی رہ گئی تو ہنستے ہوئے میں نے اپنی ہتھیلی اُس کے سامنے بڑھادی کورے کاغذ کی طرح اور اُس نے میری ہتھیلی پر اپنا نام لکھ دیا اور کہا بلینک چیک پر میرے دستخط ہیں۔ جو رقم چاہو لکھ لینا اور جب چاہو کیش کروالینا۔ چاہے وہ کاغذ مانس کی ہتھیلی تھی لیکن اُس نے کورے کاغذ کا نصیب پایا تھا اس لئے کوئی صرف اس پر نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ صرف تو آج بھی میرے پاس نہیں۔ یہ تو محض کورے کاغذ کی داستاں ہے۔ اس داستان کی ابتداء بھی خاموشی تھی اور ساری عمر اس کی انتہا بھی خاموش رہی۔ آج سے چالس برس پہلے جب لاہور میں ساحر مجھ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ آکر چپ چاپ سگریٹ پیتا رہتا۔ راکھ دانی جب سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر جاتی تو وہ چلا جاتا اور اس کے جانے کے بعد میں اکیلی سگریٹ کے اُن ٹکڑوں کو جلا کر پیتی تھی۔

میرے اور اُس کے سگریٹ کا دھواں ہوا میں ملتا تھا۔ سانسیں بھی ہوا میں ملتی رہیں نظموں کے لفظ بھی ہوا میں۔ سوچ رہی ہوں ہوا کوئی بھی فاصلہ طے کرسکتی ہے وہ پہلے بھی شہروں کا فاصلہ طے کرتی تھی۔ اب اس دُنیا اور اِس دنیا کا فاصلہ بھی ضرور طے کرے گا۔"

امریتا پریتم نے ساحر کی شخصیت اور فن سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار جس انداز سے کیا ہے ایسی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اس ایک انوکھی مثال کے باوجود اُردو دُنیا میں ایسے ہزاروں لوگ بھی ہوں گے جو ساحر کی شخصیت اور اس کے فن کو شدت سے محسوس کرتے ہوں گے۔

ترقی پسند شاعروں میں ساحر ایک باوقار شخصیت اور اہم مرتبہ کے حامل تھے ان کا شمار مقبول ترین ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے ساحر اُن خوش نصیب شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی شاعرانہ عظمت اور اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف نہ صرف اُن کے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں نے ہی کیا ہے بلکہ صفِ اوّل کے نقادوں اور مبصرین نے بھی سراہا ہے۔

اُردو زبان کے اس مقبول ترین شاعر نے ۱۸ر مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ کے ایک جاگیردار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ اُن کے دادا فتح محمد لدھیانہ کے نامور رئیس اور بڑے زمیندار تھے۔ اُن کے والد کا نام

فضل محمد تھا۔ اُن کی والدہ سردار بیگم کشمیر النسل تھیں۔

ساحرؔ کے والد جاگیرداری نظام کی جارحانہ روایات وخصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے رعیت اور کسانوں پر طرح طرح کے ظلم واستبداد کو روا رکھتے تھے۔ اُن کا زیادہ وقت عیش وعشرت اور رنگ رلیوں میں گزرتا تھا۔ اس بے راہ روی کے ماحول میں ساحرؔ کی والدہ کا دم گھٹتا تھا وہ اپنے شوہر کی عیش کوشیوں اور بے اعتدالیوں سے بے زار آچکی تھیں انہوں نے اپنے شوہر کو اس غلط روی سے ہٹانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی کوئی کوشش کارگر ثابت نہیں ہوئی بالآخر انہیں اپنے شوہر سے ترکِ تعلق کرنا پڑا اور وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں اُس وقت ساحرؔ کی عمر صرف چھ ماہ تھی ساحرؔ نے اپنی تعلیم ماں کی سرپرستی میں جاری رکھی۔

ساحرؔ اسکول کے زمانے میں ہی شعر وشاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ ساحرؔ لدھیانوی نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا۔ اُس زمانے میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہوئے۔ اور اس کی سرگرمیوں کو بڑھاتے رہے۔ وہ مزدوروں کے اجتماع اور سیاسی جلسوں کو مخاطب کرنے لگے۔ جلسوں میں اپنی سیاسی نظمیں بھی سنایا کرتے تھے۔

ساحرؔ کے والد چونکہ ایک جاگیردار تھے اس لئے اُنھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ اُن کا بیٹا ترقی پسند رجحانات کو پروان چڑھائے مزدوروں اور سیاسی جلسوں کو مخاطب کرے اور نظمیں سُنایا کرے۔

ایک بار جب ایک ڈپٹی کلکٹر نے ساحرؔ کی شاعری کی تعریف کی تھی تو وہ بہت خوش ہوئے اور فخر محسوس کرنے لگے کہ اُن کا بیٹا شاعر بن گیا ہے لیکن جب اُنھیں پتہ چلا کہ وہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف آواز بلند کررہے ہیں تو انھیں بہت دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ اللہ نے ایسی اولاد دی کہ باپ کی زمینداری کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

ساحرؔ کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے والد پر انگریزوں کا بار بار عتاب نازل ہوا۔ ساحرؔ کی بعض نظمیں ضبط کرلی گئیں۔ بی۔ اے کے آخری سال کے بعد وہ لدھیانہ سے لاہور چلے گئے۔ جہاں انہوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں ساحرؔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے۔ یہاں ان کی سیاسی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئیں کہ انھیں کالج چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اگلے سال انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن وہاں کا ماحول بھی اُن کو راس نہ آیا۔ اِن حالات میں ساحرؔ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اُنھیں ہمیشہ کے لئے کالج چھوڑنا پڑا۔ ساحرؔ ادبِ لطیف کے علاوہ شاہکار اور سویرا کے بھی مدیر کی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد فسادات پھوٹ پڑے اور لدھیانہ بھی فساد کی زد میں آگیا۔ اس خونیں

فسادات کے زمانے میں ساحر کی والدہ لدھیانہ میں تھیں سخت پریشانی کے عالم میں ساحر اور اُن کی والدہ اپنی جان ہتھیلی پہ لے کر کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچے۔ دہلی میں ایک ہندو دوست کے ہاں رہے اس کے بعد پھر ایک سکھ دوست کے گھر منتقل ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے دہلی سے رسالہ شاہراہ جاری کیا۔ ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی میں ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس ہوئی اس کانفرنس کے بعد ساحر نے بمبئی میں سکونت اختیار کی۔ پہلے کرشن چندر کے ہاں رہے۔ بمبئی پہنچ کر وہ فلموں کے لئے گانے لکھنے لگے۔ ''بازی'' ان کی پہلی فلم تھی۔

ساحر کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' ساحر کی طالب علمی کے زمانے میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے ۲۳ ایڈیشن اُردو میں اور ۱۲ ایڈیشن ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں پنجابی ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے ۱۹۵۵ء میں ان کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئی۔ پرچھائیاں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے تراجم نہ صرف ہندی اور مراٹھی بلکہ انگریزی میں بھی ہو چکے ہیں ۱۹۶۰ء کے بعد ۱۹۷۱ء تک جو کچھ نظمیں، غزلیں کہی ہیں وہ ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' میں شامل ہیں اس مجموعہ پر ساحر کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور مہاراشٹر اسٹیٹ ایوارڈ ملے۔ ۱۹۷۱ء میں اُنھیں پدم شری کا اعزاز عطا کیا گیا۔

''پرچھائیاں'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

جوان رات کے سینے میں دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسم نازنین کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں اُفق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح،
وہ پیڑ جس کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی زمیں کی طرح

تلخیاں اور پرچھائیاں، آؤ کہ کوئی خواب بنیں' گاتا جائے بنجارہ'، ایسے مجموعے ہیں جن کے مطالعے سے ساحر کی انسان دوستی، معاشرے کے نشیب و فراز سے ان کی وابستگی، اُجالوں کی چاہت، احساس کی بالیدگی، پاکیزہ جذبات کی خوشبو اور زندگی کے شعور کا نمایاں عکس دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔

ساحر ایک ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن کی شاعری کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں، انگریزی، فرانسیسی، چیک، روسی، فارسی اور عربی میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

۲۶ را کتوبر ۱۹۸۰ء کو اُردو کا یہ روشن ستارہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

ساحر کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری، مشاہدات، تجربات، احساسات اور جذبات کی آئینہ ار ہے۔ ساحر یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان اگر چیکہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے انگریزی سامراج کے زیر اثر ہے لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اس اثر کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کے روشن مستقبل کے خواہاں ہیں۔

وہ ہندوستان کے ایک ایسے روشن مستقبل کو دیکھ رہے ہیں جس کی صبح کی پہلی کرن ایک خوش آئند کیفیات کی حامل رہے گی اس دنیا میں چھوٹے بڑے کا فرق مٹ جائے گا غریب اور امیر ایک ساتھ رہیں گے اپنے دکھ درد کو ہم آپس میں بانٹ لیں گے مساوات، برابری کا چلن عام رہے گا ہر ایک مذہب کے ماننے والوں کا احترام کیا جائے گا جہاں مقدس کتابوں کی بے حرمتی نہیں ہوگی۔ جہاں ماں بہنوں کی آبرو پر آنچ نہ آئے گی جہاں سب لوگ اپنے اپنے انداز سے جئیں گے۔ سورج کی روشنی سے سب لوگ یکساں فیض حاصل کریں گے جہاں غلامی جہل افلاس کا خاتمہ ہوگا۔ مذہب کے نام پر خون خرابہ نہیں ہوگا۔

ساحر کا ایقان ہے کہ وہ صبح کبھی تو آئے گی جس کا انتظار صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔

ساحر بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں،

پناہ لیتا ہے جن مجسموں میں تیرہ نظام
وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں
اُبھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں
ہزار برق گرے یا کہ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے

سیاسی و سماجی شعور جو اشتراکی فلسفہ کا مرہون منت ہے ساحر کے مزاج میں رچ بس گیا ہے ساحر نے سماج کے اُونچے طبقوں کی رنگ رلیوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے وہ نہ صرف اپنے خاندان کے باغی تھے بلکہ اس طبقے کے بھی باغی تھے جو زندگی کے مثبت اقدار سے دامن کشاں رہے یہی باغیانہ رجحانات ان کی تمام شاعری پر مسلط ہیں۔ ساحر ایک حد تک اپنے ذاتی غم کو برداشت کر لیتے ہیں لیکن سماج کے غم کو وہ کبھی بھی

برداشت نہیں کر پاتے۔ ہمیشہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے ہیں۔

اُردو شاعری میں صنف غزل بعد میں آئی۔ صنفِ غزل سے پہلے نظمیہ شاعری کی اصناف کو فروغ ہوا۔ سب سے پہلے بزرگان دین اور صوفیائے کرام نے تصوف سلوک، فقہ کے موضوعات پر نظمیں لکھیں آگے چل کر مرثیہ کی صنف اپنے کمال کو پہنچی۔

اُردو میں جدید طرز کی نظم نگاری کو پروان چڑھانے میں حلقہ اربابِ ذوق کے شاعروں نے اہم حصہ ادا کیا ہے ساحؔر نے اگر چہ کہ نظم نگاری کے لئے پُرانے سانچے استعمال کئے تھے لیکن ان کو روایتی انداز میں نہیں برتا۔ ساحؔر نے زیادہ سے زیادہ نظمیں بند والے سانچے میں کہیں ہیں۔ ''خون پھر خون ہے'' ساحؔر کی مشہور نظم ہے۔ یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

ساحؔر کے مجموعوں میں صرف دو آزاد نظمیں ملتی ہیں جن میں سے ایک نظم ''آج'' ہے جو فسادات کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ پرچھائیاں، ایک ایسی طویل نظم ہے جو مختلف بحروں میں کہی گئی ہے شروع شروع میں ترقی پسند شاعروں نے صنفِ غزل کی مخالفت کی لیکن رفتہ رفتہ وہ غزل کی سحر کاری سے بچ نہ سکے۔

ساحؔر اگر چیکہ ایک نظم نگار شاعر کی حیثیت سے شعری ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن ایک منفرد غزل گو کی حیثیت سے بھی شہرت کے مالک ہیں اگر چیکہ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلیں بہت کم ہیں۔ ساحؔر نے صنف غزل میں غزل کی بنیادی روایات کی بڑے سلیقے سے پاسداری کی ہے۔

ساحؔر اپنی غزلوں میں غزل کی روایتی زبان اور روایتی اسلوب کا استعمال نہیں کرتے۔ اُن کی غزلوں میں تازگی، لطافت، شگفتگی اور تاثر پایا جاتا ہے

ساحؔر کی عشقیہ شاعری کا ایک خاص وصف، ترکِ تعلق، ترکِ الفت، بھی ہے ایک مقام پر وہ کہہ گئے ہیں۔

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

فلمی شاعر کی حیثیت سے بھی ساحؔر نے بڑا نام کمایا ہے جب ساحؔر لدھیانوی ایک فلمی شاعر کی حیثیت سے فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے تو اس وقت فلمی گیتوں کا میعار کافی گرا ہوا تھا۔ لیکن ساحؔر نے اپنی گیتوں میں ادبیت کو برقرار رکھا اور آرزوؔ لکھنوی نے جو عمدہ روایت چھوڑی تھی اُس کی بازیافت اور فلم انڈسٹری کو نکھری ستھری ادبیت سے روشناس کرایا۔ ساحؔر نے آزادانہ طور پر اپنی پسند کی شاعری کی۔ ان کے گیتوں کا ایک اہم موضوع محبت اور اس کی عظمت بھی ہے۔ ان کے گیتوں کی سب سے نمایاں خصوصیات ان کا ترقی پسند

انہ مواد ہے۔ وہ ایک بیدار اور پختہ شعور کے ساتھ فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔

یہ صحیح ہے کہ فلمی شاعری کی تکنیک ان کی شاعری کی تکنیک سے میل نہیں کھاتی لیکن ساحر نے اپنی فلمی گیتوں نظموں اور غزلوں کو ادب کے معیار سے گرنے نہیں دیا فلمی چھاپ اُن پر نہیں پڑنے دی مختلف قسم کی تجارتی اور تکنیکل پابندیوں کے باوجود اپنے لئے ایک علیحدہ راہ نکالی اور اس میں کامیاب رہے۔

گیت نگار کو بنی بنائی دُھنوں پر موقع محل کے لحاظ سے شعر کہنا پڑتا ہے۔ ساحرؔ نے ہر قسم کے موضوعات پر فلمی گیت لکھے ہیں۔ یہ گیت ملاحظہ ہو۔

''وہ صبح کبھی تو آئے گی''

ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ کے بادل پگھلیں گے جب سکھ کا ساگر چھلکے گا

ساحرؔ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے فلموں کیلئے ایسے گیت لکھے جو سیاسی اور سماجی شعور سے معمور ہیں۔ ساحرؔ نے اپنے قلم کی طاقت سے فلمی گیتوں کو نہ صرف ایک ادبی روپ دیا بلکہ اپنے گیتوں کو حُسن کی طاقت، عشق کی وارفتگی اور سماجی شعور دیا اور وہ اپنی آخری سانسوں تک اپنی اس انفرادیت کو باقی رکھنے میں کامیاب رہے۔

ساحرؔ نے جہاں استعارات و کنایات سے کام لیا ہے وہاں انہوں نے اظہار کے بیانیہ اور خطیبانہ طریقوں اور پیرایوں سے بھی کام لیا ہے ساحر میں یہ سلیقہ تھا کہ وہ اپنی شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب بہت سلیقے سے کیا کرتے تھے ان کی لفظیات میں فارسی اور ہندی کا امتزاج بھی ہے بعض گیتوں کو انہوں نے ہندی کی عام فہم لفظیات سے سنوارا ہے۔ بعض گیتوں میں فارسی لفظیات کافی نمایاں ہیں۔ ان کے اشعار نظم کے متن اور اس کی روح کی ہمیشہ پاسداری کیا کرتے ہیں۔

ساحر کی محاکات نگاری زندگی کے وسیع تر مشاہدات، تجربات واقفیت کے علاوہ گہرے سماجی شعور کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔

گلوں کا رنگ، ستاروں کی روشنی ہوتے
سنورتے اتنا کہ معیارِ زندگی ہوتے
بتوں کی چاہ نے کافر بنادیا فرحتؔ
خدا کو پوجتے اب تک تو ہم ولی ہوتے

خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم

جہاتِ ساحرؔ

ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ

مقبولیت اور امکانات کے درمیان معلق شاعر

اردو نظم نگاری میں ایسے شاعروں کی کمی نہیں جن کی قدر و منزلت کے تعین میں تنقید نے اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن ایسے مستند شاعر، معدودے چند ہی رہے ہیں جنہوں نے اپنے قاری کے لئے نہ تو ترسیل وابلاغ کا مسئلہ پیدا کیا ہو اور نہ ان کی مقبولیت کو تنقیدی تحریروں کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ تاہم جب کسی شاعر کے کلام کے بارے میں اس نوع کی رائے دی جاتی ہے تو سب سے اہم سوال یہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ایسی شاعری جو اظہار کا بالواسطہ اسلوب نہیں اپناتی، اور پڑھنے یا سننے والے کے دل و دماغ کو براہِ راست اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ اپنے زمانی حوالوں سے کٹ کر اپنا اثر تو نہیں کھو دیتی؟ کیا ایسی شاعری اپنی جذباتی اپیل کے باعث جس شدت سے اثر انداز ہوتی ہے، اسی شدت کے ساتھ بہت جلد ذہنوں سے زائل تو نہیں ہو جاتی؟ اس سوال، یا شاعری کے بارے میں اس قسم کے سوالات کے جواب کے لئے ٹھوس استدلال کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے ساحر لدھیانوی کی شاعری کو سامنے رکھے بغیر کوئی استدلال قائم نہیں کیا جا سکتا۔ سر دست دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ساحر کو اگر غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے اور خاص عمر اور ذہنی سطح کے قاری کے لئے ان کی شاعری کی اپیل بعض اہم اور سربرآوردہ شاعروں سے بھی زیادہ ہے تو اس کے پیچھے کن نمایاں محرکات کی کارفرمائی رہی ہے۔

شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ ساحر اُن خوش نصیب شاعروں میں سے ایک ہیں، جن کے موضوعات اور طرز ادا کو قابلِ رشک حد تک مقبولیت حاصل رہی۔ مگر موضوعات کی سطح پر دیکھا جائے تو ان کی شاعری کا المیاتی پہلو اور سیاسی اور سماجی اعتبار سے استحصال، جبر، سرمایہ داری اور جنگ کے خلاف ان کی شاعری کا سیاق و سباق فوری طور پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ ساحر کی شاعری کا یہ تاثر ہر طبقۂ فکر اور ہر عمر کے قاری کے لئے کم و بیش یکساں یا ایک جیسا کیوں

نہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ عنفوانِ شباب یا نابلوغت فکر کے زمانے اثر پذیری کے لئے ہموار سنسنی خیز حد تک حساس دل ودماغ ہی ساحر کی شاعری سے غیر معمولی اثر قبول کرتے ہیں، اور عمر اور عقل کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس شاعری کی طرف پختہ ردعمل اس کی اپیل کو ہمہ گیر اور دیرپا کیوں ثابت نہیں کر پاتا؟ اس قسم کے سوالات کا سامنا کئے بغیر جس طرح مجاز، اختر شیرانی، جمیل مظہری اور جگر مرادآبادی کے سلسلے میں کوئی معقول تنقیدی رائے قائم نہیں کی جاسکتی اسی طرح ساحر لدھیانوی کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین بھی اس نوع کے سوالات کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جاسکتا۔

اس ضمن میں یوں تو نظم اور غزل جیسی اصناف کے لئے دو الگ پیمانے بھی مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ تاہم اگر شاعری کے دیرپا ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے کو علی الاطلاق بھی سامنے رکھا جائے تو کسی حد تک اس مسئلے کو آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

اس بات کو تقریباً مسلمات کا درجہ حاصل ہے کہ شاعری میں احساس اور جذبے کی ایسی اہمیت ہے کہ اگر فکر اور فلسفہ کو بھی شعری قالب میں ڈھلنا ہے تو فکر جب تک محسوس فکر نہ بنے اور فلسفہ جب تک جذبہ واحساس کی سطح سے ہم آہنگ نہ ہو جائے، بڑی شاعری تو کیا اچھی اور قابلِ لحاظ شاعری بھی مشکل سے وجود میں آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فکری شاعری، اس وقت تک شعری آرٹ کا درجہ حاصل نہیں کر پاتی جب تک شاعرانہ تجربہ، اظہار کی تہہ داری کا ہنر نہیں سیکھ لیتا۔ لیکن ساحر لدھیانوی کی شاعری کا مطالعہ اس سے بالکل مختلف زاویۂ نظر کا تقاضہ کرتا ہے، اس لئے کہ اس میں فکری دبازت کی کمی اور جذبے کی شدت ہی اہل نظر نقادوں کے نزدیک سب سے زیادہ محلِ نظر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح فکر کے لئے محسوس فکر کی صورت اختیار کرنا ایک لازمی شرط ہے اسی طرح جذباتی وفور کے لئے بھی شعری اظہار کی سطح تک آتے آتے غیر شخصی اور دیرپا اقدار میں ڈھلنا ناگزیر ہوتا ہے۔ ساحر کی شاعری چونکہ رومانی شاعری کے ایک مخصوص اسلوب، یعنی ہجر زدہ محبت کی الم انگیزی اور کسی حد تک رومانی آدرش واد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لئے جذباتی وفور اور رومانی آدرش واد کی عمر میں اس قسم کی شاعری کی مقبولیت غیر معمولی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں آئیڈیلزم یا آدرش واد کو کسی عمر کے ساتھ مختص نہیں کیا جاسکتا، مگر اس حقیقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ عنفوانِ شباب کا آئیڈیلزم پختہ عمر کے آئیڈیلزم سے زیادہ شدید اور طاقت ور ہوتا ہے۔ مگر ساحر کی شاعری میں تو ناکام محبت کی یاس انگیزی، ان کے آدرش واد پر بھی غالب نظر آتی ہے، اس لئے یہ شاعری میں بہت دور تک انسانی شعور کے ارتقا کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ساحر کے موضوعات کو نظر انداز کر کے دیکھیں تو ایک اور صورت حال سے ہمارا سامنا ہوتا ہے کہ ان کے یہاں راست اظہار کا اسلوب اور تہہ داری پیدا

کرنے کی فنی تدابیر کا فقدان بھی ان کی شاعری کے تاثر کو دیرپا اور دوررس نہیں بننے دیتا۔ لیکن اگر شعری تاریخ میں بیانیہ اسلوب کو کوئی اہمیت حاصل رہی ہے اور علامت اور استعارے پر مکمل انحصار کے بجائے پیکر تراشی اور آہنگ کی قوت نے کسی شاعری کو زندہ رکھا ہے تو ساحر کی شاعری میں اس قسم کے شعری محاسن کی تلاش ہمیں لا حاصل دکھائی نہیں دیتی۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کی خوش آہنگی ہے۔ اس خوش آہنگی کی تعمیر و تشکیل میں پر پیچ تراکیب اور لفظی اور معنوی تعقیدات سے احتراز کا عمل دخل بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ساحر کے یہاں عجز بیان نام کی کوئی چیز نہیں اور وہ فارسی اور ہندی الفاظ اور تراکیب کے امتزاج سے خوش آہنگ لفظیات کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان کی لفظیات، علامتی ابہام سے پیدا ہونے والی تہہ داری سے بالعموم عاری ہونے کے باوجود قاری کو اپنی گرفت میں کیونکر لے لیتی ہے؟ تو اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ اور نہیں معلوم ہوتی کہ بسا اوقات وہ علامتوں میں بات نہ کہنے کے باوجود اپنے الفاظ کو استعاراتی سیاق و سباق دینے کے باعث امیج سازی اور پیکر تراشی کے عمدہ نمونے پیش کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی ایک نظم 'شکست' میں جب وہ اس طرح کے مصرعے موزوں کرتے ہیں کہ:

اور اب جب کہ مری روح کی پہنائی مین
ایک سنسان سی مغموم گھٹا چھائی ہے
تو، دمکتے ہوئے عارض کی شعائیں لے کر
گل شدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے

تو اندازہ ہوتا ہے کہ گھٹا، کے ساتھ سنسان اور مغموم ہونے کی صفات یا 'دمکتے ہوئے' عارض کی شعاعوں سے گل شدہ شمعیں جلانے کا پیکر، ایک ساتھ استعارہ سازی کی بھی عمدہ مثال پیش کرتا ہے اور تمثیل پیکر بھی ابھارتا ہے۔ اسی طرح ایک اور نظم کہ:

اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر (شعاعِ فردا)

یا پھر ان مصرعوں میں کہ:

یوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے (ہراس)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لب و رخسار کو شعاع، شمع یا چمکتے یا دمکتے ہوئے دوسرے معروض کی شکل میں دیکھنے اور دکھانے کا عمل ساحر کے تخیل کا ایسا زاویہ نظر ہے جو ان کی متعدد نظموں میں ان کی مخصوص شناخت، ایک خاص حد تک ہی سہی، مگر ضرور متعین کرتا ہے۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری کا خارجی حوالہ تو یقیناً ان کی ہجر زدہ ناکام محبت اور کہیں کہیں آئیڈیلزم کا زائیدہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان کا آئیڈیلزم بھی یادوں کو سرچشمۂ فیضان بناتا ہے۔ اور ان کی ہجر زدہ محبت بھی ناکامی اور سیاست کی راکھ میں زندگی، حوصلہ اور توانائی کی چنگاری تلاش کر لیتی ہے۔ اس طرح ساحر لدھیانوی اپنے ناسٹلجیا کو تخلیق کی قوتِ محرکہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نظم 'سرزمین یاس' اس کیفیت کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس نظم کی بحر، اس کا آہنگ، چھوٹے چھوٹے مصرعے، ابتدا سے ہی اپنے سحر میں اسیر کر لیتے ہیں۔ اس کے ابتدائی مصرعے اس طرح ہیں:

جینے سے دل بے زار ہے
ہر سانس اک آزار ہے
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

پوری نظم میں ایک کے بعد دوسری تصویر لگاتار ابھاری گئی ہے اور جب نظم ختم ہوتی ہے تو ایک ایسی موثر خود نوشت کا تاثر سا بن جاتا ہے جس میں لفظوں سے تصویریں اور پیکر بنائے گئے ہوں، لیکن اس نظم کو جو چیز، اس کی خوش آہنگی، روانی اور تصویر کشی کے باوجود فنی ارتفاع حاصل نہیں کرنے دیتی وہ اس نظم کا حد درجہ شخصی ہونا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ساحر اپنی بعض اور عمدہ نظموں میں بھی شعری تجربے کو غیر شخصی طور پر نہ برت پانے کے باعث ایک خاص سطح سے اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ لیکن ان کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں ان کی اس کمی کو استعاروں پر مبنی پیکر تراشی نے حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'تیری آواز' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں بعض فطری مظاہر کو محبوب کی آواز سے مربوط کیا گیا ہے اور اس طرح اس آواز کے وسیلے سے مختلف قسم کے پیکر تراشے گئے ہیں۔

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ

آسمانوں سے کوئی شوخ ستارہ ٹوٹے تیری آواز

ان چار مصرعوں میں پہلا مصرع ایک وقوعے کو پیش کرتا ہے۔ باقی تین مصرعے مجاز مرسل کی شکل میں بصری اور سماعی صورت گری کے مختلف نمونے سامنے لاتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ شاعر ان مصرعوں پر ہی بس نہیں کرتا، بلکہ اگلے چار اور مصرعوں میں نظم کے واحد متکلم اور خارجی مظاہر کائنات پر بھی اس آواز کی اثر انگیزی دکھا کر پیکروں کو اور ایک جہت دیتا ہے۔

شہد سا گھل گیا تلخابۂ تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں
دیر تک یوں تری مستانہ صدائیں گونجیں
جس طرح پھول چٹکنے لگیں ویرانے میں

متذکرہ دو بندوں میں پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹنے، زمینوں کی محبت میں آسمانوں سے شوخ ستارہ ٹوٹنے یا پھر تلخابۂ تنہائی میں شہد کی گھلاوٹ، یا دل کے سیہ خانے میں رنگت کا احساس اور پھول کی چٹک کو محبوب کی صدا کا نعم البدل بنا کر پیش کرنا، جیسی ساری کی ساری امیجری کے سبب زیر بحث نظم کو صرف تنہائی کے احساس یا ہجر کے کرب سے عبارت نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ صناعی، نظم کو ایسی تصویروں میں تبدیل کر دیتی ہے کہ شاعری اور مصوری کے فاصلے تھوڑی دیر کے لئے مٹتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں اور شاعر جب یہ کہتا ہے کہ:

قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گزرا

تو دیدار کی شبنم کا قطرہ ٹپکنا، ساحر کو ان شاعروں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے، جن کو صرف چند نادر استعاروں اور پیکروں کے خالق کی حیثیت سے عرصے تک یاد رکھا جاسکتا ہے۔

ساحر کی امیجری کی جستہ جستہ مثالیں تو ان کی متعدد نظموں میں بکھری پڑی ہیں، مگر ان کی ایک نظم 'منظر' اس سلسلے میں نمایاں ہی نہیں ممتاز بھی ہے۔ اس نظم کا ہر مصرع کسی نہ کسی پیکر کو جنم دیتا ہے اور پوری طرح ایک ایسی مکمل اکائی بنتی ہے جو نظم کی ہیئت کے لئے ایک لازمی شرط سمجھی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ پوری نظم پہلے مصرعے کے پیکر اور لفظیات سے نمو پذیر ہوئی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ہر مصرع ایک دوسرے سے لازمی طور پر مربوط اور ہر تصویر پچھلی تصویر کے کسی زاویے میں اضافہ کرتی ہے۔ نظم اس طرح ہے:

افق کے دریچوں سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مسکرائے

سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پُراسرار لے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلودہ پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
وہ دور ایک ٹیلے پہ آنچل سا چمکا
تصور میں لاکھوں دیئے جھلملائے (ایک منظر)

اس نظم میں افق کا دریچہ، کرنوں کا جھانکنا، کہرے کی چادر کا سمٹنا، پرندوں کی آواز سے کھیتوں کا چونکنا، پگڈنڈیوں سے پیڑوں کے سایے کا لپٹنا اور تصور میں دیئے جھلملانا وغیرہ ایک تصویر کے مختلف زاویے ہیں جو اپنے آپ میں استعارے بھی ہیں اور ایک استعارہ دوسرے استعارے سے مل کر نظم کو ایک عضویاتی کل بنانے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس نظم کا ایک اور عجیب حسن یہ ہے کہ کرنوں سے شروع یہ نظم دیئے کے جھلملانے کے ساتھ ختم ہوتی ہے جس سے ایک طرح صبح سے شام تک کی پوری تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے اور اس کے دائرے میں پورا دن سمٹ آتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کرنوں کا جھانکنا تو ایک واقعاتی منظر ہے مگر دیئے کا جھلملانا اور وہ بھی تصور میں، یہ بالکل ایک تصوراتی عمل ہے، مگر اس مرکب پیکر کو مربوط طور پر نمایاں کرنے والی یہ نظم تجسیم سے شروع ہو کر ایک ایسی تجرید پر ختم ہوئی ہے جو تجرید اس نظم کو زمانے اور شخصی حوالے سے بلند کر دیتی ہے۔ ویسے اگر آپ اس نظم کے آخری دو مصرعوں کو پہلے پڑھ کر پھر شروع سے پوری نظم پڑھیں تو اس میں مخفی فلیش بیک کی تکنیک کا کسی نشاندہی کے بغیر بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ساحر لدھیانوی کی نظموں میں جگہ جگہ بیانیہ اور خطابیہ لہجے اور اسلوب کا گمان گزرتا ہے۔ ایسی نظمیں جن کا بنیادی آہنگ 'بیانیہ' جیسا ہے وہ بالعموم یادوں پر مبنی ہیں اور ان کی واقعاتی ترتیب صرف یہ کہ وقوعوں کے تسلسل سے ایک آہنگ کی تشکیل کرتی ہے بلکہ ان میں واحد متکلم کے پرسونا persona کی حیثیت سے شاعر کے علاوہ محبوب سرمایہ دار یا امن کے دشمن کردار اپنی صفات کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور بیانیہ لہجہ کا تعین کرتے ہیں۔ اور ساحر کی ایسی نظمیں جن کا اسلوب خطابیہ ہے، ان کی بنیاد عموماً تخاطب یا تکلم پر قائم ہے، ان کی ایک نظم شعاعِ فردا ہے۔ اس کا پہلا بند کچھ اس طرح ہے:

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر

اور کچھ دیر اجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دل گیتی سے دھنواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا

بارہ مصرعوں کی اس نظم کے سات مصرعے 'اور کچھ' کے الفاظ کے ساتھ شروع ہوتے ہیں۔ ان مصرعوں میں سے بعض میں امیج سازی بھی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، تاہم اس کے خطابیہ اسلوب کی بالادستی دوسری خصوصیات کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔

اسی طرح ساحر کی ایک اور مشہور نظم ہے 'خون پھر خون ہے' جس کے ابتدائی دو مصرعے:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

ان مصرعوں کا ایک ایک لفظ یوں بھی خطابیہ اسلوب کا تقاضہ کرتا ہے، چنانچہ بعض بیانات کی وضاحت اور توثیق کے لئے اگر کئی کئی مصرعے استعمال کئے گئے ہیں، یا بعض تلازمات تکرار کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں تو یہ عین فطری طریق کار ہے۔ مثال کے طور پر ابتدائی دو مصرعوں کے بعد کے چار مصرعے ہیں:

خاک صحرا پہ جمے یا کف قاتل پہ جمے
فرق انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغ بے داد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

ظاہر ہے کہ خطابیہ وضاحت، مترادفات کا استعمال اور ایک واقعے کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنا، خطیبانہ آہنگ کا نہایت موثر ہتھیار رہے ہیں، سو ساحر نے بھی دو ایک نظم میں اس کو برقرار رکھا ہے۔

خطابت کا یہ لہجہ یوں تو ساحر کی نظم 'مجھے سوچنے دے' میں بھی ہے، مگر جو بلند آہنگی اور خطیبانہ تکرار کی کیفیت 'چکلے' میں ہے وہ ان کے خطابیہ اسلوب کو غیر مستحکم کرتی ہے۔ نظم 'چکلے' کا ہر بند ایک ایک کیفیت یا منظر کے لئے مختلف تناظر کی تکرار پر قائم ہے اور ہر بند کے بعد 'ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں' (ٹیپ مصرعے کو ترجیع بند ہیئت کی طرح دہرایا جاتا ہے۔ لیکن 'ثنا خوانِ تقدیس مشرق' کے الفاظ میں جو تعمیم ہے وہ آخری بند میں قائم نہیں رہ پاتا۔

ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ
یہ گلیاں یہ کوچے یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوان تقدیس مشرق کو لاؤ

ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

اس طرح متعدد بندوں میں متعین ہونے اور مستحکم ہونے والا خطابیہ آہنگ حصے کی بلند آہنگی اور جذباتی تشنج کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی کہ ساحر لدھیانوی کی نظموں میں ویسے تو خطابیہ اسلوب اور بیانیہ آہنگ بھی ملتا ہے مگر اس آہنگ کا تواتر اور تسلسل وہ دور تک قائم نہیں رکھ پاتے، اسی لئے ان کی مختلف زاویوں کی نظموں میں اس اسلوب و آہنگ کی مربوط نشاندہی مشکل سے ہی کی جاسکتی ہے۔ ان کی نظموں کو تجزیاتی نگاہ سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شعری تدبیر کاری اور شاعرانہ ہنرمندی ساحر کے امتیاز کی شناخت بن سکتی ہے تو وہ استعاراتی اور تمثیلی پیکروں کی تخلیق کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ویسے کہنے کو تو ان کی شناخت، ان کی شاعری کی جذباتی اپیل، آئیڈیلزم یا نیم بالغانہ سنسنی خیز حساسیت میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے مگر تجربے کی سطحیت اور جذباتی وفور کی اضطراری کیفیت، ان صفات کو شاعرانہ صفات کا درجہ نہیں دلا پاتی۔۔ جہاں تک ان کے پیکر تراش شاعرانہ تخیل کا سوال ہے تو اس سلسلے میں بعض نظموں کی مثالیں پہلے پیش کی جا چکیں۔ لیکن اگر اس سلسلے میں ساحر کی مشہور اور نمایاں نظم 'پرچھائیاں' کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا تو ان معروضات کی نامکمل سمجھا جائے گا۔

یہ بات درست ہے کہ 'پرچھائیں' ساحر کی ایک اہم اور نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم کی محاکاتی کیفیت کو کئی نقادوں نے سراہا ہے۔ مگر اس نظم میں پائے جانے والے ہیئت کے غیر رسمی تجربے کو بالعموم نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اگر ایک سے زیادہ بحروں کا استعمال کیا گیا ہے تو اس کی کیا معنویت ہے؟ اور اگر اس نظم کو دوسرے دو پیار کرنے والوں کے بغیر پیش کیا جاتا تو اس نظم کے محاسن میں کوئی اضافہ ہوتا یا اس میں تخفیف ہوتی؟ مثال کے طور پر اگر یہ کیا جائے کہ 'پرچھائیاں' کے دوسرے بند میں جہاں دو پیار کرنے والوں کو دیکھ کر تخیل کو مہمیز کیا گیا ہے، اگر ان چار مصرعوں کو نظم سے خارج بھی کر دیا جائے تو فضا کے تسلسل اور منطقی ربط کے اعتبار سے نظم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چار مصرعوں کی تخفیف کے بعد یہ بند کچھ اس طرح رہ جائے گا۔

وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے ہیں
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح
یہی فضا تھی یہی رت یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی

اب یہ بند شاید زیادہ پرقوت، زیادہ بھرپور اور زیادہ موثر بن گیا ہے۔ اس بند کے درمیانی مصرعے:

انہیں کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل

خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں

کا جواز سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ دوسرے دو محبت کرنے والوں کے اس حوالے سے نظم کے آخری حصے میں شاعر نے ایک نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ وہ نتیجہ اس قسم کے سہارے کے بغیر بھی اس نظم کی ساخت سے معترضہ جملوں کو الگ کرنے کے باوجود بحسن وخوبی نکل آتا ہے۔

ہیئتی نقطۂ نظر سے پر چھائیاں، میں شامل حشو وزوائد پر یوں تو اور بھی بعض اعتراضات وارد ہوسکتے ہیں۔ مگر یہ بات بادی النظر میں بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس کے آخری چند بندوں میں خطیبانہ بلند آہنگی پورے توازن کو متاثر کرتی ہے۔ وہی خطیبانہ آہنگ جو ساحر کی بعض دوسری نظموں میں ان کی خوبی بنتا ہے اور دو ایک پوری نظموں کو ایک لہجے سے موسوم کرنے کا ضامن ثابت ہوتا ہے، اسی کی افراط 'پر چھائیاں' کے آخری حصے کو ساخت کے اعتبار سے غیر ضروری اضافوں اور جذباتی تشنج سے دوچار کردیتی ہے۔ یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ آنکھوں میں کھٹکتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ پوری نظم کا لہجہ اس حد تک دھیمے آہنگ کا ہے کہ کہیں کہیں اس پر خود کلامی کا گمان گزرتا ہے۔ اس نظم کا بڑا حصہ ماضی کی بازیافت اور یادوں کے سہارے نت نئے مناظر، تصاویر، پیکر اور تمثیلات کے تواتر سے ایک نوع کا کولاژ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ساحر نے اس نظم میں مختلف استعاراتی اور تمثیلی تراکیب بنائی ہیں اور پھر ان کو پیکروں میں ڈھال دیا ہے۔ بھوک اگنے لگی کھلیانوں میں، افق پہ خون تمنائے دل کی لالی ہے، پر چھائیوں اور تنہائیوں کا جلنا، سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی شام، خوابوں کی رداؤں کا جلنا، یہ ساری تراکیب استعاروں اور تمثیل پر قائم ہیں۔ اور ان کی پیش بندی کے طور پر نظم کے پہلے دو بندوں کے آخری دو مصرعے:

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقین کی طرح

پہلے سے موجود ہیں جو نظم میں سامنے آنے والی تمثیلی صورت گری کا ماحول نظم کے ابتدائی مصرعوں سے ہی تیار کردیتے ہیں۔ اس نظم کا غالب حصہ حرکی تمثیلوں سے مملو ہے اور ان تمثیلوں نے زیرِ بحث طویل نظم کی ہیئت کو پوری طرح سنبھال رکھا ہے۔

جہاں تک 'پر چھائیاں' میں ایک سے زیادہ بحروں اور اوزان کے استعمال کا سوال ہے تو اس کی معنویت، بیان اور مواد کی مناسبت سے زبان اور اوزان کے انتخاب میں مضمر ہے جس کے باعث نظم زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، یکسانیت کا گمان نہیں گزرنے دیتی اور ساحر کی نظم گوئی میں ایک طرح کے ہیئتی تنوع کا اضافہ کرتی ہے۔

جب ہیئت پر ساحر کی قدرت اور ساخت کے مناسب ڈھنگ سے استعمال کرنے کا ذکر آ گیا ہے تو اس ضمن میں ساحر کی ایک اور نظم 'مفاہمت' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مفاہمت ایک پر تاثیر اور کلی طور پر استعاروں پر مبنی نظم ہے جو استعارے ابتدائی دو مصرعوں:

نشیبِ ارض پہ ذرّوں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید و سیاہ مل ہی گئے

میں خلق کیے گئے ہیں ان مصرعوں میں ذرہ، سفید اور سیاہ کی شکل میں جن اقدار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ان کے تلازمے شمعِ اخوت، چمکنا، تیرگی، فانوس، شاخ نور، ظلمت، شرارے، فصلِ گل، ضمیرِ ارض، وغیرہ پوری نظم میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نظم کا پس منظر بہ ظاہر ایک سمجھوتے کے نتیجے میں ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہے مگر اس سمجھوتے کے مضمرات میں خوف و ہراس، تشویش اور اندیشے بھی ہیں، جن میں سے بعض تو درست بھی ثابت ہوئے لیکن اگر عیاری اور چالبازی پر مبنی کسی بھی سمجھوتے کو اس نظم 'مفاہمت' کا مصداق ٹھہرا جائے تو یہ انطباق کوئی غلط انطباق نہ ہوگا۔ اسی لئے نظم کے آخری مصرعے:

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گُل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

باہمی اعتماد کے بغیر قائم ہونے والی کسی بھی مفاہمت کے سارے اندیشے کو استعاروں میں بیان کر دیتے ہیں۔ یہی اس نظم کی انفرادیت ہے اور یہی استعارہ سازی اور پیکریت اس نظم کو ساحر کی نظموں میں ان کی نظم 'ایک منظر' کی ہی طرح نمایاں مقام دلاتی ہے۔ ان دونوں نظموں میں شاعر کا اظہار بھی تہہ دار ہے اور حد درجہ تعمیم بھی نمایاں ہے۔

محولہ بالا جائزے اور تجزیے کے پس منظر میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ساحر لدھیانوی اگر اردو کے صفِ اول کے شاعر نہیں تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ ناقابلِ اعتبار غیر اہم شاعر ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر ساحر نے اپنی قدرتِ کلام کے ساتھ فنی تدبیر کاری پر کچھ توجہ دی ہوتی تو وہ اردو کے اہم شاعر قرار پاتے۔ ■■

حیدر قریشی، جرمنی

ساحر لدھیانوی: کچھ ادبی، کچھ ذاتی تاثر

ادبی دنیا میں داخل ہونے سے تھوڑا عرصہ قبل مجھے جن شاعروں نے غیر معمولی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا، ان میں ترقی پسندوں میں فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی جبکہ جدید نظم نگاروں میں میراجی اور ن م راشد سرِ فہرست تھے۔ مذہب کے روایتی شکنجہ کے خلاف شاعری پڑھ کر اُس عمر اور زمانہ میں اچھا لگتا تھا۔ اب بھی ایسا برا نہیں لگتا۔ اقبال کے ''شکوہ'' سے لے کر بعض ترقی پسندوں کے ہاں مذہب کی ظاہر پرستی کے ''مذہبی شکنجے'' کی مذمت تک ساری شاعری اچھی لگتی رہی ہے۔ لیکن ہستی باری تعالیٰ کا اقرار اور اس کی جستجو کا سفر ہمیشہ سے میری سوچ کا محور رہا ہے۔ چنانچہ جب ن۔ م راشد کے ہاں ''اسرافیل کی موت'' پڑھنے کا موقعہ ملا تو میں نے اس کی معنوی توجیہہ کر کے خود کو راشد کے قریب رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن جب راشد کے ہاں ''خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے'' (پہلی کرن) پڑھنے کا موقعہ ملا تو راشد کی نسبت طبیعت میں ایک تکدر پیدا ہو گیا۔ انہوں نے یہ کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ نیطشے اپنی مشہور تمثیل میں ''خدا کی موت'' کا اعلان کر چکا تھا اور راشد نے اسی بات کو دہرایا تھا، سو راشد کے معاملہ میں ایک فاصلہ سا پیدا ہوا۔ اس فاصلے کے احساس کو میراجی کی قربت کے احساس نے کسی حد تک سنبھالا دیا۔ میراجی کے ہاں شروع سے ہی جو حیران کر دینے والی بات ملی تھی، وہ ان کی نظم ''سلسلۂ روز و شب'' کی ابتدا تھی۔

''خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے''

دکھائی دینے اور دکھائی نہ دینے کا میراجی کا تصور ان کی نظم ''جزو اور کُل'' سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم ''سلسلۂ روز و شب'' کی آخری لائن تک خلا کا جوڑ کر ملتا ہے، وہ تدریجاً ہستی باری تعالیٰ کی تفہیم میں میرے کام آتا رہا۔ خلا کے توسط سے خدا کو سمجھنے میں میری یادوں کے باب ''رہے نام اللہ کا'' میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ سولہ سال کی عمر کی سوچ سے ساٹھ سال کی عمر تک کی سوچ کا سفر قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

ساحر لدھیانوی کے حوالے سے بات ترقی پسند شاعروں کی ہونا چاہیے تھی، میں جدید نظم گو شعراء کا ذکر لے

بیٹھا، لیکن ترقی پسند شعراء کی طرف آنے سے پہلے یہ تمہید ضروری تھی۔ اگر چہ یہ قدرے طویل ہوگئی ہے۔ جدید نظم کے میراجی اور راشد کی طرح ترقی پسند شاعروں میں سے مجھے فیض اور ساحر لدھیانوی زیادہ پسند رہے ہیں۔ فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی کو پسند کرنے میں پلڑا اوپر نیچے ہوتا رہتا۔ فیض رسمِ دعا یاد نہ ہونے کے باوجود دعا کے قائل تھے۔ میں رسمِ دنیا کو ایک حد تک نبھانا ضروری (مجبوری) سمجھتا ہوں لیکن رسمی دعا کا نہیں بلکہ قلبی دعا کا قائل ہوں۔ سو خود کو کسی حد تک فیض کے قریب محسوس کیا۔ فیض کی بعض نظمیں ترقی پسندانہ مزاج کے مطابق ہیں تو بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو جدید نظم اور ترقی پسند نظم کے درمیان پُل کا کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہیں اور انہیں نظموں سے فیض کی نظم نگاری میں ادبی شان نمایاں ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ پھر رومانٹک مزاج کی ریشمی شاعری جو انقلابی شاعری کے دوش بدوش چلتی رہی۔

ساحر لدھیانوی کے ہاں اس نوعیت کے اشعار نے کچی عمر ہی میں چونکا دیا تھا۔

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

بعد میں علم ہوا کہ ترقی پسند شعراء کو مذہب کے خلاف لکھنے کی خصوصی تلقین تھی، چنانچہ ہر ممتاز ترقی پسند شاعر نے اپنی اپنی ہمت اور بساط کے مطابق اس موضوع کو نبھایا۔ ساحر لدھیانوی نے بھی اس موضوع کو احکامات کی تعمیل کے طور پر خوب خوب نبھایا، عمومی طور پر ان کے مذہب مخالف اشعار نظریاتی تعصب کو ظاہر کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں وہ مذہب کی ظاہری صورت کے منفی رُخ کو ہدف بناتے ہوئے طنز سے زیادہ شوخی سے کام لیتے ہیں وہاں ان کی ایسی شاعری بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں شوخی کم ہوتی ہے وہاں مذہب پر حملہ آور ہونے کا تاثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ "طرحِ نَو" مذہب کی شدید مذمت سے بھری ہوئی نظم ہے۔ یہاں تک تو بات گوارا رہتی ہے کہ مذہب کے نام پر لوگوں کی جیبیں کاٹنے والوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر

لیکن جب ساحر لدھیانوی یہاں تک پہنچتے ہیں۔

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر

پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر

تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ بھی نیطشے کے ''اعلان'' کے زیر اثر آرہے ہیں، لیکن براہِ راست خدا کو انہوں نے یہاں بھی زد پر رکھنے کی جسارت نہیں کی۔ ایک احتیاط کر گئے یا ان سے از خود احتیاط ہو گئی۔

ساحر کے ہاں اس نوعیت کے مزید چند اشعار بھی دیکھتے چلیں۔ یہ کچھ محتاط اور کچھ بے باک قسم کے اشعار ہیں، ان اشعار کی تمام تر بے باکی بھی ساحر لدھیانوی کو ن م راشد کی ''خدا کا جنازہ'' جیسی پستی میں گرنے سے بچائے رکھتی ہے۔

برا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

سرِ مقتل جنہیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرِ منبر کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے
کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

فیض اور میراجی کے برعکس ساحر لدھیانوی کے افکار زیادہ واضح اور دوٹوک تھے لیکن ساحر لدھیانوی نے ن۔م۔راشد کی طرح ہستیِ باری تعالیٰ کو براہِ راست ہدف نہیں بنایا۔ اس کے برعکس تمام تر دہریت کے باوجود ایک انجانی جستجو کا سفر بھی ان کے ہاں ملتا ہے اور اس جستجو کے ساتھ ''اپنے ذوقِ طلب'' کے خام ہونے کا احساس و اعتراف بھی اس رنگ میں ملتا ہے۔

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

فلم ''ہم دونوں'' کا بھجن ''اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام۔'' کو اگر حمد یہ بھجن یا دعائیہ بھجن کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ صرف فلمی ضرورت نہیں بلکہ ایک ''مسلمان دہریئے'' کے دل کی آواز بھی ہے۔

فیض صاحب کی ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' اور ساحر لدھیانوی کی ''تاج محل'' دونوں اتنی شاندار ترقی پسند نظمیں ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسے دوسری نظم پر ترجیح دی جائے۔ ذاتی طور پر میں دو وجوہات کی بنا پر ساحر لدھیانوی کی نظم کو ترجیح دیتا ہوں۔ پہلی وجہ یہ کہ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کو ملکۂ ترنم نور جہاں نے ایسے خوبصورت انداز سے گایا ہے کہ گویا اس نظم کو امر کر دیا ہے۔ نور جہاں کے گائے جانے کے بعد جب کبھی فیض سے یہ نظم سنانے کی فرمائش کی جاتی تو وہ خود کہتے بھئی یہ نظم تو اب نور جہاں کی ہو چکی۔ اس کے برعکس نظم ''تاج محل'' کو نہ تو ایسے انداز میں گایا گیا اور نہ ہی کسی گائیکی کی بنیاد پر اس کی کوئی شناخت قائم ہوئی، اس کی ساری اہمیت اور قدر و قیمت اس کی اپنی شعری لفظیات اور اپنی ادبی شان سے ہی ظاہر ہوئی۔ دوسری وجہ یہ کہ دونوں نظمیں اشتراکی نظریات کی حامل ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اور خصوصاً سوویت یونین کے انہدام کے بعد فیض کی نظم بھی جیسے اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہے۔ صرف ایک مشہور گیت بن کر رہ گئی ہے۔ جبکہ وقت بدلنے کے باوجود ساحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل'' نئے تناظر میں زیادہ اہم بن کر سامنے آ رہی ہے۔ یہ نظم اس احساس کو اجاگر کرتی ہے کہ جس وقت مغربی دنیا جدید علوم اور نئی ایجادات کے جدید سفر پر گامزن ہو رہی تھی، ہمارے ہند کے بادشاہ شاہی قلعے، شاہی مقبرے اور دوسری شاہی عمارات بنانے میں ہی مگن تھے۔ نہ انہیں بدلتے ہوئے زمانے کی رفتار کا کوئی ادراک تھا، نہ اپنی مملکت کی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی تصور ان کے پیش نظر تھا۔

''تاج محل'' کے بعد ساحر لدھیانوی کی نظم ''مادام'' نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ پھر ''کبھی کبھی''، ''فن کار''، ''فرار'' جیسی نظموں سے ساحر نے اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھا۔ ''نذرِ کالج'' بنیادی طور پر لدھیانہ کالج سے خارج کیے جانے والے ساحر کی اپنی روداد ہے۔ لیکن یہ کیسی نظم ہے کہ مجھے ابتدائی عمر میں بھی پسند تھی اور اب بھی جیسے مجھے یہ ساحر سے زیادہ اپنی کہانی لگنے لگتی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار یہاں پیش کرنا چاہوں گا۔

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام
تُو آج بھی ہے میرے لیے جنتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال
ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے

تنگِ وطن تھے، حدِ وطن سے نکل گئے
اس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں پہ یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

مجھے اس اعتراف سے کوئی عار نہیں کہ متعدد دوسرے اچھے شاعروں کے اثرات کی طرح میرے ہاں ساحر کی فلمی وغیر فلمی شاعری کا غیر ارادی اثر آتا رہا ہے۔ جس سے شعوری سطح پر کوئی متاثر ہو وہ لاشعوری طور پر کسی نہ کسی رنگ میں اپنا اثر ضرور ڈالتا ہے۔ اب غور کرتا ہوں تو بعض اشعار اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے

(ساحر لدھیانوی)

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے
اب نکلتا ہی نہیں روح کی گہرائی سے

(حیدر قریشی)

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں کہ مجھے موت ناگوار نہیں

(ساحر لدھیانوی)

زندگی اور موت کے بارے میں نے بہت سارے شعر کہے ہیں لیکن یہاں ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

اور تھے حیدر جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

اچھے اچھے معروف شاعروں کے ہاں بھی ساحر لدھیانوی کی شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ساحر کی ایک نظم

جس کے کچھ حصے گائے بھی گئے ہیں۔ بڑا مشہور گیت ہے۔

''پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی، تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں''

ساحر لدھیانوی کا یہ مردانہ انداز پروین شاکر کے ہاں نسائی روپ کے ساتھ یوں ظاہر ہوتا ہے۔

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

ساحر لدھیانوی جب روایتی ترقی پسندوں کی ''تعمیلِ ارشاد'' پروگرام کی طرح شاعری کرتے ہیں تو وہی موضوعات ان کے ہاں گھسے پٹے انداز میں آتے ہیں جیسے دوسرے ترقی پسند شاعروں کے ہاں ملتے ہیں۔ گھن گرج، نعرہ بازی، انقلاب سے دنیا بدل دینے کے دعوے، ایسے ایسے دعوے جن کا خود اپنی ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا (کسی بھی نظریاتی شاعر اور ادیب کے قول و فعل میں کچھ نہ کچھ ہم آہنگی تو دکھائی دینی چاہئے۔) لیکن جب جب وہ اپنے مخصوص موضوعات کو تخلیقی سطح پر مس کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں وہیں ان کے اشعار میں جیسے عصر کو عبور کر لینے کی قوت دکھائی دینے لگتی ہے۔

دہر کے حالات کی باتیں کریں
اس مسلسل رات کی باتیں کریں

فلم ''نوجوان'' کے گیت ''ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں'' سے بطور شاعر اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کرنے والے ساحر لدھیانوی نے ''میں پل دو پل کا شاعر ہوں'' تک فلمی شاعری کو اعلیٰ ادبی معیار تک پہنچا دیا۔ ''پھر صبح ہوگی''، ''ہم دونوں''، ''وقت''، ''ہمراز'' اور ''گمراہ'' جیسی کتنی ہی فلموں کے کیسے کیسے گانے جیسے ہماری زندگی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ جنسی جذبات کو کسی حد تک کھل کر اور پھر لطافت کو ملحوظ رکھ کر بیان کرنا ساحر لدھیانوی کی شاعری کا کمال ہے۔ ان سے پہلے جنسی جذبات یا تو بہت زیادہ ملفوف انداز میں بیان کیے جاتے یا پھر فحاشیت کا تاثر پیدا کرتے ہوئے پھوہڑ پن سے بیان کیے جاتے تھے۔ اس سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے معاملات و مسائل سے متعلق انسانی نفسیاتی و جذباتی اتار چڑھاؤ کی کتنی کیفیات کی ترجمانی ان کے گیتوں میں موجود ہے۔

فلم ''دھند'' کے ایک گیت میں تو فلسفیانہ سطح پر زندگی کے بھید کو بھی ساحر لدھیانوی نے کتنے سہل اور آسان پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔

سنسار کی ہر شئے کا اتنا ہی فسانہ ہے
اک دھند سے آنا ہے، اک دھند میں جانا ہے

اک پل کی پلک پر ہے ٹھہری ہوئی یہ دنیا
اک پل کے جھپکنے تک ہر کھیل سہانا ہے

فلم کاجل کا بھجن "تورا من درپن کہلائے" اتنا پُر تاثیر ہے کہ سنتے ہی بندہ سوچتا ہے کہ سادھو بن کر کسی جنگل کی راہ لی جائے۔ اور فلم "چترلیکھا" کا گیت "سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو تم کیا پاؤ گے" سُن کر ساری تپسیا ترک کر کے دنیا کی گہما گہمی میں شامل ہو کر زندگی سے لطف کشید کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

فلم کاجل کا بھجن

تورا من درپن کہلائے

فلم چترلیکھا کا گیت

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو تم کیا پاؤ گے
اس لوک کو بھی اپنا نہ سکے، اُس لوک میں بھی پچھتاؤ گے
یہ پاپ ہے کیا اور پُن ہے کیا، ریتوں پر دھرم کی مہریں ہیں
ہر یگ میں بدلتے دھرموں کو کیسے آدرش بناؤ گے۔۔۔۔
یہ بھوگ بھی ایک تپسیا ہے، تم تیاگ کے مارے کیا جانو
اپمان رچیتا کا ہوگا، رچنا کو اگر ٹھکراؤ گے۔۔۔۔۔۔
ہم کہتے ہیں یہ جگ اپنا ہے، تم کہتے ہو جھوٹا سپنا ہے
ہم جنم بتا کر جائیں گے، تم جنم گنوا کر جاؤ گے۔۔۔۔۔

ساحر لدھیانوی خوش قسمت تھے کہ انہیں ایس ڈی برمن کے ذریعے پہلا گیت لکھنے کا چانس ملا تو آگے چل کر انہیں خیام جیسے موسیقار کی قربت ملی۔ خیام نے ساحر سے مقررہ موسیقی پر گیت لکھوانے کی بجائے ان کی لکھی ہوئی شاعری کی بنیاد پر دھنیں ترتیب دیں اور انہیں مقبول عام گیت بنا دیا۔ امرتا پریتم نے ساحر لدھیانوی سے جس محبت اور وابستگی کو بیان کیا ہے وہ سب سچ ہوگا لیکن مجھے یہ سوال ہمیشہ الجھن میں مبتلا کرتا ہے کہ امرتا پریتم نے یہ سارا انکشاف اس وقت کیوں کیا جب ساحر لدھیانوی اپنی شہرت کے عروج پر تھے۔

ادبی دنیا کے بعض لکھنے والوں نے ساحر لدھیانوی کی فلمی شاعری کو کمتر گردانا ہے۔ مجھے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے۔ ساحر لدھیانوی کی فلمی شاعری روایتی فلمی گیتوں سے الگ اپنی پہچان کراتی ہے۔ ہر چند ان کے زمانے کے بیشتر فلمی شاعر بذاتِ خود عمدہ ادبی شاعر تھے، تاہم ساحر لدھیانوی کی ادبی آن

بان باقی سب سے الگ دکھائی دیتی ہے۔ان کی عام شاعری اور ان کے فلمی گیت سب عوام کے دلوں کی دھڑکن تھے اور ان کی ادبی حیثیت بھی مستحکم ہے۔ان پر اعتراض کرنے والوں کی اپنی شاعری کو سامنے لا کر ساحر لدھیانوی کے گیتوں سے اور عام شاعری سے ان کا موازنہ کیا جائے تو نام نہاد معترضین کے اعتراض کا سارا بھرم کھل جائے۔

ساحر لدھیانوی کو قریب سے دیکھنے اور قریب سے جاننے والوں نے ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے جس سے ساحر کی خوبیوں اور کمزوریوں کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔یہاں مجھے اپنے پسندیدہ شاعر کی ایک دو کمزوریوں اور کوتاہیوں کا بھی تھوڑا سا ذکر کرنا ہے۔مظہر امام نے اپنے خاکوں کے مجموعہ ''اکثر یاد آتے ہیں'' میں ساحر لدھیانوی کا جو ذکر کیا ہے،اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کر رہا ہوں۔اس میں ساحر کی ادبی اور شخصی دو کمزوریوں کا ہلکے سے اشارے میں مناسب ذکر آ گیا ہے،اور میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

''ساحر لدھیانوی جنہیں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا بمبئی سے آئے تھے۔ہم لوگ پاس کے ایک چائے خانے میں بیٹھے۔ذکر فلمی دنیا کا آیا تو وہ اس زمانے کی بعض بڑی ہیروئنوں کا مذاق اڑانے لگے کہ ان سے ثانی کے علاوہ اور کسی موضوع پر بات نہیں کی جا سکتی۔پھر پرکاش پنڈت سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: بھئی مجاز کو انجکشن وکشن دلوا کر اس کی شادی کرا دو۔'' (آج میں سوچتا ہوں کہ ساحر نے خود انجکشن وکشن لے کر شادی کیوں نہ کی)۔کانفرنس میں نیا مینی فیسٹو پیش ہونا تھا۔ساحر کہنے لگے، بھئی بحث ہو گی۔ڈرافٹ مینی فیسٹو پڑھ کر تیاری کرنی چاہیے۔ساحر نے بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔حصہ کیا لیتے،وہ بحث کے دوران موجود ہی نہیں تھے۔(شاید انہیں بھی اب 'ثانی' کے علاوہ کسی موضوع سے دلچسپی نہیں تھی)''

ایک اور غلطی یا کوتاہی جو ساحر لدھیانوی سے سرزد ہوئی،انہوں نے بمبئی میں جو جائیداد بنائی،اسے لاوارث چھوڑ گئے۔ان جیسے انقلابی اور غریبوں کے ہمدرد کو اپنی زندگی میں ہی اس کا کوئی بہتر بندوبست کر لینا چاہیے تھا۔اگر وہ بمبئی کے غریبوں،بے کس لوگوں کی امداد کے لیے کوئی صدقۂ جاریہ قسم کا انتظام کر جاتے تو آج کتنے مستحق لوگ وہاں سے فیض یاب ہو کر،ساحر لدھیانوی کے انسانیت کی خدمت والے خوابوں کی تعبیر پا رہے ہوتے اور ساحر لدھیانوی کی روح کے لیے سکون موجب بن رہے ہوتے۔لیکن ان کی وفات کے بعد کروڑوں کی جائیداد (جو شاید اب اربوں روپے مالیت تک پہنچ چکی ہو) ان لوگوں نے ہتھیا لی جن کا ساحر لدھیانوی کے خوابوں سے شاید کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔وہ صرف قبضہ گروپ کے لوگ تھے۔

ایسی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ساحر لدھیانوی ترقی پسند تحریک کے ایسے بڑے شاعر ہیں

جنہیں فیض احمد فیض کے برابر شمار کیا جانا چاہیے۔ ابھی تک ایسا نہیں ہوا تو اس کی وجہ ساحر لدھیانوی کی اپنی بے نیازی رہی ہے۔ انہوں نے اپنے ڈھب کی بہت خوبصورت شاعری کی۔ بمبئی کی فلمی گیتوں کی انڈسٹری پر چھائے رہے لیکن انہوں نے نہ تو اردو دنیا کی سطح پر اپنی ادبی حیثیت کی طرف کوئی خاص توجہ کی اور نہ ہی بین الاقوامی سطح پر کسی طرح کی لابنگ کا سوچا۔ فیض احمد فیض نہ صرف اردو کی قومی سطح پر مسلسل نمایاں ہوتے رہے بلکہ انہوں نے بین الاقوامی سطح پر بھی اچھی لابنگ کی اور اس کے ثمرات بھی حاصل کیے۔ اگر اب اردو دنیا ساحر لدھیانوی کے خاص نمبرز اسی طرح جاری کرنے لگی جیسے وسیم فرحت صاحب شائع کرنے جا رہے ہیں تو مجھے امید ہے کہ ساحر شناسی کا عمل آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا۔ اردو دنیا سے آگے جا کر بین الاقوامی سطح پر ان کے فن کی طرف توجہ کی جانے لگے گی اور پھر ادبی دنیا ساحر لدھیانوی کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکے گی کہ وہ کتنے بڑے ترقی پسند شاعر تھے۔ فیض جتنے بڑے یا ان سے کم بڑے۔

وسیم فرحت صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے رسالہ سہ ماہی ''اردو'' کے ساحر لدھیانوی نمبر کے لیے مجھے کچھ لکھنے کی تحریک کی اور یوں ساحر لدھیانوی سے ادبی محبت کا ایک پرانا قرض اس مضمون کی صورت میں کچھ ادا کرنے کی کوشش کر سکا ہوں۔ مضمون شاید کچھ زیادہ مربوط نہیں ہے لیکن اس بکھراؤ کی حالت میں بھی میرے احساسات کی سچائی میرے لیے کافی ہے۔

نصرت ظہیر، نئی دہلی

ساحر کا سخن اور سخن کی سائنس

ساحر کو پڑھتے اور سوچتے ہوئے اردو کی دیگر نسلوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی چالیس سال سے اوپر ہو گئے ہیں اور میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ پایا ہوں کہ آخر آج بھی جب اردو کے مقبول ترین شاعروں کا نام لیا جاتا ہے تو ان میں ساحر لدھیانوی کا نام کیوں نہیں ہوتا۔

یہاں تک کہ بیسویں صدی کے سب سے مقبول شاعروں کی فہرست بنائی جاتی ہے تو اس میں بھی اقبال ،جوش، فیض، مجاز اور فراق یہاں تک کہ جگر، فانی اور اصغر گونڈوی کے نام بھی آجاتے ہیں جن کے مداحوں کے حلقے خاصے محدود ہیں، مگر ساحر کا نام ان فہرستوں میں عموماً کہیں نہیں ملتا۔ حالانکہ بات صرف مقبول شاعروں کی ہے۔ بڑے شاعروں کی نہیں۔ بڑے شاعر پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بڑے پن کو ناپا نہیں جا سکتا ۔صرف لادا جا سکتا ہے۔ مختلف لوگوں کے نزدیک بڑے پن کو ناپنے کے مختلف پیمانے ہوتے ہیں۔ اور سب اپنے اپنے پیمانے کی ڈفلی بجا کر، اپنی پسند کو عظیم اور دوسرے کی عظمت کو حقیر گردان کر، اپنی پسند ناپسند کو اردو ادب پر لادتے رہتے ہیں۔

چلئے عظمتوں کو ہم نہیں ناپ سکتے کہ اس کے مخصوص، محدود اور مقررہ پیرامیٹرز parameters کم از کم اردو میں نہیں پائے جاتے۔ آپ دو چار مضمون حمایت میں لکھ کر ناپ تول کئے بغیر کسی کو بھی عظیم بنا سکتے ہیں مگر مقبولیت کو تو ناپا جا سکتا ہے۔

شاعر کی عمر 59 سال۔

پہلا مجموعہ 25 سال کی عمر سے پہلے۔

اگلے بیس تیس برسوں میں پہلے مجموعے کے پچیس 'جائز' ایڈیشنوں کی اشاعت اور فروخت۔

ناجائز اور بلا اجازت چھاپے گئے ایڈیشنوں کا کوئی حساب نہیں۔ اتنے ایڈیشن مجاز جوش اور فیض تو کیا اقبال کے شعری مجموعوں کے بھی ان کی زندگی میں نہیں چھپے۔

اردو میں شاعری کی صرف ایک کتاب ہے جو آج تک کی تعدادِ اشاعت کے حساب میں ساحر کی 'تلخیاں' سے آگے نکل سکتی ہے۔ دیوانِ غالب۔

ان تصدیق شدہ حقائق کے باوجود ساحر کا نام اردو کے مقبول ترین شاعروں کی کسی فہرست میں نہیں آتا تو اس کی کوئی معقول وجہ علاوہ اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی ذہنی رکاوٹ mental block ضرور ہے؟

صورتِ حال یہ ہے کہ کسی قدر معقول لوگ بھی جب گزشتہ صدی کے سب سے مقبول شاعروں کا نام گناتے ہیں تو بالکل آخر میں جا کر ساحر کا نام لیتے ہیں۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس امتیاز یا تعصب یا جانب داری prejudice کی کوئی نفسیاتی وجہ ضرور ہو سکتی ہے لیکن اسے ادبی دیانت داری ہرگز نہیں کہا جا سکتا جس سے ہمارے بیشتر سکہ بند نقاد یکسر خالی نکلتے ہیں۔ انھیں تو یہ ماننے میں بھی باک ہے کہ ساحر، نظیر اکبرآبادی کے بعد پہلے عوامی شاعر تھے۔

اب رہ گئی بڑے شاعروں کی بات تو کوئی کچھ بھی کہے۔ میرے نزدیک بیسویں صدی میں اردو کے تین سب سے بڑے شاعر اقبال، فیض اور ساحر ہیں۔ باقی سب عطارد و مشتری جیسے چھوٹے بڑے یا زہرہ، زحل اور مریخ جیسے منفرد یا عجیب طرح کے سیارگان ہیں جو ان تینوں کے آگے پیچھے یا اغل بغل یا دور و نزدیک گھومتے ہیں۔ جدید اردو شاعری کے ان عظمائے ثلث کی مختصر فہرست میں ساحر کا نام میں نے سب سے آخر میں صرف اس لئے رکھا ہے کہ کہیں اسے پہلے یا دوسرے مقام پر رکھنے کی میری حرکت کو حد سے بڑھی ہوئی شخصیت پرستی نہ سمجھ لیا جائے۔ اور مجھ پر کوئی دوسرا نہیں بلکہ خود میں ہی یہ الزام نہ لگانے لگوں کہ میاں تم بھی عظمت کے معاملے میں اپنی پسند کی ڈفلی بجا کر دوسروں کی عظمتوں کو حقیر گردان رہے ہو۔

لیکن میں ہوا میں گرہ نہیں لگا رہا ہوں۔ میرے پاس حساب کتاب موجود ہے جس کی رو سے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری فنی عظمتوں کے تمام تر ہالوں کے باوجود فکری سطحوں پر اس برصغیر کو سب سے زیادہ نقصان پہونچانے اور قومی سماجی و سیاسی سطحوں پر انسانوں کی ہلاکت کا باعث بننے والی شاعری ہے۔ دوسری طرف فیض کی کلیات 'نسخہ ہائے وفا' تنوع سے عاری، اور تقریباً یکساں محسوس ہونے والے موضوعات و میلانات کے غنائیت و جمالیات اور سوز و گداز سے بھرپور چمن زار سے زیادہ کچھ نہیں جس کے ہر پھول میں گل چیں یعنی شاعر کا اپنا عکس زیادہ دکھائی دیتا ہے پھول کا کم!

پھر یہ ہے کہ خود ساحر بھی اقبال اور فیض سے متاثر تھے۔ اقبال سے نظریاتی اختلاف کے باوجود ساحر کی ماقبل 'تلخیاں' شاعری پر اقبال کے ڈکشن کا بہت زیادہ اثر تھا اور یہیں سے ساحر کی اس سائنسی اپروچ اور معروضیت کا سراغ مل جاتا ہے جو بعد میں ان کی شاعری اور شخصیت دونوں میں غالب عناصر کی طرح نظر آتی ہے۔ یعنی جو کچھ بھی اچھا ہے، صحت مند ہے، مفید ہے اسے اپنالو، باقی سب delete کر کے recycle

bin میں بھیج دو۔ چنانچہ ساحر نے فنی لحاظ سے تو اقبال سے کسبِ فیض کیا لیکن ان کی فکر کے ان بنیادی نکات کو نظر انداز کر دیا جو خودی کے پردے میں صرف ایک مذہب کی سر بلندی ، پان اسلازم Pan Islamism اور کرۂ ارض پر صرف مومن کی حکمرانی کے نظریات کی اساس بنتے جا رہے تھے۔

اس کے برعکس فیض سے ساحر کی نظریاتی قربت و مطابقت تھی اور ان کے لہجے کی صداقت و رومانیت کا اثر انھوں نے نظریاتی اور فنی دونوں سطحوں پر قبول کیا۔ لیکن اپنے اظہار اور اظہار کے موضوعات کو انھوں نے فیض کی طرح اس monotony کا شکار نہیں ہونے دیا جس کی وجہ سے کلّیاتِ فیض کی ہر تخلیق میں شاعر کے خیال سے کہیں بڑھ کر خود شاعر زیادہ جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ ساحر کی شاعرانہ نظر فیض کی طرح موضوع کے مرکزے nucleus پر مرکوز رہنے کے باوجود اس کے تمام پہلوؤں کا منطقی، معروضی اور عقلی جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ پھر اس میں وہ اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور احساسات کو بھی ملا لیتے ہیں اور اس طرح ان کی شاعری اسی زمین سے جڑی رہتی ہیں۔ فیض کی طرح ان کی شاعری کی فضا ملکوتی سحر کاری اور دل آویز و جاں گداز نرمی و نزاکت کا ماحول نہیں پیش کرتی۔ اس میں بادِ صبا کے ساتھ گرم ہوا کے بگولے بھی اپنی حدت و تمازت کے ساتھ سرگرم ہیں۔ محبوب کے نرم و دل آویز خطوطِ جسم کے ساتھ جسم کے دکھتے جوڑ دباتی عورت کا درد بھی مجبور انسانیت کی طرف سے نوحہ کناں ہے۔ دستِ تہہ سنگ پر ٹھہری ہوئی اذیتوں کی سرگوشیوں کے ساتھ درد کی کراہوں سے زمین و آسمان کو بھرتی ہوئی گنجار اور چیخ پکار بھی ہے۔ یعنی اس اقلیم سخن میں جہاں جس شئے کی جتنی ضرورت ہے وہاں وہ اسی مقدار اور اسی کیفیت میں موجود ہے۔

ساحر نے اپنی شاعری میں عاشق کو مومن یا مردِ کامل یا جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے والا درندہ نہیں بلکہ ایک حساس اور دردمند انسان بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی طرح اس نے اپنے باغی کو لوریوں جیسی نرم و نازک بندشِ الفاظ کے ساتھ نغمہ ہائے بغاوت سنا کر لاشعوری طور پر انقلاب کو تصوف یا روحانی جذبے کی شکل دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ واضح پیغام دیا ہے کہ کوئی مذہب کوئی نظریہ کوئی جذبہ کوئی تہذیب اور کوئی انقلاب انسانی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

ساحر کی سیاسی ، سماجی فکر کا توازن اُن کی سبھی نظموں یہاں تک کہ فلمی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے کھل کر انقلاب روس کی حمایت کی۔ مارکسزم سے اپنی وابستگی کو کبھی نہیں چھپایا۔ نظم 'طلوعِ اشتراکیت' اس کی گواہ ہے۔ کانپتے ہوئے سلطانوں اور بھاگتے ہوئے ظلِ الٰہی ساحر کے اشتراکی رجز کو فخر سے بھر دیتے ہیں۔ لیکن جب رجز اس مصرعے پر ختم ہوتا ہے کہ:

ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

تو یہی نظم ساحر کی جمہوریت پسندی کا شاہد بھی بن جاتی ہے۔ 1917 کے لینن کے لیے اگر ساحر کے جذبات یہ ہیں کہ:

انساں کے مقدر کو آزاد کیا تو نے
مذہب کے فریبوں سے شاہی کے عذابوں سے

تو 1970 میں کمیونسٹوں کے نظریاتی اختلافات اور ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹیوں کی تقسیم کے پس منظر میں لینن کو یاد کرتے ہوئے ساحر یہ بھی صاف صاف کہتے ہیں کہ:

کیا جانے تری اُمت کس حال کو پہنچے گی
بڑھتی چلی جاتی ہے تعداد اماموں کی
ہر گوشۂ مغرب میں، ہر خطۂ مشرق میں
تشریح دگرگوں ہے اب تیرے پیاموں کی
وہ لوگ جنہیں کل تک دعویٰ تھا رفاقت کا
تذلیل پہ اُترے ہیں اپنوں ہی کے ناموں کی
بگڑے ہوئے تیور ہیں نوعمر سیاست کے
بپھری ہوئی سانسیں ہیں نومشق نظاموں کی
طبقوں سے نکل کر ہم فرقوں میں نہ بٹ جائیں
بن کر نہ بگڑ جائے تقدیر غلاموں کی

ساحر پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ کے لئے، اظہار رائے کی آزادی اور جمہوری قدروں کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ساحر کا قلم گاندھی کے قتل، لوممبا کے قتل اور جان ایف کینیڈی کے قتل میں فرق نہیں کرتا ۔ساحر کا کلام انقلاب اور بغاوت کے لئے اکساتا ہے لیکن وہ تشدد اور تخریب کا حامی نہیں۔ اس معاملے میں ساحر علامہ اقبال سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہیں، جنھیں وہ ہمیشہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر مانتے رہے۔ ساحر کی نظم 'ورثہ' اس ضمن میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں وہ انقلاب کے لئے تخریب و تشدد پر آمادہ احتجاجی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جس سے دہقان کو روزی نہیں ملنے پاتی
میں نہ دوں گا تجھے وہ کھیت جلانے کا سبق
فصل باقی ہے تو تقسیم بدل سکتی ہے

فصل کی خاک سے کیا مانگے کا جمہور کا حق

ان کا قلم، نئی صبح اور نئے سورج کے طلوع کا ترانہ ضرور لکھتا ہے لیکن اس سے پہلے جو لاکھوں کروڑوں صبح و شام گزر چکے ہیں ان کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا:

یہ وطن، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے
کتنے ذہنوں کا لہو، کتنی نگاہوں کا عرق
کتنے چہروں کی حیا، کتنی جبینوں کی شفق
خاک کی نذر ہوتی تب یہ نظارے بکھرے
پتھروں سے یہ تراشے ہوئے اصنامِ جواں
یہ صداؤں کے خم و پیچ، یہ رنگوں کی زباں
چمنیوں سے یہ نکلتا ہوا پُر پیچ دھواں
تیری تخلیق نہیں ہے، مری تخلیق نہیں
ہم اگر ضد بھی کریں اس پہ تو تصدیق نہیں
علم سولی پہ چڑھا، تب کہیں تخمینہ بنا
زہر صدیوں نے پیا، تب کہیں نوشینہ بنا
سینکڑوں پاؤں کٹے، تب کہیں اک زینہ بنا
تیرا غم کچھ بھی سہی، میرا الم کچھ بھی سہی
اہلِ ثروت کی سیاست کا ستم کچھ بھی سہی
کل کی نسلیں بھی کوئی چیز ہیں، ہم کچھ بھی سہی
ان کا ورثہ ہو کھنڈر، یہ ستم ایجاد نہ کر
تیری تخلیق نہیں تو اسے برباد نہ کر

ساحر کا قلم جمہوری قدروں کا محافظ بن کر اس تخریب کار کو سمجھاتا ہے:

تجھ کو اظہار خیالات کا حق حاصل ہے
اور یہ حق کوئی تاریخ کی خیرات نہیں
تیرے اور میرے رفیقوں نے لہو دے کر

ظلم کی خاک میں اس حق کا شجر بویا تھا
سالہا سال میں جو برگ وثمر لایا ہے
اپنا حق مانگ نگران کے تعاون سے نہ مانگ
جو ترے حق کا تصور ہی فنا کرڈالیں
ہاتھ اٹھا اپنے، نگران کے جلو میں نہ اٹھا
جو ترے ہاتھ ترے تن سے جدا کرڈالیں
خواب آزادیٔ انساں کی یہ تعبیر نہیں
یہ وطن، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے ۹

ان کا یہ فکری ونظریاتی توازن ہر جگہ قائم رہتا ہے اور وہ کہیں بھی انتہاؤں میں گفتگو نہیں کرتے۔

ساحر کے یہاں ابہام کی کوئی جگہ نہیں۔ کرکٹ کی عام فہم زبان میں کہیں تو وہ وائڈ بال، ان سوئنگ یا آؤٹ سوئنگ اور گگلی وغیرہ میں یقین نہیں رکھتے۔ ان کی گیند کا رخ سیدھا مڈ وکٹ کی طرف ہوتا ہے۔ ادبی مو شگافیاں اور پیچیدگیاں انھوں نے اہمال پسند جدیدیوں، 'شب خونیوں' اور تھیوری پسند نقادوں کے لئے چھوڑ دی ہیں۔ ان کی شاعری سیدھے طور پر مینٹل بلاک کو نشانہ بناتی ہے۔ ٹکسالی فکر یا کلیشوں cliches پر وار کرتی ہے۔ اور یہ عمل ان کی شاعری میں شروع سے نمایاں ہے۔

'تاج محل' والی نظم سے ہی لے لیجئے۔ دنیا اس حسین ترین عمارت کو برسوں سے خراجِ تحسین پیش کرتی آئی ہے۔ آج اسے بے پناہ حسین ہونے کی ہی بنا پر عوامی رائے سے دنیا کے سات عجائبات میں جگہ مل چکی ہے۔ مگر صرف حسن کی وجہ سے۔ دل آویز اور رجحان ساز trend setter طرزِ تعمیر کی وجہ سے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی نام نہاد so called محبت اور اپنی متعدد بیویوں میں سے ایک کے ساتھ اس کے مبینہ عشق کی یادگار میں بنایا گیا تھا اور جس کے معماروں کے ہاتھ بعض ضعیف روایات کے مطابق اس 'عاشق' کے حکم پر اس لئے کاٹ دئے گئے تھے کہ وہ کوئی دوسرا تاج محل نہ بناسکیں۔

ساحر بھی اپنی نظم میں اس منقش در و دیوار اور محرابوں اور طاقوں والی، اور جمنا کے کنارے بنائی گئی چمن زار عمارت کی صناعی اور شکلِ جمیل کو خراجِ تحسین ادا کرتا ہے لیکن اس حسن کا کریڈٹ وہ اس ظالم، جابر اور قاتل شہنشاہ کو دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں جس نے تختِ شاہی پر متمکن ہوتے ہی اپنے بھائیوں اور کنبے کے بیش تر مردار اکین کو قتل کرادیا تھا۔ وہ ایسے ظالم حکمراں کی بنوائی ہوئی حسین عمارت کو محبت کی علامت ماننے سے بھی

انکار کرتا ہے جو کہ ظاہر ہے اس دولت سے بنوائی گئی جو رعایا سے صوبہ داروں اور جاگیرداروں کے توسط سے لوٹی گئی تھی اور شہنشاہ کی اپنی جائز محنت کی کمائی ہرگز نہیں تھی۔ وہ عمارت کے حسن کا تمام تر کریڈٹ ان غریب اور محکوم معماروں کی محنت کو دیتا ہے جن کی قبروں کا آج کوئی نام ونشان نہیں۔ عقل کہتی ہے کہ ان میں سے بھی کسی نہ کسی نے تو محبت کی ہوگی۔ تو پھر ان کے پیاروں کے مقابر بے نام ونمود کیوں ہیں۔ ان مقابر پر کوئی قندیل جلانے کی بات تو دور رہی کسی نے آج تک اس بارے میں سوچا تک نہیں۔

نظم کا چھپنا تھا کہ 'شاہ پرست ذہنیت' کے پروردگان میں ایک ہلچل مچ گئی۔ کچھ مولویوں نے تو اسے ایک مسلمان بادشاہ کی بے حرمتی قرار دے کر مذہب اسلام پر حملہ تک قرار دے دیا۔ مشاعروں میں ساحر کی نظم کے خلاف باقاعدہ ایک تحریک شروع ہوگئی۔ شعرا تاج محل کی حمایت میں نظمیں کہنے لگے۔ ان نظموں میں ساحر پر لعنت ملامت کی بوچھار ہوتی تھی۔

یہ نظم تقسیم وطن سے پہلے کہی گئی تھی لیکن اس کی مخالفت میں اس قدر شدت تھی کہ یہ سلسلہ مجھ جیسے، آزادی کے پندرہ سال بعد ہوش سنبھالنے والے سامعین کے دور میں بھی جاری تھا۔ ان دنوں بھی کوئی مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں تاج محل کی شان میں ایک دو نظمیں نہ پڑھی جاتی ہوں۔ یہاں تک کہ شمسی مینائی جیسے خود کو سوشلسٹ اور ترقی پسند بتانے والے اپنے وقتوں کے مقبول مشاعر (میرا مطلب ہے مشاعروں کے شاعر) نے بھی ایک طویل نظم تاج محل کی شان میں کہہ رکھی تھی۔ مسحور کن تاج محل کے محبت کی علامت ہونے کی امیج کے سحر میں گرفتار سادہ لوح سامعین ان نظموں کو سراہتے تو تھے لیکن ساحر کی نظم بھی اتنی ہی مقبول تھی۔ کیونکہ اس میں ایک نظریہ تھا ایک لاجک تھی جو ہر شخص کو اپیل کرتی تھی۔ جس مشاعرے میں ساحر کو بلایا جاتا وہاں سامعین کا ہجوم ٹوٹ پڑتا اور پھر جیسے ہی ساحر اپنا کلام سنا کر فارغ ہوتے ان سے سب سے پہلی فرمائش 'تاج محل' سنانے کی ہوتی۔ اکثر مشاعروں میں ساحر کو ان کی فرمائش کے آگے جھکنا پڑتا۔ یہاں تک کہ قیام پاکستان کے ایک برس بعد جب لاہور وغیرہ کے کئی مشاعروں میں ساحر کو مدعو کیا گیا تو انھیں دیکھتے ہی پبلک 'تاج محل' سنانے کا مطالبہ کرنے لگتی تھی۔

نظم کی زبردست عوامی مقبولیت کے باوجود اردو ادب کے نقادوں نے اس نظم کے ساتھ متعصبانہ سلوک کیا۔ اس وقت کی تحریریں پڑھ لیجئے۔ سب نے ساحر پر تاج محل کی بے حرمتی کا لٹھ چلا رکھا ہے۔ جب کہ حسنِ تعمیر اس نظم کا موضوع ہی نہیں ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ تاج محل کے حوالے سے ایک مفلس ومجبور انسان کی محبت کا موضوع اچانک ساحر کے ذہن پر نہیں ٹپکا تھا۔ اس موضوع کے ابتدائی سرے ساحر کی نظم 'نور جہاں کے مزار پر' میں مل جاتے ہیں جس میں ساحر نے تاریخ کے جبر کو بے نقاب کرتے ہوئے

ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ساحر کا اعتراض و احتجاج تاج محل کی آڑ میں ان تہذیبی، روایتی اور ثقافتی مفروضات کے خلاف ہے جنہیں ظلم، ناانصافی، عدم مساوات اور لوٹ کھسوٹ کے کریہہ اور لائق نفریں چہرے کو چھپانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاج محل کے بے پناہ حسن پر، جو عوام و جمہور کی صناعی اور اجتماعی فن کاری کا لازوال کرشمہ ہے، ہم ایک 'شاہی محبت' کا لیبل چسپاں کرکے 'شاہی جبر' کی بدصورتی کو چھپانے کی ہی ایک لاشعوری کوشش کرتے رہے ہیں، اور ساحر کو یہ گوارا نہیں کہ جسے وہ محبوب سمجھتا ہے وہ مردہ شاہوں کے مقابر سے اس طور پر دل چسپی لے اور اپنے اجداد کے خون کی بے حرمتی کا سامان بنے اور اس کی محبت کے تقدس کو سطوتِ شاہی کے نشانات سے ٹھیس پہنچے۔

جو نقاد اس نظم کو اردو کی بہترین نظموں میں شامل کرتے ہیں انھوں نے بھی یہ شبہ ضرور ظاہر کردیا ہے کہ اس طنزیہ نظم میں تاج محل کے حسن کو نہ گھسیٹا جاتا تو بہتر تھا۔ آج کل کے نقاد بھی ساحر کی اس شاہکار نظم کے معترف ہونے کے باوجود میرے دوست سراج نقوی کی طرح، احتیاطاً یہ ضرور لکھ دیتے ہیں کہ اس نظم کے بنیادی نظریہ سے کئی لوگوں کو اختلاف رہا ہے۔ اور یہ تو دوسرے بہت سے عظما کی طرح، جن میں رابندر ناتھ ٹیگور کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے ("تاج محل رخسارِ انسانیت پر محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہے") سراج نقوی نے بھی آخر لکھ ہی دیا ہے کہ تاج محل محبت کی لازوال علامت ہے۔

دراصل محبت کی علامت والی بات اتنی بار دہرائی گئی ہے کہ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی جیسا بظاہر ذمہ دار اور سنجیدہ نقاد بھی اسے اتنے آرام سے بچگانہ اور کھوکھلی انقلابیت والی 'معمولی' اور تھرڈ ریٹ نظم قرار دے کر الگ ہو جاتا ہے جیسے اس قدر منفی اور غیر ذمہ دارانہ بات کہنے کے لئے اسے کوئی دلیل یا ثبوت دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور یہ کہ یہ بات چونکہ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھ دی ہے اس لئے اسے بے چون و چرا مان لیا جانا چاہئے۔

ویسے قبلہ فاروقی صاحب پر ہی کیا موقوف ہے۔ ان کے بعد کے نقادوں کا حال بھی کچھ مختلف نہیں کہ ان میں بھی بیشتر کلیشوں کے زیر اثر ہی نقادی کا دھندا کرتے ہیں۔ میرے مشفق کرم فرما پروفیسر ابوالکلام قاسمی البتہ ان سے قدرے مختلف ہیں۔ ایک مرتبہ ذاتی گفتگو میں انھوں نے فرمایا کہ اردو میں کوئی شاعر ادیب یا ادب نواز قاری ایسا نہیں ملے گا جس نے تیس پینتیس سال کی عمر تک ساحر کو شوق سے نہ پڑھا ہو، اس سے متاثر نہ ہوا ہو اور اس کی ایک دو نظمیں اسے زبانی یاد نہ ہوں۔ اور وہ بھی مختصر نہیں طویل نظمیں۔ مصرع بہ مصرع! اس کے بعد انھوں نے ایک مضمون مرحمت فرمایا جسے ساحر کی شاعری پر لکھے گئے عمدہ مضامین میں شمار کیا جانا چاہئے۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ مضمون کی ابتدا وہ ساحر کی انفرادیت اور مقبولیت کے اعتراف سے

کرتے ہیں لیکن آخر تک آتے آتے ان کا نظریہ اس قدر تبدیل ہو جاتا ہے کہ ساحر کو اردو کا ایک اہم شاعر ماننے میں بھی انھیں تکلف ہونے لگتا ہے۔ یہی نہیں وہ 'پر چھائیاں' کو اردو کی ایک اہم نظم قرار دینے کے بعد اس میں بھی اصلاح فرما دیتے ہیں۔ میں نے ان اصلاحات کے بعد 'پر چھائیاں' پڑھی تو بس ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ ساحر زندہ ہوتے اور یہ اصلاحات ان کے سامنے آتیں تو وہ اپنا اور قاسمی صاحب دونوں کا سر پیٹ لیتے۔ بہر کیف یہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لئے بڑی بات یہ ہے کہ اسی مضمون میں قاسمی صاحب نے ایک بات بڑے کام کی اٹھائی ہے:

"...سب سے اہم سوال یہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ایسی شاعری جو اظہار کا بالواسطہ اسلوب نہیں اپناتی، اور پڑھنے یا سننے والے کے دل و دماغ کو براہِ راست اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، وہ اپنے زمانی حوالوں سے کٹ کر اپنا اثر تو نہیں کھو دیتی؟ کیا ایسی شاعری اپنی جذباتی اپیل کے باعث جس شدت سے اثر انداز ہوتی ہے، اسی شدت کے ساتھ بہت جلد ذہنوں سے زائل تو نہیں ہو جاتی؟..."

ظاہر ہے ساحر کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہی ہوتا تو ساحر کی کلیات کے ایڈیشن اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں آج بھی گرم کیک کی طرح نہ بک رہے ہوتے۔ یا انٹرنیٹ کے google سرچ انجن میں ساحر لدھیانوی کا نام ٹائپ کرنے پر اس کے پونے دو لاکھ سے زائد (178000) نتیجے نہ برآمد ہوتے جب کہ یہی سرچ انجن شمس الرحمٰن فاروقی ٹائپ کرنے پر صرف 2600 متعلقہ یا غیر متعلقہ نتیجوں کا حساب دکھاتا ہے۔ ان سے کہیں زیادہ ٹوٹل سرچ ریزلٹ (140000) تو اپنے ڈاکٹر اطہر فاروقی کے برآمد ہو جاتے ہیں۔

ساحر کی فکر اور شاعری میں احساس کی جو شدت ہے، جذبات کی جو فراوانی ہے اور ذاتی محرومیوں کا جو کرب انگیز بیان ہے وہ محض فن کاری یا صناعی نہیں ہے۔ اس کے ہر بیان کی جڑیں معروضیت اور عقلیت پسندانہ طرزِ فکر میں پیوست ہیں۔ وہ حقیقتوں سے آنکھ نہیں چراتے۔ ناکامیوں کی صورت میں کسی طرح کے فرار کی ترغیب نہیں دیتے۔ نامساعد اور منفی صورتِ حالات میں بھی وہ مثبت قدروں کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔ مایوسیوں اور ناکامیوں کے درد انگیز بیان کے باوجود ان کی شاعری قنوطیت کی نہیں رجائیت کی شاعری ہے، جو حوصلوں کو توڑتی نہیں جوڑتی ہے۔ ان کے یہاں ایسی کسی تفریق یا تقسیم کے لئے جگہ نہیں جس کی بنیاد رنگ، نسل، صنف، مذہب، ذات، برادری، علاقہ، وطن، تہذیب یا ثقافت پر رکھی گئی ہو۔ یہی سب کل ملا کر ساحر کی شاعری یا یوں کہہ لیجئے کہ 'ساحری' کی سائنس ہے۔ اور اسی سائنس نے ساحر کی شاعری کو آج بھی مقبول اور بر محل relevent بنا رکھا ہے۔

ساحر کی بہت سی نظمیں زمانی حوالوں سے جڑی ہوئی ہیں اس کے باوجود آج تک ان کی معنویت میں کوئی

کی نہیں آئی ہے۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی معنویت اور افادیت میں کچھ توسیع ہی ہوئی ہے۔ اکثر نظموں کے تو زمانی حوالے لوگوں کو یاد بھی نہیں ہیں۔

'نذرِ کالج' والی نظم لدھیانہ گورنمنٹ کالج کے لئے 1943 میں کہی گئی تھی مگر آج بھی یہ طلبا کی نوجوانی کا عالمی ترانہ سمجھی جاتی ہے، جو ہر طالب علم پر گزرتی ہے اور جس سے دنیا کا ہر طالب علم گزرتا ہے۔

تو آج بھی ہے میرے لئے جنتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال

جوانی کے یہ چار سال جن میں انسان کی پوری شخصیت اور پوری زندگی لپٹی رہتی ہے اگر آج بھی با معنی ہیں تو اس نظم کی معنویت بھی تاحشر باقی رہنے والی ہے۔

'آج' تقسیم وطن کے دوران ہونے والے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں کہی گئی تھی۔ لیکن غیر معمولی تاثر کی وجہ سے آج بھی جدید اردو شاعری اور نظموں کے ہر انتخاب میں ساحر کی اس نظم کو ضرور شامل کیا جاتا ہے۔

ساتھیو! میں نے برسوں تمھارے لیے
چاند تاروں، بہاروں کے سپنے بنے
حُسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمھارا مغنی تمھارے لیے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا...
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو

میں تمہارا مغنّی تمہارے لیے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہوں گا
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو...

'مرے عہد کے حسینو' زمین سے خلا میں بھیجے جانے والے پہلے مصنوعی سیارے 'اسپتنک' کی کامیاب پرواز اور زمینی مدار میں اس کے قیام سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ مگر اسے آج بھی انسانی عظمت اور رجائیت کے ساتھ ارتقا کے تسلسل کا خوب صورت اور دل نشیں نغمہ تصور کیا جاتا ہے اور سخت سے سخت نقاد بھی اسے ساحر کی سب سے اچھی نظموں میں شمار کرتے ہیں۔

جنہیں بُت گروں نے چاہا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دور کے حسیں ہیں انہیں پاس لا کے پوجیں
جنہیں مطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرولیں
جنہیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمولیں
جو ہزار کوششوں پر بھی شمار میں نہ آئے
کبھی خاک بے بضاعت کے دیار میں نہ آئے
جو ہماری دسترس سے رہے دور دور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک
مرے عہد کے حسینو! وہ نظر نواز تارے
مرا دورِ عشق پرور تمہیں نذر دے رہا ہے
وہ جنوں جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا!
وہ خلا کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے
مرے ساتھ رہنے والو! مرے بعد آنے والو
میرے دَور کا یہ تحفہ تمہیں سازگار آئے
کبھی تم خلا سے گزرو کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گلعذار آئے

'یہ کس کا لہو ہے' 1946 میں جہازیوں کی اس بغاوت کو منسوب تھی جس کی خبروں کا انگریز حکومت نے مکمل بلیک آؤٹ کرا دیا تھا۔ لیکن اس نظم کو بغاوت پر آمادہ بے صبر اجتماعی شعور کا وہ سوال نامہ تسلیم کرنا پڑتا ہے جس کا سامنا

ظلم وتشدد پر آمادہ ہر حکومت اور ہر رہنما کو آج بھی کرنا ہے اور کل بھی کرنا پڑے گا۔

سمجھوتے کی امید سہی سرکار کے وعدے ٹھیک سہی

ہاں مشقِ ستم افسانہ سہی، ہاں پیار کے وعدے ٹھیک سہی

اپنوں کے کلیجے مت چھیدو اغیار کے وعدے ٹھیک سہی

جمہور سے یوں دامن نہ چھڑا

اے رہبرِ ملک وقوم بتا

یہ کس کا لہو ہے کون مرا

'خون پھر خون ہے' بلجیم کی غلامی سے آزاد ہونے والے افریقی ملک کانگو کے مجاہدِ آزادی اور جمہوری طور پر منتخب ہونے والے اس ملک کے اولین وزیر اعظم پیٹریس لومبا (35 سال) کے، بلجیم اور امریکہ کی سازش سے ہونے والے قتل پر جواہر لال نہرو کے اس بیان سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی کہ: ''مقتول لومبا زندہ لومبا سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے!''

لیکن 1961 میں کہی گئی یہ نظم اپنی تخلیق کے پچاس سال بعد بھی احتجاجی شاعری کا محض ایک استعارہ نہیں بلکہ ضرب المثل بنی ہوئی ہے:

خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

خود جواہر لال نہرو کی موت پر کہی گئی نظم 'جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے' اس عظیم شخصیت کی وفات کا ذکر کئے بغیر بھی انسان اور انسانیت کی عظمت کے لازوال ہونے کے آفاقی پیغام کے طور پر ہی پڑھی جائے گی اور اسی طرح اپنے آفاقی تاثر کو قائم رکھے گی۔

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے

دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مر جاتے

سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مر جاتے

ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

اور بھی کئی نظمیں ہیں جو مخصوص واقعات سے منسوب ہونے باوجود اپنی معنویت و مقصدیت کے لحاظ سے آج بھی سانس لے رہی ہیں۔ 1965 کی ہند پاکستان جنگ کے پس منظر میں کہی گئی 'اے شریف انسانو' ہو یا

1968-69 میں غالب صدی پر کہی جانے والی نظمیں 'جشنِ غالب' اور 'گاندھی ہو یا غالب ہو' یا پھر پدم شری کا اعزاز ملنے پر دنیا بھر کے لوگوں کے خراج تحسین کے جواب میں تخلیق ہونے والی نظم 'میں تو کچھ بھی نہیں'... یہ تمام نظمیں کسی وقتی تاثر یا جذبے کے زیر اثر کہی گئی وقتی اہمیت کی نظمیں نہیں ہیں جو اپنی تخلیق کے چند روز بعد ذہنوں سے غائب delete ہو جاتی ہیں۔ یہ نظمیں آج بھی پھل پھول رہی ہیں اور اس حقیقت کے باوجود نئے معنی و مفہوم پیدا کر رہی ہیں کہ ان کے خالق نے کوئی بھی بات مبہم اور غیر واضح طور پر نہیں کہی تھی۔

اصل میں کسی تخلیق کے وقتی یا آفاقی ہونے کا تمام تر دارومدار تخلیق کار کی اپروچ اور ذہنی رویئے پر زیادہ ہوتا ہے صنائی یعنی کرافٹ اور تکنیک پر قدرے کم۔ ورنہ تخلیق تو بہر حال کسی نہ کسی زمانی نقطے سے جڑ کر کسی خاص لمحے یا واقعے سے ہی تحریک پاتی ہے۔ کروڑوں اربوں انسانوں کی تخلیق بھی تو انفرادی طور کسی نہ کسی 'لمحۂ لذت' کی ہی پیداوار ہے۔ اس خاص لمحے پر جنین کی ساخت ڈی این اے کے کس پیٹرن pattern کے ساتھ ہوتی ہے اسی پر پیدا ہونے والے بچّے کی شخصیت اور عمر کا بڑی حد تک دارومدار ہوتا ہے۔ ادبی تخلیق کی عمر بھی خالق کی اس وقت کی ذہنی کیفیت اور نظریے پر منحصر ہوتی ہے۔ خالق کی سوچ وقتی اور محدود ہوگی تو تخلیق چند اشاعتوں اور قرأتوں کے بعد دم توڑ دے گی۔ لیکن خالق اپنے احساسات کو وقت کی حدوں سے آگے رکھ کر اپنی فکر کا حصہ بنائے گا اور انہیں آفاقیت کا جامہ پہنا کر نظم کرے گا تو تخلیق کے ساتھ خالق کی اپنی عمر بھی دراز ہوتی جائے گی۔ ساحر کی سائنس یہ ہے کہ وہ ہر واقعے کو زمان و مکاں کے تسلسل میں بھی تولتے ہیں اور اس کے لمحاتی تاثر impact کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ لمحاتی تاثر کے تحت کہی گئی ان کی واقعاتی نظمیں (وہ نظمیں جن کے ساتھ واقعے کا باقاعدہ حوالہ ان کے مجموعوں میں دیا گیا ہے) آج بھی اسی طرح تر و تازہ لگتی ہیں جتنی تخلیق کے وقت تھیں۔ ورنہ واقعاتی نظمیں عموماً شادی کے لئے کہے گئے سہروں اور رخصتیوں کی طرح ہوتی ہیں کہ رات گئی تو بات گئی، اور ولیموں کے بعد صرف کھانے کا ذائقہ یاد رہ جاتا ہے۔

ساحر کی سائنس 'تلخیاں' کے اولین شعر سے ہی شروع ہو جاتی ہے:

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اس سے بڑھ کر معروضیت کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر وہ مشہور قطعہ، چند کلیاں نشاط کی چن کر... اس میں محبوب سے ملاقات اور اس کے بعد کی ملی جلی کیفیت کا بیان حقیقت کا ایک ایسا دل دوز اظہار ہے جو دلی کیفیات کے ہر زیر و بم کو پوری سچائی سے بلا کم و کاست بیان کر دینے کی سائنسی روش اور شعار کے بغیر ممکن نہیں۔

'تاج محل' اور نور جہاں کے مزار پر' کا بیان آ ہی گیا ہے کہ دونوں نظمیں تاریخ اور عصر حاضر کے سائنسی شعور و ادراک کی پروردہ ہیں۔ مکمل سچائی کا پوری طرح ایماندارانہ اظہار اور بیان ساحر کی فکر اور شاعری کے داخلی دروازے کا کلیدی پتھر ہے۔ ساحر کی شاعری، ساحری اور عظمت کا پورا ایوان اسی کلید پر ٹکا ہوا ہے۔ شاعر کی شان

میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے والے مقطعوں، تعلّی کے استعاروں اور بلند بانگ دعووں کے شور سے بھری ہوئی اردو شاعری میں جب خود کو "پل دو پل کا شاعر" بتانے والی آواز سنائی دیتی ہے، "میں تو کچھ بھی نہیں" کا اعتراف نامہ کانوں میں پڑتا ہے اور "میں دار ورسن تک جا نہ سکا" کی پشیمانی آہ بھر کر ابھرتی ہے تو سماعتیں چونک اٹھتی ہیں، دل تھرّا اٹھتا ہے اور دماغ اس شاعری پر نہ صرف ایمان لے آتا ہے بلکہ اپنی فکر کا محاسبہ بھی شروع کر دیتا ہے جو شاعر کا اصل مقصد ہے۔ یہ بھی ساحر کی سائنس ہے جس کی شاعری میں ایک بھی مقطع نہیں پایا جاتا۔ ■■

احمد سہیل، امریکہ

ساحر کا ساحرانہ شعری مخاطبہ

ایک نئی تحقیق کے مطابق یہ قیاس ہے کہ ساحر لدھیانوی کی پیدائش امین پور بازار لائل پور میں ہوئی ۔لائل پور کا نیا نام فیصل آباد (پاکستان) ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ ساحر لدھیانہ میں ہی پیدا ہوئے ۔ میرے دوست اشفاق بخاری صاحب جو فیصل آباد (لائل پور) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ساحر لدھیانوی لدھیانے میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ اشفاق صاحب کا کہنا ہے کہ ساحر لدھیانوی کے والد چوہدری محمد فضل احمد کی لائل پور (فیصل آباد) میں زرعی زمینیں تھیں۔ وہ لدھیانہ سے لائل پور (فیصل آباد) آتے جاتے رہتے تھے اور ان کا قیام لائل پور کے محلے گرونا نک میں رہتا تھا۔

ساحر لدھیانوی کے اصل شاعرانہ فن پر سنجیدگی سے کم لکھا گیا کچھ ان کے ساتھ ناانصافی بھی ہوئی اور ان شاعرانہ کمالات کو اس رخ سے مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا، جو سطحی ،صحافتی اور ان کی نجی زندگی سے متعلق تھا۔ جس کی جگالی ان کی موت تک جاری رہی (اور اب تک جاری ہے) شاید ساحر کو ان کی شاعری نے کم اور ان کی فلمی شاعری و گیتوں، اخبارات، فلمی مجلوں، اسکینڈلوں نے ان کو مقبول ''شخصیت'' بنا دیا سب سے زیادتی ان کے ساتھ یہ ہوئی ان کی شاعری پر اور ان کے شاعرانہ ہنر وفن پر ان لوگوں نے رائے زنی کی ۔۔۔۔ لکھا اور تجزیات کی ڈول ڈالی جو کمزور ذہن کے مالک تھے۔ اور ان کا فکری مزاج ''شاعرانہ مزاج'' سے عاری تھا۔ ان کے ذہنی بنجرپن نے ساحر لدھیانوی کی شاعری کی شکل ہی بگاڑ دی اور ان کی تحریریں مشکوک نوعیت کی ہیں اور انھوں نے ساحر کی شاعری کے جوہر کو بنا کتبے کے دفنا دیا۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری کے حوالے سے انھی باتوں کی ترویج ہوئی جو ''فلمی'' نوعیت کی تھیں۔ ان کے ادبی اسلوب و ماہیت پر کم نظر ڈالی گئی۔

ان کی شاعری کی اُٹھان ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہوئی۔ یہ اردو میں رومانوی تحریک (مخزن تحریک بھی) کا اختتامی دور تھا۔ یقیناً رومانوی تحریک کے اثرات ساحر لدھیانوی پر ہی نہیں بلکہ اس زمانے کے ترقی پسند شعرا پر کہیں نہ کہیں ضرور پڑے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں رومانیت کی سیمابیت اور غنائیت ہے اپنی تنہائیوں اور فراق کے نرم گرم جذبات میں ان کا مخصوص نفسیاتی آہنگ اور مفاہیم سے ان کے

اشعار اپنی کائنات الگ کرتے ہیں۔ جس کی جذباتی اور جمالیاتی تپش قاری کے ادراک میں تیزی سے سرایت کرتی نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار معروضی موضوعی کیفیات، تجربات اور اضراب سے رقم ہوئے وہ سانحہ دل نہیں بلکہ سانحہ بشر ہے۔ ہماری زندگی اور اس کی معاشرت میں مشاہدہ اور محسوس کیا جاتا ہے۔ مگر ان کے پاس ان تمام مسائل اور پریشانیوں کا کوئی حل نکلتا محسوس نہیں ہوتا۔ بس وہ کیفیت کو بیاں کر کے پردے سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خدا نے ہمیں مستقبل نہیں دیا۔ ماضی ہماری یادوں یا کہیں دستاویزی صورت میں ہمارے پاس موجود ہوتا ہے۔ حال میں ہم سانس لیتے ہیں اور اسے محسوس کرتے ہیں جبکہ مستقبل معدوم ہوتا ہے۔ فرد اپنے آنے والے حالات کا قیاس تو کر سکتا ہے مگر اس سلسلے میں وہ کوئی مستقل بات دینے سے قاصر رہتا ہے۔

ساحر لدھیانوی کے شاعری کے رومانی کلام و مزاج پر ''فیضان'' (فیض احمد فیض) کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ساحرؔ نے اردو شاعری کے فکری عنصر میں نوجوانوں کی حساسیت کی پیکریت کو نئے رنگ بھر دیے۔ مفاہیم کو منفرد جمالیاتی پیرائے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ وہ قاری سے براہِ راست کلام کرتے ہیں۔ جس میں غصہ بے چینی اور اضطراب ہوتا ہے۔ اور خوابوں کی رومانیت بھی مشاہدے میں آتی ہے۔ ان کے عشق میں سکونی کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی مخصوص قسم کا جذباتی ردِعمل اور ہل چل بھی ہے۔ جو اداسی کی تشکیک اور انجانے خوف کو بھی اُبھارتی ہے۔ عشق کے انبساط میں بھی اداسی انہیں گھیر لیتی ہے۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات صحیح
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں ''(ردِعمل)''

وہ ہجوم میں تنہا ہیں اور یہی کیفیت ان کی شاعری میں اظہار کی منفرد جمالیات تشکیل دیتی ہے۔ شعور اجتماع کے نظریے پر یقین رکھنے والے ساحرؔ کی شاعری میں انفرادی عمل اور واردات ایک شعری کائنات ترتیب پاتی ہے۔ ایک ایسی تنہائی جو پتھروں، کنکریٹ کے جنگل (شہر) میں اسے اداس اور بے چین کئے ہوئے ہیں۔ وہ جب بھی تنہا ہوتے ہیں۔ اتنے ہی ''آزاد'' ہوتے ہیں۔ اور ان کی تنہائی ہی ان کی شاعری میں ''حدت شعر'' اور ''حریت اظہار'' کا خلیقہ بن جاتا ہے۔

ساحر کی شاعری میں رومانی مکالمہ بہت بے باک ہوتا ہے۔ اور واحماتی فضا اور رومانوی آفاق سے وہ اپنے معشوق کو جو بھی مشورہ دیتے ہیں اور یہ احساس بھی دلواتے ہیں کہ عشق کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں اس کے لیے دل گردہ چاہیے۔ یہ جگر سوزی کا کام ہے۔ کیونکہ تمدن کی ریاکاری، منافقتیں اور رسم و

رواج کی بندشیں و تحریمات ان کے عشق میں زہر گھول دیتی ہیں۔

ماضی ان کے لئے جمالیاتی اذیت ہے۔ سفر کو وہ شکست تصور کرتے ہیں اور عشق کی پرانی کہانی کا ذکر ان کے لئے اذیت کا سبب بنتی ہے۔ ان کا تجسس اپنے معشوق کو عشق سے برطرفی کا مشورہ بھی دیتا ہے۔ عشق کی وحشت اس قدر ہے کہ ساحر کو پسپائیت اختیار کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

عہد گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو
ایک آوارہ منزل کو ستاتی کیوں ہو
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر میری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

عشق کا سفر نفس انفرادی سے ابتدا کرتا ہے جب باطنی و معروضی حقائق کا تصادم ہوتا ہے تو وحدت عشق بکھر جاتی ہے اور یہ عشق میں جس قسم کی قوت اور ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے شاعرانہ مزاج کے سراپے میں کہیں نظر نہیں آتا۔

ساحر لدھیانوی اپنے حساس شعری محاکے میں وہ حقائق بیان کر دیتے ہیں جو اُن کی جذباتی اور حساس طبیعت کے سبب معاشراتی دہشت کا شکار ہیں۔ وہ ''آزاد محبت'' کے متمنی ہیں۔ اور ثقافت و تہذیب ان کے عشق پر نظریں ہی نہیں گاڑے ہوئے ہے بلکہ زندگی کے کھوکھلے رکھ رکھاؤ نے ان کے جذبوں پر پہرے لگائے ہوئے ہیں۔

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پر بڑی شرطیں ہیں
سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارہ کرلوں
خود کو بیگانہ، ترغیب تمنا کرلوں (سوچتا ہوں)

محبت کی اذیت وہ کچھ لمحات لطف و انبساط کے حاصل کر لیتے ہیں مگر پردہ اٹھتے ہی عشق کی اذیت برداشت نہیں کر پاتے اور ہتھیار ڈالتے نظر آتے ہیں۔ یہاں ساحر کا معاشرتی احوال میں ٹھٹھرا ہوا بے رحم عاشقانہ تجربہ اپنے سے ماورا کسی حقیقت کا انکشاف کرنے میں ناکام رہتا ہے اور ان کا شعری بیانیہ ایک ناپختہ نفسی تجربہ ثابت ہوتا ہے اور انھیں اس بات کا بھی شعور نہیں ہو پاتا کہ جمودی معاشراتی احوال میں ''عشق کی آذارکاری'' کسی حرکت

کا سبب ثابت نہیں ہوتی اور وہ میکانی تمثالوں اور تجربوں کی شعریات یادوں کو تو جوڑ سکتی ہے مگر ان کا یہ عمل یاسیت کی فضا قائم کر کے مقدر سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ جس کی نہ کوئی ابتداء ہوتی ہے نہ اختتام ہوتا ہے۔ جس میں نہ کچھ پایا جاتا ہے نہ کچھ کھویا جاتا ہے۔

ساحرؔ لدھیانوی کے یہاں شہری زندگی کی اذیت ناکی اضطراب اور انسان کے ہاتھ انسان کا استحصال کا گہرا کرب واحساس بھی نمایاں ہے۔ اس قسم کا حقیقی تجربہ ہر انسان کو ہوتا ہے۔ بین السطور میں یہ نقل مکانی کا المیہ بھی ہے۔ جغرافیائی حرکت پذیری تو ہو جاتی ہے مگر نئے شہر میں آ کر اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ قنوطی فضا پھیل کر ایک ناسٹلجیائی کیفیت کا احساس دلواتی ہے اس کا حضری تجربہ بڑا المناک ہے۔

میں شہر جا کے ہر اک در پہ جھانک آیا ہوں
کسی جگہ میری محنت کا مول نہ مل سکا
ستم گروں کے سیاسی قمار خانے میں
الم نصیب فراست کا مول نہ مل سکا ("تلخیاں")

ساحرؔ کی رومانی شاعری میں والہانہ عشق مسلم ہے اور سپردگی کا اظہار بہت عمیق ہے۔ وہ اپنی برباد محبت کا ماجرا اپنے محبوب تک پہنچانے کا عزم لئے خدا سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی محبت سالم وثابت رہے اور خدا سے معشوق سے ملنے کی تمنا کرتے ہیں۔

میری بربادیوں کی داستان ان تک پہنچ جائے
سوا اس محبت کے خدا سے اور کیا مانگوں

ساحرؔ کا عاشقانہ تجربہ مخصوص معاشرتی تجربوں کا ردعمل ہے۔ جس کا مقصد ایک طرف تو شعری جمالیات کی خلقی تشکیل ہے تو دوسری طرف وہ جمالیاتی کیفیت کو مخصوص تاثر کے ساتھ شاعرانہ معنیات بخشتے ہیں ذات کی ٹوٹ پھوٹ اور اپنے کھوئے ہوئے عشق کی نوحہ گری ساحرؔ کو خوب آتی ہے۔ یہ اس فن کے ماہر ہیں۔

ان کی شاعری میں بیسویں صدی کے تیسرے سے شروع ہوئے معاشرتی سیاسی، سماجی اضطراب، اعصابی تناؤ کا قدرے احتجاجی، مزاحمتی لہجہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر کچلے ہوئے لوگوں کے جذبات ان کی محرومیوں ان کے دکھ اور ان پر مظالم اور استحصال کی کرب انگیز داستانیں پوشیدہ ہیں۔ وہ محبوب سے معاملہ کرتے ہوئے بھی سماجی ناہمواریوں اور غریبوں کو نہیں بھولتے اور اس کا اظہار بڑی بے باکی سے کر دیتے ہیں۔ اور قوت تخیل سے اسے اپنے تخلیقی آفاق کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ ساحرؔ کا عشق افلاطونی نہیں بلکہ عملی دنیا کا ایک حصہ ہے اور اظہار محبت کرتے ہوئے واہموں میں مبتلا نہیں ہوتے، محبوب سے براہ راست مکالمہ کرتے

ہوئے دوٹوک اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور قاری ان کیم محبوبہ کو اپنی محبوبہ تصور کر لیتا ہے۔ساحرؔ کی شاعری کا مقصد شعری جمالیات کا حصول تو ہے مگر یہ اس کے حصول وسیلہ نہیں ہے۔لہذا شاعر اپنے وجود کے صحرا میں اپنے آپ کو''گم'' نہیں کرتا بلکہ اپنے وجود کا اظہار عرفان ذات سے کرتا ہے۔یہ اس معاشرے کا ماجرہ ہوتا ہے۔جس معاشرے میں بے ضمیری ہو۔وہ ضمیر کی بازیافت کی سعی کرتے ہیں۔وہ سماج میں اپنے اشعار سے انقلاب کے خواہش مند ہیں لیکن انہوں نے قلم کی آبرو برقرار رکھی اور انھوں نے اردو کے شاعرانہ مزاج کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ان کی شاعری جمالیات،حقیقت پسندی،مقصدیت،اور سیکولرازم کا احاطہ کرتی ہے۔ان کا رومانی اسلوب بے باک ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نوعیت کا بھی ہے۔

ساحرؔ نے اپنی ایک نظم میں''ذات کی علامت'' کا استعمال کیا ہے۔اپنے ماضی کے تجربے سے ایک مخصوص بچے کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔یہ بچوں کی عام نفسیاتی صورتحال ہے مگر اس نظم میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اپنی ضدی فطرت کو انسان تاحیات تبدیل نہیں کرتا۔

دل نادان میں
تجھے پانے کی تڑپ میں سمجھا
کہ
بچے ضدی کیوں ہوتے ہیں (ضدی بچے)

ساحرلدھیانوی کی شاعری بالخصوص گیتوں میں فیکٹری کے مزدور اور کھیتوں کھلیانوں پسینہ بہانے والے محنت کشوں کے مسائل کو حسائیت اور بڑے خلوص سے اپنے شعری اظہار کا ذریعہ بنایا۔خاص طور پر پردہ سیمیں پر اپنے شعری ہنر کا ابلاغ بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ساحر چاہتے ہیں کہ محنت کش استحصال کے معنوں کو سمجھیں اور ان کا باہمی اتحاد و یگانگت ہی یساریت پسند انقلاب کا سبب بن سکتا ہے۔جو ان کے مصائب اور آلام سے نجات دلواسکتا ہے۔

ہم محنت والوں نے جب بھی مل کر قدم بڑھایا
ساگر نے رستہ چھوڑا اپنے سیس جھکایا
فولادی ہیں سینے اپنے،فولادی ہیں بانہیں
ہم چاہیں تو پیدا کر دیں چٹانوں میں راہیں
ساتھی ہاتھ بڑھانا

ساحرؔ کی تاج محل پر نظم اردو شاعری کا رومانی ''ساگا'' ہے جو اردو کی بہترین رومانوی نظم میں شمار کی جاسکتی ہے۔

انہوں نے چالیس کی دہائی میں بنگال کے قحط پر بہترین نظم لکھی ہے اس میں بنگالیوں کی بھوک افلاس کی دردناک عکاسی کی ہے۔ ساحر کا خیال ہے کہ یہ قحط برطانوی حکومت کے عدم النصرام، غفلت اور دیگر انتظامی بے قاعدگیوں کے سبب بنگالیوں پر قہر بن کر اترا۔ اس زمانے میں انہوں نے اس امر سے برھمی کا اظہار کیا کہ ان کے کمیونسٹ ''ساتھی'' برطانوی حکومت کی ملازمتیں کر رہے ہیں اور بنگال باہر قحط کے اس سانحے پر کم آوازیں اٹھیں بنگال کے دکھ درد میں ہندوستان خاموش تماشائی بنا رہا۔ ساحر نے جمالیاتی رموز و کنایہ کے شعری نظام سے نئے شعری تجربات کیے انھوں نے روایتی اردو شاعری کی روایتی استعاروں ''کمال فنکاری'' سے اپنی شعری کائنات کی تزئین کی لہٰذا وہ مفاہیم کی نئے انداز میں غازہ بندی کرتے ہیں۔

شاید ساحر لدھیانوی اپنے دور کی ترقی پسند نسل میں وہ شاعر ہیں جنھوں نے غزلیں کم ہی لکھیں۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ ترقی پسندوں کے یہاں غزل کچھ زیادہ پسندیدہ صنف سخن نہیں ہے۔

ساحر لدھیانوی نے ترقی پسند نظریے میں رومانی شاعر کی آمیزش سے اسے اظہار اور عوامی پسندیدگی کا مرغوب موضوع بنا دیا جوان کے ذہن اور مزاج کی تطہیر کرتی ہے۔ ان کی رومانوی نظموں میں وہ عاشق تو دکھائی دیتے ہیں لیکن پارٹی لائن کے تحت نعرے بھری شاعری کی تو ان کے سکہ بند ہونے کا ثبوت مل گیا۔ جو عوامی جذبوں کے لئے بہت زرخیز ہے۔ اور عام آدمی ان کے جذبوں سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس میں معاشرتی حقائق بھی نظر آتے ہیں لیکن اس میں گہرائی کم ہے۔ ساحر نے اپنی ہی زندگی میں ترقی پسند تحریک کو دم توڑتے دیکھا ہے۔ اردو ادب میں متبادل افکار ابھرے شعر و ادب میں تازہ رویئے دریافت ہوئے اور نئی حسیت اردو کی فکری بحث کا حصہ بنی۔ ان تازہ ہواؤں کو اردو میں محسوس کیا گیا۔ ساحر نے ان مباحث اور نئی ہواؤں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور وہی پرانی لائنوں پر شاعری کرتے رہے۔ ان کی ذہنی بلوغیت سن جوانی سے باہر نہ نکل سکی اور یوں ان کی شاعری دوسرے ترقی پسند ''ساتھیوں'' (کامریڈ) کی طرح جمود کا شکار ہوگئی اور وہ فلمی شاعری کے رومانس اور شہرت کی بلندیوں کے التباس سے باہر نہیں نکل پائے اور تاحیات فلمی شعری رویئے ہی ان پر حاوی رہے۔ ادھر ساحر پر جو کچھ لکھا گیا اس کا ان کی شاعری میں کہیں ذکر نہیں اور نہ ہی یہ لوگ ساحر کے شعری آفاق کا نفس مضمون یا مقوطہ بیان کرنے میں سراسر ناکام رہے۔ لوگوں کو ساحر کے فلمی گانے اور ذاتی زندگی تو اچھی طرح یاد ہے لیکن ان کی شاعرانہ عظمت اور اس کے جوہر کے متعلق کوئی بات کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارا انتقادی ادب ساحر کے شاعرانہ جوہر کو پانے اور اس کی تفہیم میں ناکام رہا۔ ساحر کی شاعری کو فلمی دھندس نکال کر ان کے اصل شعری مقام کو متعین کرنا ضروری ہے۔

☆☆☆☆

حقانی القاسمی، نئی دہلی

ساحر اور معیار عظمت کی منطق

ساحر کو کسی سند کی ضرورت نہیں کہ ان کے کلام میں ماورائے زماں زندہ رہنے کی بھرپور قوت موجود ہے۔ وجودیاتی یا علمیاتی بیان کی حاجت بھی نہیں کہ ساحر کی شاعری اتنی شفاف، واضح، غیر مبہم ہے کہ براہ راست قاری کے ذہن، ذوق اور ضمیر سے مکالمہ کرتی ہے۔

''تشریحی تنقید' کی مہملیت، شاعری کو موت تو دے سکتی ہے، زندگی نہیں۔ اچھا ہوا کہ ناقدوں نے ساحر پہ کم لکھا اور ساحر کی شاعری تنقید کا بار احسان اٹھانے سے بچ گئی۔ ورنہ یہ شاعری بھی تنقید کی تاریکیوں میں بھٹکتی ہوئی دم توڑ دیتی کہ جس تنقید میں 'ہر شب' کو 'شب قدر' اور 'ہر سنگ' کو 'لعل بدخشاں' کی حیثیت حاصل ہو، ایسی تنقید کی ہیئت ممقوت سے ہی تخلیق کو وحشت ہونے لگتی ہے کہ یہ تو تخفیف قدر کا باعث ہے۔ ہمارے عہد کا عمومی مشاہدہ بھی یہ ہے کہ جن تخلیق کاروں کو نقاد ان فن Establish کرتے ہیں، انہیں منہدم ہونے میں زیادہ مدت نہیں لگتی کہ نقاد کلیہ تو مرتب کر لیتا ہے مگر اطلاقات کی صورتیں، معیارات تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس لیے تنقیدی کلیے کی بلند بالا عمارت بہت جلد مسمار ہو جاتی ہے کہ سارے معیار فرضی اور تصوراتی ہوتے ہیں۔

ساحر کو نقاد کی ضرورت ہو بھی تو کیوں؟ — نقاد عوام کے ذہن سے تخلیق کار یا تخلیق کا رشتہ ہی تو جوڑتا ہے اور یہ کام تو خود ساحر کی شاعری نے کر دکھایا کہ ساحر کی تخلیق کا عوام سے براہ راست ترسیلی رشتہ ہے۔ دونوں کے مابین کوئی دیوار بھی حائل نہیں۔ 'شعر فہمی' تو خیر ساحر کے قاری کا مسئلہ رہا ہی نہیں اور نہ ہی کسی لفظ یا محاورے کی وجہ سے ان کے ساتھ مہملیت کا معاملہ سامنے آیا ہے۔ ان کے الفاظ اور محاورے گنجلک، پیچیدہ نہیں ہوتے جس کی وجہ سے قاری ان کی شاعری کو ناآشنائی کی وجہ سے اس طرح مہمل قرار دے جیسے ایک مقتدر نقاد نے ''افسانہ زلف یار سر کر'' کو اس لیے مہمل قرار دیا تھا کہ وہ سر کردن کے محاورے سے ہی ناواقف تھے۔

ساحر کی شاعری کے ساتھ ترسیل کی ناکامی کا المیہ جڑا ہوا نہیں ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے ان کے کلیات کا ایک بڑا حصہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ساحر نے تلخابہ تنہائی، دست فرط یاس، پس پردہ تشہیر دفا، رسم انقطاع عہد الفت جیسی تراکیب کا استعمال کیا ہے، ان سے عام قاری کا ذہن ناآشنا ہوتے ہوئے بھی سیاق

وسباق کے ذریعہ آہنگ میں اس کے مفہوم کو تلاش کر ہی لیتا ہے جیسے امیر خسرو کی زحال مسکیں پہ عام آدمی بھی سر دھننے لگتا ہے۔ مگر یہاں ایک سوال ہے کہ کیا ترسیل کی تاثیر یا توانائی ہی شعری عظمت کا معیار ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر سادہ اور سلیس شعر کہنے والا ہر فرد عظیم قرار پائے گا۔

لیکن شاید ایسا نہیں ہے!

شاعرانہ عظمت کی بھی اپنی منطق اور منطقے ہیں گو کہ تنقید اس منطق اور منطقے کو بھی حسب منشا تبدیل کرتی رہتی ہے۔ پھر بھی شاعرانہ عظمت کے معیار کا تعین کیے بغیر بات آگے نہیں بڑھائی جا سکتی، کوئی نہ کوئی معیار تو وضع کرنا ہی ہوگا، چاہے وہ سب کے لیے قابل قبول نہ ہو۔

'عظمت شعر' کا ایک معیار تو وہ ہے جو لیوس نے وضع کیا ہے:

''اچھا شاعر وہ ہے جو دوسروں سے زیادہ حیات آشنا اور اپنے زمانہ کا بہتر شعور رکھتا ہو''۔

اور دوسرا ورڈز ورتھ کا ہے۔ جس نے کہا:

''بڑا تخلیق کار وہ ہے جو انسانی احساس کا دائرہ اس طرح وسیع کر کے دکھائے جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو''۔

جب کہ محمد حسن عسکری جیسے بیدار، باخبر فرانسی ادبیات سے آگاہ ناقد نے عظمت شعر کو عرفان حقیقت سے مربوط کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

''اگر کوئی شعر ادبی معیاروں پر پورا اترتا ہے تو وہ شاعری کے دائرے میں داخل ہے۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ یہ شعر عرفان حقیقت میں بھی معاون ہوتا ہے تو عظیم شعر ہے''۔

چوتھی بات شاہ وہاج الدین کی ہے۔ جو زیادہ قرین قیاس لگتی ہے کہ:

''بڑا وہی ہے۔ جس کی تخلیق میں انفس کا عنصر غالب ہو''۔

ان کے خیال میں انسان کے پیش نظر معرفت کے لیے صرف دو ہی تعینات ہیں۔ انفس اور آفاق۔ تکمیل اس میں ہے کہ دونوں کی شناخت ایک ساتھ ہو اور انفس کی شناخت کو آفاق کی شناخت پر غلبہ ہو کیونکہ آفاق جسم ہے اور انفس اس کی روح ہے''۔

ان چاروں اقوال کی روشنی میں ساحر کی شاعری میں عظمتوں کی جستجو کی جائے تو ساحر تخلیق کی راہ میں ایک نشان منزل، کی حیثیت سے سامنے آئیں گے۔

(۱)

پہلا قول ساحر کی عظمت پہ مہر تصدیق ثبت کرتا ہے کہ ساحر حیات آشنا بھی ہیں اور روح عصر سے آگاہ بھی۔ حیات کی کیفیات اور عصر کی تغیرات، تحولات اور ترجیحات سے مکمل آشنائی کے اشارے ان کے

اشعار میں ملتے ہیں۔ان کے یہاں حیات ایک تسلسل میں ہے اور یہی تسلسل ہی حقیقت ہے۔

ہر قدم مرحلہ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انسان کا نصیب آج بھی ہے

●

نسل در نسل انتظار رہا
قصر ٹوٹے نہ بے نوائی گئی

●

زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی

دوسرے فن کاروں کے مقابلے میں ساحر کو زندگی کی حقیقتوں کا ادراک زیادہ ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ساحر نے زندگی، کی تفہیم اور اس کے رموز و اسرار کی تعبیر کے باب میں صرف اور صرف اپنی آنکھوں پہ اعتبار کیا۔ان کی اپنی نظر نے ہی حیات کے بہت سے راز منکشف کر دیے، جو سربستہ تھے۔زندگی کے مد و جزر، نشیب و فراز کو سمجھنے کے لیے ان کا اپنا الگ زاویہ تھا اور اس انفرادی زاویہ نظر نے انہیں زندگی کے ٹھوس حقائق سے آشنا کیا۔

لے دے کے اپنے پاس فقط ایک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

آنکھوں سے بڑی کوئی ترازو نہیں ہوتی
تلتا ہے بشر جس میں وہ میزان ہیں آنکھیں

ساحر کا تصور حیات وسیع ہے مگر کیا محض تصور حیات ہی شعری عظمت کے لیے کافی ہے۔ممتاز پاکستانی ناقد سلیم احمد کا خیال ہے کہ:

''شاعری کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین صرف اس امر سے نہیں ہوتا کہ ہم نے زندگی یا انسان کا کون سا تصور اپنے ذہن میں قائم کیا ہے۔یہ بات بھی دیکھنے کی ہوتی ہے کہ ہم نے اس تصور کو زندگی کے ٹھوس تجربات سے ٹکرا کر دیکھا ہے یا نہیں''۔

ساحر کا تصور حیات یا رویائے زیست ٹھوس تجربات پر ہی محیط ہے:

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ساحر کے تمام تر تصورات، تجربات پر ہی مبنی ہیں اور یہ تجربات ایک حساس فنکار کے ساتھ ساتھ اس انسانی وجود کے ہیں جو صدیوں سے صلیب پہ لٹکا ہوا ہے اور اذیت جس کی تقدیر ہے، تلخیاں جس کے شب و روز کا منظر نامہ ہے۔

ساحر کے تصور اور تجربے میں گہری مماثلت ہے۔ ان کا تصور بھی عظیم ہے اور تجربہ بھی وسیع۔

''شاعر کا تجربہ جتنا گہرا اور ہمہ گیر ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس میں متاثر کرنے کی صلاحیت ہوگی''۔۔۔
فیض احمد فیض

مگر پھر ایک سوال ہے کہ کیا تجربے کی گہرائی اور ہمہ گیری، کسی شاعر کو عظیم بنا سکتی ہے۔ وارث علوی کا خیال ہے کہ:

''وہ فن کار جس کے تجربات کا دائرہ وسیع ہو، لازمی طور پر بڑا فن کار نہیں بنتا۔ تجربات کی کثرت اور رنگارنگی کسی فنکار کے فن کی صفت ہو سکتی ہے، قدر نہیں۔ ذاتی تجربات کا دائرہ محدود ہونے کے باوجود فن کار بڑا فن تخلیق کر سکتا ہے''۔

(۲)

قول ثانی بھی ساحر کی تخلیقی عظمت کے حق میں ہے کہ ساحر نے انسانی احساس کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ ساحر کے احساس کا رشتہ مختلف زمانوں اور عوالم سے ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے ان کے احساس سے مربوط ہیں اور وہ چاروں عوالم جو حقیقت کی منزلیں ہیں، ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت، وہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے احساس کا حصہ ہیں۔ متحرک اور مضطرب احساس کی پوری کائنات ان کی تخلیق میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔ ان کے معمورہ احساس میں ایک حشر سا برپا ہے۔ ان کی سائیکی اور شعور میں تموج و تلاطم ہے۔ اسی لیے وہ آشفتہ شاعر کبھی صبح کے دامن میں عکس شام کی جستجو کرتا ہے، کبھی پردہ شب کو چاک کرنے کی بات کرتا ہے اور کبھی یہ سوچتا ہے کہ:

میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

ذہن ہمہ وقت تصادم، کشاکش اور تناؤ سے گزرتا ہے کہیں خوف اور خواب کا تصادم ہے، کہیں جنگ اور امن، کہیں طبقاتی نظام۔۔۔ کہیں صارفیت، کہیں زرعی اور صنعتی تمدن کی کشمکش۔۔۔ ساحر نے متضاد اور متعارض احساسات کو اپنی شاعری میں ڈھالا اور احساس کی غیر مرئی اور غیر متشکل صورتوں سے بھی عوام کو روشناس کرایا۔

وہ احساس جو ذہن کے کسی خلیے میں گردش کرتے رہتے ہیں، مگر انہیں اظہار کی راہ نہیں ملتی۔ ساحر نے اس داخلی احساس کی تمام تر صورتوں کو شاعری کی شکل عطا کی اور یہی شاعر کا منصب ہے۔

''بظاہر شاعر انہیں کچھ نہیں دیتا لیکن بباطن یعنی شعر کے پردے میں ان کی داخلی زندگی کے تمام زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ شاعر انہیں زندگی کا نسخہ دیتا ہے ان کے انتشار کو ہم آہنگی میں بدل دیتا ہے۔ ان کے کرخت تجربوں کو مترنم بنا دیتا ہے۔ ان کے ذہن کی دھندلی تصویروں کو واضح کر دیتا ہے۔ شاعری میں ہماری زندگی کے گرد آلود تجربے اپنے حقیقی خط و خال سے روشناس ہوتے ہیں'' ۔فراق گورکھپوری

ساحر نے بھی دنیا کو بہت کچھ دیا اور اگر کچھ نہ بھی دیا ہو تو خواب ضرور دیے ہیں۔ وہ خواب جو تعمیر کائنات کے لیے ضروری ہیں اور علوے انسانیت کے لیے لازمی۔ 'خواب' ساحر کی شاعری کا 'اسم اعظم' ہے۔ خواب میں تبدیلی کائنات کی بڑی قوت پنہاں ہوتی ہے۔ خوابوں کی روشنی سے ہی دنیا کے اندھیرے ختم ہوں گے۔ اگر یہ خواب بھی مر گئے تو کائنات ایک بے کیف، بنجر ویرانے میں تبدیل ہو جائے گی۔

ساحر کو خواب میں پنہاں اور تغیر تبدیلی کی قوت کا بھرپور احساس تھا، اسی لیے خواب کی عظمت و معنویت کو اس طرح روشن کیا:

یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اساس تھے
یہ خواب مر گئے ہیں تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دست تہ سنگ ہے حیات

ساحر کے خواب بھی آفاقی ہیں۔ اقتصادی آزادی، امن انصاف اور مساوات کے خواب — نسل انسانی کی بقا کے خواب اور شاید اسی خواب میں ان کے خیال کی عظمت کا راز بھی پنہاں ہے۔ بقول محمد حسن عسکری:

''خیالات و احساسات کی افادیت جانچنے کے لیے کوئی مجرد اور مطلق معیار کام نہیں دے گا بلکہ ان کا صرف ایک پیمانہ ہے۔ کہ یہ خیالات نسل انسانی کی بقا میں کس حد تک معاون ہو سکتے ہیں؟''

ساحر کی طویل نظم 'پرچھائیاں' پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحر کے خیالات نسل انسانی کی بقا کے لیے نہایت مفید اور معاون ہیں۔ خود ساحر نے لکھا ہے کہ:

''ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے، وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوب صورت دنیا دے کر جائے۔ میری یہ نظم اس کوشش کا ادبی روپ ہے''۔

نسل انسانی کی بقاء کا شدید احساس نہ ہوتا تو ساحر یوں نہ کہتے:

ہمارا خون امانت ہے نسل نو کے لیے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی
کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں

اسی خوف نے ساحر کو خواب بننے کے لیے مہمیز کیا:

آؤ کہ کوئی خواب بنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات، آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکیں

خوف اور خواب کی کشمکش نے ساحر کی شاعری کو ایک نیا زاویہ عطا کیا ہے اور یہ بھی ساحر کا 'نشان انفراد' ہے۔

قول ثالث بھی ساحر کی عظمت کے گراف کو بلند کرتا ہے کیونکہ ساحر کی شاعری 'عرفان حقیقت' میں بھی معاون ہے۔ ساحر نے جس طرح حقیقتوں کا عرفان حاصل کیا ہے، ویسا بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ ساحر نے حقائق کو متقارب اور متعارض دونوں صورتوں میں محسوس کیا ہے کہ یہ کائنات بنیادی طور پر متضادات، متعادیات اور متبائنات کا مجموعہ ہے۔ حقیقتیں بھی متضاد شکلوں میں منکشف ہوتی ہیں۔ ساحر نے حیات و کائنات کی حقیقتوں کی جستجو کی ہے اور پھر متضاد حقیقتوں کے امتزاج سے ایک تصور کو تشکیل کیا ہے۔ ظلمت میں نور، سادگی میں عیاری، جنگ میں امن، محبت میں نفرت، اور اس طرح کے تنوع و تضاد سے شعری تعبیرات تلاش کی ہیں۔

عرفان حقیقت کا عکس ساحر کی بہت سی نظموں میں ہے اور یہ سچ ہے کہ ساحر کی نگاہ میں حقیقت زیادہ واضح انداز میں روشن ہوئی ہے۔ بغیر کسی ابہام و اسہال کے:

علم سولی پہ چڑھا، تب کہیں تخمینہ بنا
زہر صدیوں نے پیا، تب کہیں نوشینہ بنا
سینکڑوں پاؤں کٹے، تب کہیں اک زینہ بنا

●

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے

یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں

•

بنام امن ہیں جنگ وجدل کے منصوبے
بہ شور عدل، تفاوت کے کارخانے ہیں

ساحر نے فلسفہ کی پر پیچ راہوں میں الجھے بغیر حقیقت کا عرفان حاصل کیا اور اسے اپنے شعری احساس و آہنگ میں شامل کر کے ان انسانوں کو حیات و کائنات کے اسرار سے آشنا کیا جن کے لیے 'عرفان حقیقت' کی منزل شاید ہی کبھی روشن ہو پاتی۔ ساحر نے حیات و کائنات کی کلیت میں حقیقت کو تلاش کر لیا اور حقیقت بس اتنی سی ہے کہ:

راستہ منزل ہستی کا مہیب آج بھی ہے

ساحر نے نہ صرف منزل ہستی کا راستہ دریافت کیا بلکہ انسانوں کے داخلی مسائل کا حل بھی ڈھونڈ نکالا کہ:

''زندگی کے خارجی مسائل کا حل شاعری نہیں لیکن وہ داخلی مسائل کا حل ضرور ہے'' فراق گورکھپوری

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں انسانی وجود کو داخلی بحران کی تمام تر شکلوں سے آگاہ کرنے اور ان سے نجات دلانے کی کوشش کارفرما ہے۔ اے شریف انسانو! خون پھر خون ہے، مگر ظلم کے خلاف ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں ساحر نے انسانیت سے ہم آہنگ ادب کی تشکیل کی ہے اور انفرادیت پر اجتماعیت کو ترجیح دی ہے اور یہی 'اجتماعیت' کا انفرادی تصور ان کی تخلیقی عظمت کا ایک اور روشن حوالہ بن جاتا ہے۔

چوتھا قول بھی ساحر کو تخلیقی انبوہ میں ایک نوع کا امتیاز عطا کرتا ہے کہ ساحر کی شاعری میں بھی آفاق سے زیادہ انفس کا عنصر غالب ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اس انسانی روح کی شناخت کی ہے جو حد درجہ مضطرب اور ملتہب ہے۔ انسانی روح کی دریافت کا عمل بہت مشکل ہوتا ہے مگر ساحر نے اس روح تک رسائی حاصل کی اور اس کے اضطرابات اور ہیجانات سے انسان کو روشناس کرایا۔ 'چکلے' ایسی ہی ایک نظم ہے۔ جس میں انسانی روح کی کراہ صاف سنائی دیتی ہے۔ ساحر نے ایک 'مجرد جسم' کو روح کی آنکھ سے دیکھا ہے اور اپنے روحانی کرب کا اظہار استفہامیہ انداز میں کر کے انسانی ذہن، ضمیر کو بھی جھنجھوڑا ہے۔

''کھانسی کی ٹھن ٹھن'' بیمار انسانی روح کی علامت ہے۔ اخلاقی روحانی قدروں کا زوال ہوتا ہے تو

صرف اور صرف انسانی وجود میں کھانسی کی ٹھن ٹھن رہ جاتی ہے اور ساحر کو پورے انسانی معاشرے میں ٹھن ٹھن پہ ٹھن ٹھن کی آواز سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ ساحر نے اس نظم میں اس روح کی تشخیص کی ہے جسے بازار نے جسم محض میں تبدیل کر دیا ہے۔

نظم کے ایک ایک بند میں روح کے کرب کی لہر نمایاں ہے۔ جب کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ 'چکلے' جیسے موضوع پر ساحر کی یہ کوئی بالکل نئی نظم ہو۔ یہ موضوع ادب کے لیے ماء مستعمل ہے مگر ساحر نے اس 'مستعمل' میں بھی احساس و اظہار کے امتزاج سے ایک نئی معنویت پیدا کر دی ہے۔ کیفی اعظمی کا یہ خیال بھی اس نظم کی انفرادیت کا اعتراف ہی ہے۔

"ساحر نے ثنا خوان تقدیس مشرق کو جس شدت سے، جس نفرت اور خلوص سے جھنجھوڑا ہے اس کی مثال مجھے دوسرے فن پاروں میں نہیں ملتی۔ چکلے میں ساحر کی غیریت، اس کی روح، اس کے احساس کی تلملاہٹ، بلندی کے انتہائی نقطے پر نظر آتی ہے۔ اس کے لہجے کی مخصوص افسردگی یہاں ایک بے پناہ بہاؤ میں تبدیل ہو جاتی ہے"۔

اس موضوع نے اگر ساحر کی روح کو مرتعش نہیں کیا ہوتا تو شاید یہ نظم وجود ہی میں نہ آتی، اگر آ بھی جاتی تو اتنی شدت اور تاثیر کے ساتھ نہ آتی۔ ساحر نے ہمیشہ وہی کچھ لکھا ہے جس نے ان کے ذہن، جذبہ کو ہی نہیں بلکہ پورے وجود میں تحریک پیدا کی۔ ساحر کی بیشتر نظموں میں ان کی روح کا ارتعاش نظر آتا ہے اور یہ ارتعاش، ان کا نقطہ امتیاز ہے:

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں
روح کیا ہوتی ہے اس سے انہیں مطلب ہی نہیں
وہ تو بس تن کے تقاضوں کا کہا مانتے ہیں

ساحر، انسانی روح کے رمز و ایماء سے آگاہ تھے۔ اسی لیے تخلیق کی اصل روح کی عظمت کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھنا انہیں گوارہ نہ تھا۔ 'روح' کو بازار میں بدلتے دیکھ کر ان کی برگشتگی بڑھ جاتی تھی۔ مرد معاشرے نے جب روح کے حقیقی جوہر کو مسلنے کی مسلسل کوششیں کیں تو ساحر کا غصہ آتش فشاں کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس غصہ میں 'روح' کی بازدید کا نیک عمل پوشیدہ ہے:

مردوں نے بنائیں جو رسمیں ان کو حق کا فرمان کہا
عورت کے زندہ جلنے کو قربانی اور بلیدان کہا

عصمت کے بدلے روٹی دی اور اس کو بھی احسان کہا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

عورت انسانی روح کی اساس ہے، اس سے انحراف انسانی کائنات کو شدید اخلاقی بحران اور انتشار میں مبتلا کر سکتا ہے۔

ساحر نے اپنی فکر میں النفس، کو اولیت دی ہے اسی لیے ان کے شعروں میں جسم سے زیادہ روح کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انسانی روح کے زخموں کے احساس نے ساحر کو سراپا التہاب بنا دیا تھا، ان کے پورے ذہنی وجود کو 'انگارے' میں تبدیل کر دیا تھا، اسی لیے انہوں نے انسانی روح کی سلامتی اور بقا کے لیے آتشیں نظمیں لکھیں، انقلابی شعر کہے اور ہر اس احساس پر کاری ضرب لگائی جس سے انسانوں کی زبونی اور زوال میں اضافہ ہو، فرقہ وارانہ فسادات اور جنگ میں سب سے زیادہ زخم انسانی روح جھیلتی ہے۔ ساحر نے روح کی گہرائی میں اتر کر ہی ایسے شعر کہے ہیں:

طرب زاروں پر کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری
دل زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری
زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری
یہ منظر کون سا منظر ہے، پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

ساحر کا ایک ایک شعر دل میں نشتر بن کر چبھتا ہے۔ شاعری میں کرب کی وہی ساری کیفیت اتر آئی ہے جس سے فسادات میں لوگ گزرتے رہتے ہیں، اس کیفیت کا انعکاس اس سے بہتر طور پر شاید ممکن نہ ہو۔ پروفیسر نظیر صدیقی کا بھی یہی خیال ہے:

''فسادات پر نظم و نثر دونوں میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان میں سے بہت کم چیزیں زندہ رہ سکیں یا رہیں گی۔ خود ساحر نے فسادات پر نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فسادات پر لکھی جانے والی شاعری میں ساحر کی یہ غزل:

طرب زاروں پہ کیا بیتی؟ صنم خانوں پہ کیا گزری

دل زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

کامیاب ترین غزلوں میں سے ہے اور اس کے چھ شعروں میں ہر شعر جو زبان زد خاص وعام ہے، بہت ممکن ہے کل بھی زندہ رہے"

ساحر کو انسانی روح کا حقیقی عرفان ہے اسی لیے ان کی شاعری روح کی آزادی کا نغمہ ہے۔ وہ ہر اس زنجیر کو توڑ دینا چاہتے تھے جس سے انسانی ذہن، ضمیر اور روح غلام بن جائے، ان کے اشعار میں اقتصادی، سیاسی، سماجی آزادی اور مساوات کے جذبے ملتے ہیں اور یہ ان کے مخصوص شعری موضوعات ہیں۔ یہ موضوعات بھی ان کی فن کارانہ عظمت کی علامتیں ہیں، مگر یہاں پھر ایک سوال ہے کہ کیا صرف ان موضوعات کی وجہ سے کوئی فنکار عظیم بن سکتا ہے۔ پروفیسر وارث علوی کا خیال ہے کہ:

"فنکار اس وجہ سے بڑا فنکار نہیں ہوتا کہ اس نے جنگ، امن، قومی آزادی اور انقلاب جیسے اہم اور شاندار موضوعات پر قلم اٹھایا۔ یہ موضوعات اس کی بڑائی کا تعین نہیں کرتے، فن کار کی بڑائی کا تعین اس کا فن ہی کر سکتا ہے"۔

وارث علوی کے خیال سے اختلاف کریں یا اتفاق مگر یہ حقیقت ہے کہ محض موضوع عظمت کا معیار نہیں ہے۔
"موضوع نظم کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کرتا بلکہ مواد اور فارم گویا پوری نظم سے نظم کی قدر کا تعین ہوتا ہے"۔
وارث علوی۔

اور یوں بھی موضوعات تو مشترک ہوتے ہیں۔ محض موضوعی اساس پر امتیاز یا انفراد کا تعین آسان عمل نہیں ہے۔ بقول سلیم احمد:

"موضوعات ذرا مجرد سی چیز ہیں اور کئی شاعروں میں مشترک بھی ہو سکتے ہیں۔ موضوعات میں جان تو ان تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے آتی ہے، جو موضوع کے ارد گرد صرف ہالہ ہی نہیں بناتے، اسے روشنی بھی دیتے ہیں"۔

●

سلیم احمد کے اس خیال سے ساحر کی فنکارانہ عظمت کی ایک اور راہ نکلتی ہے۔ اب ساحر کے یہاں استعارات، علامات اور تشبیہات میں تفرد کی تلاش لازمی ہے کہ اسی سے ساحر کی تخلیقی امتیازات کی سطحیں روشن ہوں گی۔ اس محاذ پر بھی ساحر سرخرو نکلے کہ ان کے یہاں استعارے، علامت اور تشبیہ کی ایک متنوع اور مختلف کائنات روشن ہے۔

عکس مے ہو کہ جلوۂ گل
رنگ رخسار تک نہیں پہنچا

●

تیرے لہو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی
مے کے ہزار وصف سہی مے میں کچھ نہیں

●

یہ تری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگ جاں کے قریب آج بھی ہے

●

گیسوؤں کی چھاؤں میں دل نواز چہرے ہیں
یا حسیں دھندلکوں میں پھول ہیں چناروں کے

●

عرصۂ ہستی میں اب تیشہ زلفوں کا دور ہے
رسم چنگیزی اٹھی، تو تیر دارائی گئی

●

موت پائی صلیب پر ہم نے
عمر بن باس میں بتائی گئی

●

کھلتا ہے ہر ایک غنچہ جوش نمو سے
یہ سچ ہے مگر لمس ہوا بھی ہے کوئی چیز

تشبیہات، علامات و استعارات میں جدت و ندرت نے بھی ساحر کی تخلیقی عظمت کو ایک اور نشان عطا کر دیا ہے۔ اس لیے یہ بات بلا لیت و لعل کہی جا سکتی ہے کہ ساحر ایک عظیم شاعر ہے جس کے فن کے جملہ مطالبات کو پورا کیا اور وہ سارے عناصر کی شاعری میں موجود ہیں، جو کسی فنکار کو عظیم قرار دینے کے لیے ناگزیر ہیں اور وہ سطحیں بھی جو سلیم احمد نے اچھے شعر کے لیے ضروری قرار دی ہیں:

''شاعری میں اچھے شعر کے لیے بیک وقت تین سطحیں ضروری ہیں۔ایک سطح پر وہ خدا سے انسان کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے، دوسری سطح پر کائنات سے انسان کے تعلق کو اور تیسری سطح انسان اور انسان کے تعلق کی ہے۔ اشعار کی بلندی اور پستی کا تعین اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں سطحوں میں کس کس تک پہنچتا ہے''۔

ساحر کے یہاں ان تینوں سطحوں میں بلندی کے سارے آثار نظر آتے ہیں۔ساحر نے خدا، انسان اور کائنات اور انسانوں کے انسان کے تعلق کے اظہار میں تخیل کی نئی بلندیاں طے کی ہیں۔

زمیں بھی تیری ہے، ہم بھی ترے یہ ملکیت کا سوال ہے
یہ قتل وخون کا رواج کیوں ہے یہ رسم جنگ وجدال کیا ہے

●

قدرت نے تو بخشی تھی ہمیں ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں بھارت کہیں ایران بنایا

●

انصاف کا ترازو جو ہاتھ میں اٹھائے
جرموں کو ٹھیک تولے
ایسا نہ ہو کل کا اتہاس کار بولے
مجرم سے بھی زیادہ
منصف نے ظلم ڈھایا
انصاف کا ترازو جو ہاتھ میں اٹھائے
یہ بات یاد رکھے
سب منصفوں کے اوپر
اک اور بھی ہے منصف

●

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

●

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں

فکر کی روشنی کو عام کریں
امن سے جن کو تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

●

ساحر، اردو شاعری کا پورا آدمی ہے کہ کائنات کے پہلے شاعر آدم وحوا کی طرح اس نے بھی 'باغ بہشت' سے نکل کر اذیتوں میں سے اپنی پناہ تلاش کی تھی اور عوامی بھیڑ میں اپنے کھوئے ہوئے جذبہ واحساس کو دریافت کیا تھا، وہ احساس جو ایک دردمند اور حساس دل میں ہوتا ہے۔ ساحر لوڈھوال کے جاگیردار چودھری فضل محمد ذیل دار (سرمایہ دار والد) کے سایہ عاطفت میں رہتے تو شاید زندگی کے بہت سارے تجربات و حوادث سے محروم رہ جاتے۔ ذہن میں نہ تلخیاں آتیں اور نہ تخلیقی احساس کو اظہار کی راہ ملتی۔ ساحر عیش وعشرت میں ہوتے تو پھر نہ وہ حرف احتجاج بلند کر پاتے اور نہ ہی انسانی دکھ درد کا احساس ہوتا۔ نہ استحصالی معاشرہ کے خلاف بغاوت کرتے۔ ساحر کو تجربوں کی جو بے پناہ دولت ملی، وہ اذیت اور دربدری کا ثمرہ تھی۔ ان کی تخلیق کے حسن میں 'دکھ' کی خوبصورتی یا المیہ کی جمالیات بھی شامل ہے۔ دکھ ہی نے ان کا رشتہ عام لوگوں سے جوڑا، مزدوروں، محنت کشوں، طوائفوں کا دکھ بھی اپنے ذاتی کچھ اور مشاہدہ کی ہی توسیع تھی۔ اپنی ذات میں جب پوری کائنات شامل ہو جاتی ہے تو احساس کا دائرہ خود بخود پھیلنے لگتا ہے اور پھر سارے جہاں کا درد، اپنا درد محسوس ہونے لگتا ہے:

مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا

●

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں کو مفلسوں کو، بے کسوں کو، بے سہاروں کو
حکومت کے تشدد کو امارت کے تکبر کو

تو دل تاب نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب، آور ترانے گا نہیں سکتا

یہ سرکشی، تلخی، برگشتگی، دراصل ایک نفسیاتی ردعمل ہے اس سماج کے خلاف جہاں ایک باپ جبر واقتدار اور ارتکاز قوت کی ایک علامت بن کر ابھرتا ہے اور جو اپنی گیارہویں بیوی، سردار بیگم کو ایک پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے زوجیت کے حقوق سے محروم رکھتا ہے۔ اور اسی لیے 'باپ' جس طبقہ اور سماج کا نمائندہ ہے، اس طبقہ سے ساحر کی نفرت بڑھنے لگتی ہے اور اس طبقہ سے محبت، ہو جاتی ہے جو 'باپ' کے ظلم کا شکار ہوا ہے۔ احمد راہی نے صحیح لکھا ہے کہ:

''ساحر کی زندگی میں ایک محبت ہے، ایک نفرت محبت اس نے صرف اپنی ماں سے کی ہے اور نفرت صرف اپنے باپ سے'' محبت اور نفرت کی یہ دونوں علامتیں ساحر کی شاعری میں مختلف شکلوں میں رونما ہوئی ہیں۔ ساحر کی تخلیقی سائیکی اور ان کے پورے تخلیقی اور فکری نظام کو صرف ان دونوں علامتوں کے لوازمات اور متعلقات کے آئینے میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

ساحر کی شاعری ان ہی دونوں علامتوں کی توسیع وتمدید اور تشریح وتعبیر ہے۔ یہی دونوں علامتیں ساحر کی ذات سے نکل کر کائناتی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور ذات وکائنات کی یہی وحدت ساحر کی تخلیقی عظمت کا نقطۂ امتیاز بن جاتی ہے اور پورے آدمی کی شاعری کا نشان اختصاص بقول سلیم احمد یہ ہے کہ:

جس کا احساس، جذبہ اور عقل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے بلکہ ایک وحدت بناتے ہیں اور یہ وحدت اپنے اندر بھی ہم آہنگ ہوتی ہے اور خارجی حقیقت سے بھی ہم آہنگی رکھتی ہے جو خود ایک ہم آہنگ وحدت ہے''۔ احساس، جذبہ اور عقل کی وحدت ساحر کی کئی نظموں میں نمایاں ہے۔ تاج محل، نور جہاں کے مزار پر اور پرچھائیاں ایسی ہی نظمیں ہیں۔

ساحر کے یہاں یہی وحدت مجنوں گورکھپوری جیسے ناقد کو بھی نظر آتی ہے۔

''وہ خارجی عوارض اور داخلی تاثرات کو سلیقے کے ساتھ سمو کر ایک آہنگ بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ان کے ہر مصرعے میں مادی محرکات ومؤثرات کے احساس کے ساتھ وہ کیفیت بڑے سلیقے کے ساتھ گھلی ملی ہوتی ہے، جو بے ساختہ داخلی ابھار کے ساتھ پیدا ہو سکتی ہے''۔ اگر یہی وحدت تخلیقی عظمت کی علامت ہے تو ساحر لاریب عظیم شاعر ہیں، مگر ہماری تنقید کا المیہ یہ ہے کہ یہاں معیار کی منطق تبدیل ہوتی رہتی ہے، اس لیے اب یہی کہنے میں عافیت ہے کہ ساحر تنقیدی تعینات سے ماوراء ہیں۔ استقرائی، تفکری یا تشریحی، یہ تمام تنقیدی طریق کار ساحر کی تعین قدر میں معاون نہیں ہو سکتے۔ ساحر کی تخلیق (فلمی، ادبی) ان کی عظمت کی شہادت کے لیے کافی

ہے۔ ان کے تخلیقی تجربے کا تنوع اور اظہار کے نئے وسائل، تکنیک کے نئے ذرائع ہی وافر ثبوت ہیں کہ ساحر لدھیانوی (۸ مارچ ۱۹۲۱ - ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰) ، اپنے عہد کے مختلف منفرد اور عظیم شاعر ہیں جو اپنی ترسیلی قوت کی بنیاد پر براہ راست قاری سے ایک ذہنی اور جذباتی رشتہ قائم کرنے میں کامیاب ہیں، جس کی ایک نمایاں مثال نظم 'پرچھائیاں' ہے جو ایسی حکائیہ تکنیک میں ہے، کسی بھی اردو شاعر نے نظموں میں یہ استعمال نہیں کی ہے۔ علی سردار جعفری جیسے ممتاز نظم نگار شاعر اور ناقد نے بھی اس نظم کی بیانیہ سادگی میں مخفی قوت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ لکھا کہ:

''ہماری بعض بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ کی سطح سے بہت اونچی ہیں، لیکن ساحر کی نظم 'پرچھائیاں' اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچ سکے گی۔ اس کے نوے فیصدی سے بھی کچھ زیادہ الفاظ ہماری روزمرہ گفتگو کے الفاظ ہیں کلاسکیت اور روایت کے نام پر ساحر نے اپنی نظم کو اجنبی اور غیر مانوس الفاظ سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ ساحر کی کامیابی اس میں ہے کہ اس نے اپنے سادہ اور آسان الفاظ سے اس عہد کی بعض اہم حقیقتوں کو ایسے مصرعوں میں ڈھال دیا ہے جو زبان پر چڑھ بھی جاتے ہیں اور دل پر اثر بھی کرتے ہیں''۔ ساحر کا یہ بھی کمال ہے کہ انہوں نے نثری اسلوب کو شاعرانہ شدت کے ساتھ پیش کیا ہے اور کہتے ہیں کہ ''اچھی شاعری وہ ہے جو نثر سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو لیکن نثری نہ ہو''۔

ساحر نے نثر اور شاعری کے فاصلوں کو بھی کم کیا ہے۔ ان کی نظموں میں جو فکری و لسانی ارتباط و ارتکاز ہے، وہی ان کی نظمیہ شاعری کا حسن ہے۔ ساحر ایک مربوط و منضبط فکر کے حامل ہیں اور یہ صفت ان کی تخلیق میں ہے۔ کوئی تو وجہ ہوگی کہ ساحر کے اکثر مصرعے کسی سماجی، سیاسی مضمون کا موثر اور متحرک عنوان بن جاتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ درجنوں صفحات پر محیط کسی سماجی یا سیاسی مضمون کے مقابلے میں ساحر کی چند نظمیہ سطریں زیادہ اثر انگیز اور معنی خیز ہوتی ہیں۔

ساحر بڑا شاعر ہے اس لیے بھی کہ ان کی شاعری میں اقتدار، آئین، سماج اور سیاست سے سوال ہے۔ اور یہ وہ سوال ہیں جو کائناتی اور انسانی وجود سے ہمیشہ ہی جڑیں گے۔ جب تک کائنات ہے، ان سوالوں کے سلسلے جاری رہیں گے۔

دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوش حالی عوام کے اسباب کیا ہوئے؟

میرا خیال ہے کہ ان سوالوں کی دوامیت میں بھی ساحر کی فنی عظمت مضمر ہے۔

تنقید کا کوئی بھی زاویہ ہو، ہر میزان پر ساحر کی شاعری کھری اترے گی، ان کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہے گا۔ ساحر کا

مقام شاعری کے عیشۂ راضیہ میں متعین ہے۔ اس کے لیے کسی تنقیدی فرمان کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری تنقید کے لیے تخلیق کاروں کے مدارج ومراتب کا تعین جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور یوں بھی خود ساحر کو ایسی تنقید پر اعتبار ہی کہاں تھا۔

فکر وسخن کے تاجر مرے شعروں کو اشعار نہ مانیں　　مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فن کار نہ مانیں

یہ شعر شاید اسی بے اعتباری اور عدم اعتماد کا مظہر ہے۔ اور ساحر کو تنقید کی طوطا چشمی کا شدت سے احساس تھا کہ انہوں نے خود بھی اپنے زمانے کی آنکھیں اور چہرے دیکھے تھے۔ اور ان آنکھوں اور چہروں کے بدلتے رنگ اور تاثرات بھی، اسی لیے انہیں پہلے ہی سے یہ ادراک تھا کہ

مصروف زمانہ میرے لیے کیوں وقت اپنا برباد کرے　　کل کوئی مجھ کو یاد کرے، کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے

یقیناً زمانہ مصروف بھی ہے اور لوگوں کو اپنے وقت کی قدر و قیمت کا پہلے سے بھی کہیں زیادہ احساس ہے، پھر بھی عجب بات ہے کہ ساحر کی قرأت کا تسلسل قائم ہے جب کہ بہت سے شعراء قرأت کے باب میں ''وقفہ موقوف'' میں ہیں، مگر محض قرأت ہی تو مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ ساحر کے مدرکات ومکاشفات کی تعبیر وتفہیم کے لیے نئی قرأت کی ضرورت ہے تا کہ ساحر کی تخلیقی کاملیت، حسیت اور معنویت کے نئے باب روشن ہوں اور ساحر کا وہ، مافیہ، اپنی کلیت میں سامنے آئے جو ان کے نظمیہ اسپیس میں پنہاں ہے۔ اور اس ساحر کی تلاش کی جائے جو اپنی تخلیق کی وجہ سے مختلف طبقات، درجات اور ادبیات میں اپنی الگ الگ مساواتوں Equations کے ساتھ زندہ ہے۔ مختلف الخیال طبقات کی یہی مساواتیں ساحر کو ہر عہد میں نئی زندگی اور نئی معنویت عطا کرتی رہیں گی۔ اور یہ تنقید کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے کہ تنقید تو کسی بھی تخلیق کے سر پر 'تاج زریں' رکھ دیتی ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ایک مدت کے بعد تاج کے ساتھ ساتھ سر بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ ساحر کو ایسے تاج سے ویسے بھی وحشت ہے:

اب دست اختیار جم و کے میں کچھ نہیں　　کشکول فن اٹھا کے سوئے خسرواں نہ جا

یہاں پر ''خسرواں'' سے ساحر کی مراد میرے خیال میں شاید ''نقاد'' ہی ہے مگر میرا خیال بھی تو 'نقد ناقدین' کی طرح غلط ہو سکتا ہے۔

جس شہر کو دنیا نے مرے نام سے جانا
اس شہر میں آپ اپنا پتہ پوچھ رہا ہوں
خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

نذیر فتح پوری، پونہ

ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی

ساحر لدھیانوی کا نام فلمی گیتوں کی وجہ سے زیادہ روشن اور ہر دلعزیز ہوا۔ ان کے فلمی گیت دوسرے فلمی گیت کاروں کے طرز سے ہٹ کر ہوا کرتے تھے۔ فلمی سچویشن کو مدنظر رکھ کر لکھنے کے باوجود ساحر نے اپنے گیتوں کا معیار کبھی گرنے نہیں دیا۔ ساحر کے گیتوں پر ان کی نظموں کا اسلوب غالب رہا، یا پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ساحر کی ادبی نظمیں ہی دو چار مشکل مصرعوں کی تبدیلی کے ساتھ جوں کی توں فلموں کے لئے صدا بند کر لی گئیں۔ نظمیں دراصل ساحر کی ادبی اور تخلیقی کائنات کا شناخت نامہ ہیں، ساحر کی شاعری کی ابتداء نظموں ہی سے ہوئی تھی، فلموں میں آنے سے قبل ساحر کو جو کچھ عوامی شہرت ملی تھی اس میں ان کی نظموں کا عمل دخل تھا۔ ان کی شاعری کا کثیر حصہ ان کی نظموں پر ہی مشتمل ہے، ساحر کی نظموں کا اپنا جداگانہ رنگ ہے، ترقی پسند تحریک سے انسلاک کے باوجود ساحر کی نظموں میں عام قسم کی نعرہ بازی نہیں ہے۔ ساحر کی نظموں میں عشق کا پہلو بہت گہرا ہے۔ وہ جب بھی بنام عشق کوئی نظم سپردِ قلم کرتے تو اپنا دل نکال کر رکھ دیتے۔

حقیقت افروز نظمیں اور دلگداز گیت سپردِ قلم کرنے کے ساتھ ہی ساحر نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اگرچہ ان کی غزلوں کی تعداد نظموں اور گیتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے لیکن اس قلت میں بھی کثرت نمایاں نظر آتی ہے۔ ساحر نے بعض فلموں کے لیے بھی غزلیں لکھی ہیں ہم یہاں ان کی غیر فلمی غزلوں پر ہی گفتگو کریں گے۔

بقول ڈاکٹر ظہیر انور انصاری،

"اُس دور کے دوسرے شعراء کی طرح ساحر کے متعلق بھی عام خیال یہ رواج پا گیا ہے کہ وہ صرف نظم کے شاعر ہیں، لہٰذا اس عدم توجہی کا اثر یہ ہوا کہ ان کی غزلیں ان کی نظموں کے سامنے معدوم ہوتی چلی گئیں، البتہ کچھ ناقدین نے ساحر کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ضمناً ان کی غزلوں پر ناقدانہ نظر ضرور ڈالی ہے۔ تاہم مجموعی طور سے ان کی غزلوں پر کم حقہ توجہ نہیں دی گئی
(حوالہ۔ ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے ص ۱۲۳)

یہ حقیقت ہے کہ ساحر نے غزلیں بہت کم کہی ہیں یہی وجہ ہیکہ ان کی غزلوں پر بہت کم لکھا گیا

ہے۔ یہ سچ بھی ہے کہ ساحرؔ نے اپنی غزلیہ شاعری کو کوئی نیا، انوکھا اور چونکا دینے والا انداز واسلوب بھی نہیں دیا، جس زمانے میں ساحرؔ نے غزلیں کہیں وہ ترقی پسندی کا زمانہ تھا جہاں غزل متروک اور معتوب سمجھی جاتی تھی، لیکن مجروحؔ سلطانپوری کی طرح ساحرؔ نے بھی اس زمانے میں غزل کو یکسر نظر انداز نہیں کیا وہ گاہے بہ گاہے غزلیں کہتے رہے، جب ترقی پسندی کا اثر زائل ہوا تب ساحرؔ نے کھلی فضا میں جو غزلیں کہیں ان کے جداگانہ تیور مندرجہ ذیل غزل سے واضح ہو جاتے ہیں۔

میں زندہ ہوں یہ مشتہر کیجئے — مرے قاتلوں کو خبر کیجئے

اسی غزل کا مندرجۂ ذیل شعر ملاحظہ کریں اپنے اندر معانی ومطالب کی کتنی تہیں رکھتا ہے۔

ستم کے بہت سے ہیں ردِ عمل — ضروری نہیں چشم تر کیجئے

پوری غزل وحدتِ تاثر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہشِ بال و پر کیجئے

زمیں چپ ہے اور آسماں دور ہے
بسر ہو سکے تو بسر کیجئے

مجروحؔ نے شکایتاً اس بات کا اظہار کیا تھا۔

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروحؔ
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی چمن میں رہے

لیکن ساحرؔ کی زندگی میں اس قسم کی شکایت کا موقع کبھی نہیں آیا، ان کے گیتوں کا عوامی انداز، ان کی نظموں کی سہل نگاری اور ان کی غزلوں کی سادہ مگر پُر اثر زبان نے انہیں ہر خاص وعام کے ذہن تک پہنچا دیا، انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کو نہ صرف یہ کہ صحیح تناظر میں سمجھا گیا بلکہ خاطر خواہ داد سے بھی نوازا گیا اور ان کے اشعار کو عوامی مقبولیت بھی ملی، مثلاً یہ اشعار۔

ستم کے دور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا وہی لوٹا رہا ہوں میں

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے

زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے

محبت ترک کر کے صبر وضبط کا زہر پینے والے ساحرؔ نے اپنی زندگی کے اچھے برے حالات اپنی نظموں کے ساتھ اپنی غزلوں میں بھی پیش کیے ہیں۔ ساحر کی زندگی میں ابتداء سے لے کر آخری دم تک مختلف شکلوں میں رنج والم کا دور دورہ رہا، کبھی یہ رنج ان کو محبت کی ناکامی کے سبب اٹھانا پڑا اور کبھی کسی کی بے وفائی نے ان کا دل توڑا۔ ان کو پہلا دکھ تو ان کے اپنے والد کے روپ میں دیکھنے کو ملا اس دکھ نے ساحرؔ کے معصوم ذہن میں بغاوت کے شعلے بھر دیئے ان شعلوں کو وہ زندگی بھر بجھا نہ سکے۔

دنیا جانتی ہے کہ ساحر کو اپنی والدہ سے بڑی محبت تھی اسی والدہ پر جب جاگیردارانہ نخوت اور نحوست کے سبب ستم توڑے گئے تو ان منظروں کو ساحر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، غالباً یہ شعر ایسے ہی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی

ساحر مذہبی خیالات کے کتنے حامی تھے بظاہر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا لیکن ان کے بھجنوں اور قوالیوں کے علاوہ غزل کے بعض دعائیہ اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ منکرِ خدا نہیں تھے۔ پیر اور اوتاروں پر ان کا یقین تھا، انہوں نے کبھی اپنی زبان سے اپنی مذہب بیزاری کا اظہار بھی نہیں کیا، ان کے مندرجہ ذیل شعر سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ پیمبر اور صلیب دونوں کے معترف تھے۔

اے روحِ عصر جاگ! کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے

ساحر کا خیال تھا کہ خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی "روحِ عصر" کو جگانے کا کام صرف اور صرف پیمبر ہی کر سکتے ہیں، لیکن ان کا یہ خیال تا دیر قائم نہیں رہتا دوسرے ہی پل وہ عقائد پر کاری ضرب لگاتے ہوئے کہتے ہیں۔

بجھ رہے ہیں ایک اک کر کے عقیدت کے دیئے
اس اندھیرے سے بھی لیکن سامنا کرنا تو ہے

ساحرؔ ہمیشہ غیر مقلد رہے۔ نہ زندگی میں انہوں نے کبھی کسی کی تقلید کی نہ شاعری میں، فلمی شاعری میں بھی انہوں نے اپنا راستہ خود منتخب کیا اور اپنی شرطوں پر گیت لکھے، انہوں نے زندگی کو کھیپر ائی نظروں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی، ان کا یقین تھا کہ۔

لے دیکھئے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو پرائی نظر سے ہم

ساحرؔ کی زندگی میں چاہے اعتدال نہ ہو لیکن ان کی شاعری میں اعتدال پایا جاتا ہے انہوں نے اپنی فکری کاوشوں کے تعلق سے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا، شاعرانہ تعلی بھی ان کے اشعار میں دکھائی نہیں دیتی، بلکہ انہوں نے اپنی کم مائیگی اور محدود دائرہ کار کا خود اعتراف کیا ہے۔

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

ساحرؔ کی نظروں میں انسان اور انسانیت کی بڑی قدر تھی، وہ انسان پرست چاہے نہ ہوں لیکن انسان دوست ضرور تھے۔ ان کو انسان کی تذلیل قطعی گوارا نہ تھی، جب بھی کبھی انہیں انسان کی تذلیل ہوتی دکھائی دیتی، ان کے ہاتھوں میں احتجاج کا پرچم لہراتا نظر آتا۔

معمورۂ احساس میں ہے حشر بپا سا
انسان کی تذلیل گوارہ نہیں ہوتی

ساحرؔ کی داستانِ محبت خاصی عبرت انگیز ہے، بظاہر ان کے نام کے ساتھ کئی نام جڑے لیکن کوئی نام ان کے نام کا لاحقہ نہ بن سکا، وہ تنہا تھے اور تنہا ہی رہے۔ ان کی زندگی ایسے ملاح کی سی رہی جو زندگی بھر پانی پر کشتی کھیتا رہا لیکن اسے اس کا ساحل نہیں ملا۔ پانی کے درمیان رہ کر بھی وہ اپنی تشنگی کا علاج نہ کر سکے۔ اسی لیے وہ مایوس ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

یا پھر اس نوعیت کا اعتراف۔

تمہارے عہد کو عہدِ وفا میں کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

ساحرؔ محبت کے معاملے میں ہمیشہ وسوسوں کا شکار رہے، محبت کی انگلی تھام کر وہ زندگی کی راہوں میں بہت دیر تک اور دور تک چلنے کی ہمت کبھی نہیں جٹا پائے، ممکن ہے خانگی ذمہ داریوں سے انہیں کسی قسم کا خوف رہا ہو، یا زندگی کے اس پہلو پر انہوں نے کبھی سنجیدگی سے نظر نہ ڈالی ہو، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ وہ اپنی محبت کی ناکامی کا الزام دوسروں کے سر نہ ڈالتے ہوئے اپنے ہی سر لینے میں کبھی کسی قسم کے تردد کا شکار نہیں ہوئے۔

مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

اس والہانہ اعتراف کے لیے بھی جگر چاہیے اور یہ جگر ساحر کے پاس تھا۔ ساحر محض اس اعتراف پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اس سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ہم کو ستی خوشیوں کا تم لو بھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے

ساحر کو زندگی اور متعلقات زندگی پر جس قدر بھروسہ تھا موت کی حقیقت بھی ان کی نظروں میں اتنی ہی معتبر تھی ۔

جھوٹ کیوں بولیں فروغ مصلحت کے نام پر
زندگی پیاری سہی لیکن ہمیں مرنا بھی ہے

گویا ان کو موت کے بعد ہونے والے اعمال کے احتساب کا احساس ہی نہیں بلکہ خوف بھی تھا، اس کا مطلب ہے وہ آخرت اور روزِ محشر پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ بہر حال یہاں ان کے عقیدے اور ایمان پر کوئی بحث مقصود نہیں، بر سرِ تذکرہ یہ چند باتیں زیرِ قلم آ گئیں۔

یہاں ساحر کی غزلوں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ بھی پیش نہیں کیا جا رہا ہے یہ مضمون ساحر کی غزل گوئی پر ایک گفتگو کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔ آیئے ساحر کی غزلوں کے کچھ انوکھے اور اچھوتے تخیل کے پیرائے میں بُنے ہوئے اشعار ملاحظہ کریں ۔

تم نے صرف چاہا ہے، ہم نے چھو کے دیکھے ہیں
پیرہن گھٹاؤں کے، جسم برق پاروں کے

احساس کی بالیدگی، تصور کی تازگی اور سوچ کی رومانیت ساحر کے مندرجۂ ذیل اشعار میں پائی جاتی ہیں ۔

ساحر کی نظموں اور گیتوں کا غالب حصہ حوصلوں سے عبارت ہے، غزلوں کے بعض اشعار میں بھی وہ حوصلوں کا دامن پکڑے نظر آتے ہیں، وہ غموں کے دور میں مسکرا کر جینے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں لیکن کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن سے ان کی مایوسی صاف جھلکتی ہے ۔

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

یا پھر یہ شعر ۔

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو غم کے ساتھ آتی ہے

لفظ ''آئینہ'' اردو شاعری کا ایک روشن استعارہ ہے، غالبؔ نے کہا تھا۔

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اردو کے بے شمار شعراء نے آئینے کو موضوع بنا کر لاتعداد شعر کہے ہیں، ہر شاعر کے پاس آئینہ دیکھنے کی اپنی نظر ہوتی ہے، جھوٹ اور سچ کے سارے نقوش یہی آئینہ دکھاتا ہے، آئینہ ہر حال میں سچ بولتا ہے، جھوٹ اور مصنوعی پن کو آئینہ قبول نہیں کرتا، ساحرؔ نے اس موضوع پر کیا بے پناہ شعر کہا ہے۔

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے
جن کی صورت جنہیں دکھائی گئی

ساحر کی غزل زندگی کے حقیقی آئینے سے عبارت ہے جس میں سماج کا ہر فرد اپنا چہرہ بخوبی دیکھ سکتا ہے۔

ساحرؔ نے غزل کی روایتی ہیئت سے ان معنوں میں انحراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں مقطع نگاری سے پرہیز کیا، ان کی کسی بھی غزل میں مقطع موجود نہیں، اس لیے ساحر کی غزلوں میں تخلص کا استعمال تلاش کرنے والوں کو مایوسی ہوگی، ممکن ہے ساحر کو اس بات کا یقین ہو کہ ان کی غزل مقطع کے بنا ہی اپنی شناخت قائم کرسکتی ہے۔

کوثر مظہری، نئی دہلی

ساحرلدھیانوی کا فن

ہر عہد میں معاشرہ کثافتوں اور آلودگیوں سے معمور رہا ہے۔ نوعیت بھلے ہی بدلتی رہی ہو مگر سماج میں طبقاتی کشمکش اور تفریق کی فضا ہر زمانے میں قائم رہی ہے۔ ترقی پسندوں نے اسی کشمکش اور آلودگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ساحرلدھیانوی بھی اسی ترقی پسند تحریک کا ایک اہم نام ہے۔

ساحر کی بصیرت کھوکھلی تہذیب وثقافت کو penetrate کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اپنے سچے تجربات کو پرخلوص جذبے کے ساتھ انھوں نے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

دنیا نے تجربات اور حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر سماج کی سچائی بیان کرنے میں لرزہ براندام نہیں ہوتے، ساتھ ہی دوسرے کئی بلند آہنگ ترقی پسندوں کی طرح نعرہ بازی بھی نہیں کرتے، مدھم لہجے میں وہ اپنی باتیں پیش کردینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے سماج کی کثافت کھلی انسانی تہذیب کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ساحر کا کمال یہ ہے کہ مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نوع کی شاعری کی ہے جو احساس اور جذبہ کو چھوتی ہے اور انگیخت کرتی ہے۔ انھوں نے پاکیزہ محبت، نشاط وکرب اور حزن وملال کی کیفیت کو معصومانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں فکر اور رومان کا سفر متوازی میلان کے ساتھ طے ہوتا ہے۔ کچھ یہی طرز شاعری اور طرز فکر فیض احمد فیض کا رہا ہے۔ ساحر نے اپنی فکر کی آنچ تیز رکھی ہے مگر بوقت اظہار ہوش مندی اور فنی بصیرت سے کام لے کر آہستہ روی کو ہی اہم اور ناگزیر تصور کیا ہے۔ انقلاب اور استحصال کا کھل کر اظہار کیا ہے مگر ان کے اندر فنکارانہ شعور پر نری جذباتیت غالب نہیں آسکی ہے۔ نظم ''بنگال'' سے دو بند ملاحظہ کیجیے جس میں عوام اور مزدوروں کے استحصال کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

جہان کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظام نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا

کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے

اسی طرح آزادی کی امید لئے "شعاعِ فردا" ساحر نے ایک اچھی نظم کہی اس میں وہی احساس ہے جو فیض کی اس نظم ہے۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

مذکورہ ساحر کی نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نو افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک وسم افشاں سہی، لیکن جی

(شعاعِ فردا۔۔۔۔بنجارے کے خواب، ص ۱۶۲)

ساحر کو امید ہے کہ صعوبتوں کے بعد "عروسِ فردا" کرنیں بکھیرتی نمودار ہوگی۔ یہاں یاس کی جگہ امید اور ایک طرح سے تیرہ و تار فضا میں ضیا پاشی کا اشاریہ بھی ہے۔ وہ محض اشتراکی عناصر کو محدود کینوس پر نہیں بکھیرتے بلکہ ان کی فکر کو انسانی تہذیب کا انتشار اور کھوکھلا پن ہمیشہ مہمیز کرتا رہتا ہے۔ ان کی نظر میں نسلِ آدم کی بقا اور انسانی تہذیب کے تحفظ کے لئے امنِ عالم ناگزیر ہے۔ جنگ کہیں ہو اور کسی نسل، کسی ذات کا خون بہے، آخر تو نسلِ آدم ہی کا خون ضائع ہوتا ہے۔ یہ جو تنازع للبقا یعنی struggle for existence کا سلسلہ ہے وہ انسانی تہذیب اقدار کے لئے ناموزوں ہے۔ ساحر نے ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں ایک نظم "اے شریف انسانو" کہی تھی جسے تاشقند معاہدہ کی سالگرہ پر نشر بھی کیا گیا تھا۔ اس نظم میں کھوکھلی تہذیب اور انسانیت کے کھوکھلے دعوؤں کی قلعی کھولی گئی ہے۔ یہ نظم ترقی پسند تحریک کا پروپیگنڈہ نہیں بلکہ جذبہ انسانیت سے سرشار ایک دل کا نوحہ ہے۔

ساحر نے اخوت اور آفاقی ہمدردی کی شمع روشن کرنے کی کوشش بھی کی اور تلقین بھی۔ انھوں نے ترقی پسندوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنے ہی احساس کو اپنی فکر کا رہنما سمجھا نہ کہ ترقی پسند تحریک کے فارمولے اور منشور کو۔ جاں نثار اختر نے بڑی سچی بات لکھی ہے:

"اس نے خود کو دھوکا دیا نہ اپنے فن کو نہ ترقی پسند تحریک کو نہ عوام کو....اس نے وہ کیا جو بہ حیثیت ایک بیدار شاعر اس کا فرض تھا"

ایک سیدھے سچے آدمی، ایک ایماندار اور سادہ لوح فنکار کی نگاہ ہمیشہ ہی انسانیت کی معراج پر مرکوز رہتی ہے مصلحت پسندی اور ریاکاری اس سے دور ہی رہتی ہے۔ ساحر کی شاعری میں fraudism کا عنصر نہیں ملتا۔ بنگال کے قحط پر کہی گئی نظم "بنگال" ہو یا روس کے sputnik بھیجے جانے پر کہی گئی نظم "مرے عہد کے حسینو!" سچی محبت کے کرب آگیں احساس میں ڈوبی ہوئی نظم "تاج محل" ہو یا پھر ۱۹۴۶ء میں کہی گئی نظم "یہ کس کا لہو ہے" یا نظم "آج" ہو۔۔۔ ہر جگہ ان کا احساس دل پر کچو کے لگاتا ہے۔ یہ نظمیں ہماری مردہ تہذیب کی زندہ علامتیں ہیں۔ نظم "آج" کا پس منظر ۴۷ء کا انتشار ہے جس کی تخلیق ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ہوئی تھی۔ غم اور کرب کی فضا ہے۔ شاعر اپنے سماج کے ٹھیکے داروں سے دردر دامن پسارے امن اور تہذیب خستہ کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اس وحشت اور بربریت کے ماحول میں فنکار کا احساس مجروح ہو چکا ہے، گیتوں کے سُر ہچکیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ساحر کا احساس دیکھئے:

عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شور آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پر راستوں پر
اپنے نغمے کی جھولی پسارے
در بہ در پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو

یہ نظم ٹوٹتی پھوٹتی تہذیب اور انسانوں کی حیوانی جبلت کا آئینہ ہے۔ انسانی قدروں، ہمدردی اور ہمہ گیر محبت واخوت کو ساحر نے بخوبی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ساحر کا ذہن سعادت حسن منٹو کی طرح حساس ہے۔ ساحر کو بھی "چکلے" کی کثافت سے گھن نہیں آتی ہے۔ ساحر کی نظم "چکلے" کا مطالعہ کرتے وقت سماج کے بڑے بوڑھوں کے چہروں سے شرافت کے نقاب سرکنے لگتے ہیں۔ دس بند پر مشتمل یہ نظم کھوکھلی تہذیب اور مجروح اقدار کی عکاسی کرتی ہے۔ "چکلہ" وہ جگہ ہے جہاں بیٹا بھی آتا ہے اور باپ بھی، ایک ہی عورت بیوی بھی ہے اور ماں بھی وہی عورت محبوبہ بھی ہے اور بہن بھی گویا ایک ایسا ماحول ہے جہاں تہذیب آخری ہچکی لے رہی ہے اور سماج کا کریہہ چہرہ نظر آرہا ہے۔ "ثناخوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں؟"

"ثناخوان تقدیس مشرق" کی ترکیب گہری معنویت سے متصف ہے۔ جو لوگ مشرقی تہذیب و

ثقافت کی بات کرتے ہیں یا مشرقی اقدار، مشرقی رویوں اور مشرقی آداب واطوار پر سینہ پھلائے پھرتے ہیں، ساحر کی یہ نظم ایسے لوگوں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ گویا یہاں نام نہاد مشرقیت کی قلعی کھل گئی ہے۔ ثقافت جو ایک شعوری عمل ہے اور جس کے اثرات انسانی شعور پر اخلاق وعادات، رویوں اور اطوار کے ذریعہ مرتسم ہوتے ہیں۔ ساحر کی اس نظم میں وہ ثقافت ٹوٹتی بکھرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس نظم ''چکلے'' کے ضمن میں کیفی اعظمی کا خیال ہے:

''ساحر نے ثنا خوان تقدیس مشرق کو جس شدت، جس نفرت اور جس خلوص سے جھنجھوڑا ہے اس کی مثال مجھے کسی دوسرے فن پارے میں نہیں ملتی۔ ''چکلے'' میں ساحر کی غیرت، اس کی روح، اس کے احساس کی تلملاہٹ بلندی کے انتہائی نقطے پر نظر آتی۔''

ساحر کو کچھ نقادوں نے فلمی شاعر کہہ کر ٹال دینے کی کوشش کی جب کہ انھوں نے فلموں میں بھی ایک معیار قائم رکھا ہے۔ اور سماجی اور تہذیبی شعور کو بروئے کار لا کر ہی فلمی نغمے لکھے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''فلم ہمارے دور کا سب سے موثر اور کار آمد حربہ ہے۔ جسے اگر تعمیری اور تبلیغی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو عوامی شعور کی نشوونما اور سماجی ترقی کی رفتار بہت تیز کی جا سکتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ابھی تک فلم کے اس پہلو پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی کیوں کہ دیگر تہذیبی شعبوں کی طرح ہمارا یہ شعبہ بھی ابھی زیادہ تر ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو ذاتی منافع کو سماجی خدمت پر ترجیح دیتے ہیں۔
میری یہ ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو فلمی نغموں کو تخلیقی شاعری کے قریب لا سکوں اور اس صنف کے ذریعہ جدید سماجی اور سیاسی نظریے عوام تک پہنچا سکوں۔''

ساحر نے ظلم وجبر کے خلاف فلمی گیتوں میں بھی آواز بلند کی ہے۔ عزم وہمت کا پیغام ان کے گیتوں میں بھی ملتا ہے۔ سماجی کشمکش اور فکری انتشار کو ساحر نے کبھی نہیں بھلایا۔ بے کس بچوں اور مزدوروں سے ساحر کو بے حد پیار ہے لہٰذا وہ ان کے استحصال سے تڑپ اُٹھتے ہیں۔

ساحر کی نظم ''تاج محل'' ہندوستانی تہذیب وثقافت کی علامت ہے۔ اس نظم میں عہد مغلیہ کا عکس بھی ہے۔ جاہ وحشم اور تہذیب وتمدن پر ساحر نے طنز بھی کیا ہے۔ نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے:

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے صادق نہ تھے اُن کے جذبے
لیکن اُن کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

میری محبوب انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

ساحر کا تعلق تہذیبی و ثقافتی اقدار سے بھی ہے اور فنی و جمالیاتی اقدار سے بھی۔ ساحر نے اپنی شاعری کو آلہ کار نہیں بننے دیا جب کہ کئی دوسرے ترقی پسند لینن کے نظریہ کے اثر میں آ گئے۔ ترقی پسندوں کی بنیاد مارکس اور اینگلز کی تحریریں تھیں حالاں کہ ان مذکورہ دو ترقی پسند مفکروں کے یہاں ادب کو "آلہ کار یا حربہ" بنانے کا تصور نہیں ملتا البتہ لینن نے شعر و ادب کو "حربہ" کے بطور استعمال کرنے کا تصور پیش کیا۔

ساحر ترقی پسند ہونے کے باوجود صرف انسانی تہذیب اور آفاقی محبت کے علم بردار رہے۔ کئی احباب نے مایا کوفسکی کے فرمان کی تابع داری میں اپنی شعری صلاحیتوں کو تباہ کرلیا۔ پرولتاریت نے شعری مذاق پر کولتار کا کام کیا اور سیاہی نے روشنی پر قبضہ کرلیا۔ مگر ساحر نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ ان کے نزدیک انسانیت کی معراج کا انحصار کسی فرقے پر نہیں، کسی ذات یا معاشرے کی معاشی شناخت یا لسانی اور ذاتی تفاخر پر نہیں ہے۔ ساحر نے امن اور صلح کے پیغام کو فلمی اور غیر فلمی دونوں ذرائع سے عوام تک پہنچایا۔ امن و صلح سے ہی معاشرتی تہذیب انسانی زندگی سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

اس نظم میں انسانی اخوت اور قومی یک جہتی دونوں طرح کے خیالات ہیں۔ اس کا مرکزی خیال بلکہ قرآن کی اس آیت سے مستعار ہے۔ (پہلے بند کے پس منظر میں جس میں کہا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا:

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے تا کہ آپس کی پہچان ہو۔

حالاں کہ بنیادی طور پر ساحر کو مذہبی افکار سے سروکار نہیں۔ ان کا ذہن اس ضمن میں باغیانہ رویہ رکھتا ہے۔

عقاید وہم ہیں مذہب خیال خام ہے ساقی
ازل سے ذہن انساں بستہ اوہام ہے ساقی

ایسا لگتا ہے کہ ساحر وحدانیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس طرح جوش اللہ کی وحدانیت اور اس کے وجود پر پوری عمر شبہ کرتے رہ گئے۔

اگر پوری دنیا ایک سماج ہے تو جو تہذیبی اور اخلاقی قدریں ہمارے لئے اہم ہیں وہ پوری دنیا کے لئے بھی ہوں گی۔ نظم ''پرچھائیاں'' ایک اہم تخلیق ہے۔ جس میں رومان کا تصور بھی ہے مگر اس میں جبر و ظلم اور استبداد و استحصال کے تصورات و واقعات کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اے شریف انسانو! کا حوالہ آچکا ہے۔

یہاں پرچھائیاں سے یہ ٹکڑے ملاحظہ کیجئے:

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بُو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اُٹھی ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
مغرب کے مہذب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے
فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سلگتی دھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں

دھیرے دھیرے یہاں جوان فوج میں داخل ہونے لگے۔ چوپال کی رونق ختم ہوگئی، جو گانو کی تہذیبی میراث کا حصہ تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی جو تغیر پیدا ہوا اس کا ذکر سنیے:

چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواریاں ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں
افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے، کھلیان بکے
جینے کی تمنا کے ہاتھوں جینے ہی کے سب سامان بکے

اس عہد نے جس تہذیب کو فروغ دیا وہ آلودہ ہوگئی۔ ایک طوفان بلا خیز آیا اور انسانیت اور اس کے التزامات کو کچلتا چلا گیا۔ بارود کی بوجھل بو میں کھیتوں کی فصلوں کا اٹ جانا اور فوجی بینڈ تلے چرخوں کی صداؤں کا ڈوب جانا، معاشرے کی تہذیب کا اجڑ جانے کے برابر ہے۔ جبر اور استحصال پر جس معاشرے کی بنیاد ہوگی وہاں ہمہ گیر محبت اور آفاقی اعلیٰ اقدار پر مبنی تہذیب و ثقافت کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ساحر کی شاعری محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک بامقصد مشن ہے۔ جہاں تہذیب و ثقافت کی روح سانس لیتی ہے۔ انھیں اس کی آگہی حاصل ہے کہ ایٹمی کلچرز میں وہ آسماں (آسماں سے مراد فضا اور ماحول بھی ہو سکتا ہے) کو تباہ کردے گا۔

ساحر کسانوں اور مزدوروں، مفلسوں اور غریبوں کو ظلمت کدہ سے نکال کر لمعات نور سے ہم کنار کرانا

چاہتے ہیں۔ ان کے انقلابی آہنگ میں محض گھن گرج نہیں بلکہ مقصد اور مشن کے تئیں پر خلوص پیغام رسانی کا جذبہ کارفرما ہے۔ ساحر نے ثقافت پر مادی مظاہر کیے اثرات کو اپنی نظموں اور گیتوں کے ذریعہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ معاشرے کی تلخیوں اور زہرناکیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ایک نرم رو شعلہ ہے جو ساحر کی نظموں کی زیریں تہوں میں رقصاں ہے۔ ساحر کا کمال یہ ہے کہ اس شعلے کو "شعلہ جوالہ" نہیں بننے دیا ہے۔ ایک بات کی وضاحت یہاں ضروری ہے کہ نغمہ نگار ساحر اور ادب کا ساحر کی شاعری میں ابھی جس میانہ روی اور سبک خرامی کا ذکر ہو رہا تھا، اس ضمن میں جناب ظ۔ انصاری کا یہ موقف دیکھئے۔

"ساحر کے یہاں شور پکار نہیں۔ احتجاج ہے، شان وشکوہ نہیں، ڈرامائی تناؤ ہے، طمطراق نہیں، ہر ایک مظہر اور منظر اپنی اذیت یا مسرت کا اظہار ہے۔ وہ کسی سیاسی جلوس میں آگے آگے نعرہ لگاتے نہیں چلتے، البتہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔"

ساحر انسانی عظمت کا شاعر ہے۔ اس شاعر کی نظر میں دنیا کی آسائشوں سے زیادہ اہم ناداروں اور غریبوں کی زندگی ہے۔ فاقہ کش لوگوں اور بچوں کو دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اس شاعر کو محض نغمہ سرائی یا شعلہ نوائی سے دل چسپی نہیں۔ اس کے سامنے سماج اور اس کی تہذیب کی برہنگی ہے۔ "مرے گیت" کے یہ ٹکڑے ملاحظہ کیجیے۔

میں شاعر ہوں مجھے فطرت کے نظاروں سے الفت ہے
مرا دل دشمن نغمہ سرائی ہو نہیں سکتا
مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا

ساحر کے لئے یہ متضاد صورت حال گوارا نہیں۔

مرے ساغر میں مے ہے اور تیرے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی!

ساحر کی نگاہ تیز وہاں بھی پڑتی ہے جہاں اجنبی دیس کا گرانڈیل جوان اپنی جیب میں نقرئی سکوں کو کنکھناتے ہوئے مجبور دوشیزہ کی عصمت سے کھیلتا ہے۔ منہ میں سگریٹ اور ہاتھوں میں برانڈی کا گلاس لئے جب مغربی لوگ فلک بوس عمارتوں اور ہوٹلوں سے قہقہے اچھالتے ہیں، اس وقت بھوکی اور للچائی انسانیت منتظر ہوتی ہے کہ اجنبی دیس کا جوان کوئی سکہ اچھالے گا یا پھر بچے ہوئے کیک کا ٹکڑا ہی پھینک دے گا۔ ساحر نے اس تہذیب پر پڑی گرد ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ معاشرے کا کریہہ چہرہ ساحر کی نظموں میں صاف دکھائی

دیتا ہے۔ ساحر نے کبھی امیر طبقہ سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ایک رخ ملاحظہ کیجئے:

یہ اونچے اونچے مکانوں کے ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد رو بچے

معاشرے کی کثافتوں کو ساحر نے موضوع سخن بنایا ہے۔ وہ محبت اور نفرت کے جذبوں سے اپنی فکر کو غیر متوازن نہیں ہونے دیتے۔

ساحر کی شعری بصیرت میں اتنی تیزی ہے کہ تہذیب پر پڑی دبیز پرت کو penetrate کر سکتی ہے۔ ان کی فکر کا کینوس وسیع ہے۔ افق پر لہو کا جام چھلکنا، فضا میں گرم بگولوں کا رقصاں ہونا، بنت حوا کی چادر عصمت کا چاک ہونا، بے روح کمرے میں کھانسی کی ٹھن ٹھن، ڈھلکے بدن اور مدقوق چہرے، ایک ہی عورت سے باپ اور بیٹے کا ناجائز رشتہ ہونا، ملک و قوم کی خاطر خوں ریزی، فاقہ کش مزدوروں اور کسانوں کا حال زبوں......... گویا ساحر کی شاعری کے یہ سب تلازمے ہیں۔ ساحر کو اپنے دیش کی مٹی، اس کی خوشبو اور فصلوں سے انس ہے۔ کبھی کبھی ان پر جھلاہٹ کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ غدر کو ساعت ناپاک سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ غدر دراصل پہلی جنگ آزادی تھی جو منظم حکمت عملی کے فقدان کے سبب ناکام رہی اور ہندوستانیوں کا بڑا خسارہ ہوا۔

ہندوستان کی مٹی اور یہاں کی اشیا سے ساحر کو کس قدر جذباتی لگاؤ ہے، اس کا اندازہ نظم "جاگیر" کے اس ایک بند سے ہو جائے گا۔ ملاحظہ کیجئے:

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دہکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں سب میرے ہیں

ساحر کے نزدیک بھوک اور افلاس ایسے عوامل ہیں جو تہذیب و تمدن اور حسن لطیف کو مجروح کرتے ہیں بلکہ پنپنے نہیں دیتے۔ نظم "مادام" کا یہ حصہ دیکھیے:

نور سرمایہ سے روئے تمدن کی جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

ساحر جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے غلبے نے مشرقی تہذیب کو مسخ کر دیا ہے۔ انھیں جمہوری نظام اور قومی یک جہتی کا بھی پاس ہے۔ مگر ان کے نزدیک انسانیت اور صلح و امن پر قائم شدہ سماج زیادہ پسندیدہ تھا کیوں کہ یہی وہ معیار انسانیت ہے جو تہذیب انسانی کو اساسی ستون مہیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر زیبا محمود، سلطانپور

ساحرلدھیانوی۔ایک بیدار شاعر

ادیب شاعر یا کسی فنکار کے غور وخوض کا دائرہ جداگانہ ہوتا ہے۔فنکار جو کچھ سمجھتا ہے اس کے اظہار پر بھی قدرت رکھتا ہے۔فنکار کا مشاہدہ ہی اسکی تخلیق کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے جسے وہ جذب کر لیتا ہے اور یہ جذب وانجذاب کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے اور فنکار اپنے فن کے قالب میں ڈھال کر اسے پیش کرنے کا ہنر جانتا ہے۔یہی اس ادیب یا شاعر کی انفرادیت ہوتی ہے۔کولرج کا خیال ہے کہ،

''جتنا خیال گہرا ہوگا کہ شاعر اتنا ہی عظیم ہوگا''۔

مجنوں گورکھپوری کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔

''شاعری کا تعلق ابتدا ہی سے حیات انسانی کے اغراض ومقاصد کی فلاح وترقی سے ہے''۔

ساحرلدھیانوی کی شاعری پر یہ جملے صادق آتے ہیں۔ساحرلدھیانوی بیسویں صدی میں اردو شعروادب کے افق پر ایک عہد ساز شخصیت بن کر ابھرے۔ترقی پسند ادبی تحریک کی ہم نوائی میں انھوں نے اپنے فکروفن کے گوناگوں پہلوؤں کو صفحہ قرطاس پر کامیابی کے ساتھ بکھیر دیے۔اردو نظم کی دیرینہ روایات سے یکسر احتراز کیا۔تجربات سے مزین ان کی شعری افکار کا رقبہ وسعت آمیز ہے۔ساحر کی نظمیں بڑی ہنگامہ خیز اور انقلاب آفریں ثابت ہوئیں۔ساحر نے اپنی شاعری کا خود احتساب کیا۔فرماتے ہیں۔

دنیا کے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر بہ بانگ دہل اپنے موقف کا اعلان یوں کرتے ہیں۔

رجعت پسند ہوں نہ ترقی پسند ہوں
اس بحث کو فضول وعبث جانتا ہوں میں
آئینۂ حوادثِ ہستی ہیں میرے شعر
جو دیکھ رہا ہوں وہ کہتا رہا ہوں میں

لیکن اس کے باوجود انتہا پسندی سے گریز کیا،لیکن ترقی پسند ضرور ثابت ہوئے۔ان کی نظمیں طلوع اشتراکیت

،اجنبی محافظ، تاج محل، فنکار خودکشی سے پہلے وغیرہ ان کے ترقی پسند ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ انھوں نے سیاسی شاعری کی اور اپنی نظموں کو اپنے پیغام کا وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری درحقیقت وقت کی آواز تھی ان نظموں میں بالغ نظر سیاست داں نظر آئے۔ جرأت فکر جرأت اظہار اور جرأت عمل ان کی شاعری کا بنیادی خمیرہ ہے۔ ساحر نے ادب کو قومی زندگی کا ترجمان قرار دیا۔ ان کا کلام سامراجیوں اور ظلم روا کرنے والوں کی مختلف اور کسانوں اور مزدوروں کی خستہ حالی طبقاتی کشمکش اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور ان کے حقوق کی حمایت کی بہترین ترجمانی پیش کرتا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ ادب کو عوام کی اجتماعی زندگی کا ترجمان بلکہ ان کے نزدیک بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا بھی اظہار کرنا چاہیئے جس کی پیروری سے عوام متحد اور منظم ہو کر اپنی انقلابی جدوجہد کو کامیاب بنانے اور انقلابی قوت میں مزید اضافے کے امکانات کو پوشیدہ کر سکیں۔ ان عناصر سے مملو ادب سامراجیت اور ظلم واستبداد کے خلاف مسلسل وپیہم حرکت کا اعلان ثابت ہوگا۔ ساحر کا انسانیت کے مستقبل پر کامل اعتماد تھا۔ وہ ذہنی سیاسی اور اقتصادی مساوات کے علمبردار تھے۔ ساحر کے کلام میں احساس کی شدت بے پناہ ہے۔

کتنی آسائشیں رہیں ایوانوں میں
کتنے در میری جوانی پہ سدا بند رہے
کتنے ہاتھوں نے بنا اطلس کمخواب مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے

لیکن اس کے باوجود عزم ویقین کے ساتھ خوداعتمادی سے سرشار زندگی کی قوس وقزح پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں ۔

مجھ کو کہنے دو کہ میں آج بھی جی سکتا ہوں
عشق ناکام سہی زندگی ناکام نہیں

ساحر نے ہندوستان کی سیاست پر جو گہرے نقوش چھوڑے وہ بیش بہا ہیں۔ ان کے سماجی وسیاسی و عصری شعور اور فنی عظمت نے انھیں صف اوّل کے شعراء میں جگہ دی۔ آزادی کے بعد ملک میں غیر متوقع حالات نے تہذیب وانسانیت کی دھجیاں بکھیر دیں اور اس ہیجان وطوفان میں ساحر لدھیانوی کے فن پارے بکھرے شیرازے کو مرتب کرتے نظر آئے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی نظم ''مفاہمت'' کا یہ دلدوز انداز ملاحظہ فرمائیں۔

جہاد ختم ہوا دور آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے

ہجوم تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شراب ہوس کے پیمانے

اگر فیض احمد فیض نے اس آزادی کو شب گزیدہ سحر سے تعبیر کیا۔ تو ساحر نے اسے لفظ ''تماشا'' سے موسوم کیا۔

یہ جشن! جشن مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمع اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسیں فانوس

سیاسی منظرنامے پر ساحر کے خیالات اردو کے شعری افکار اور وسعت اظہار پر ایک کھلا challenge ہے۔ ساحر کی شاعری کا بلند آہنگ وقتی تاثر سے لبریز تھا۔ ساحر نے احساس واثر کو لازم وملزوم قرار دیا۔ غم کی حالت میں صدمے سے دوچار ہونا اور خوشی میں سرور سے ہم آہنگی احساس ہے اور جب یہ احساسات وجذبات الفاظ کے پیکر اختیار کرتے ہیں تو شعر بن جاتے ہیں۔ نظم ''احساس کامراں'' کا یہ بند انھیں خیالات وتاثر کی نشاندہی کرتا ہے۔

سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لئے
کوئی زنجیر گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے ناظم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں آسکتی

ساحر ایک نئی زندگی اور نئے سماج کی تشکیل میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ''نظم نئی صبح'' میں وہ پرامید ہیں کہ۔

وہ صبح کبھی تو آئیگی
ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ کے بادل پگھلیں گے جب سکھ کا ساغر چھلکے گا

الغرض ساحر کو زندگی سے بے پناہ الفت ہے۔ زندگی کی آسائیشوں کا عمیق ومطالہ مشاہدہ جنگ سے نفرت کا درس دیتا ہے اور ساحر دنیا کو تیسری جنگ عظیم کے اثرات سے خبردار کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہایاں بھی جل جائیں

گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
لیکن اس احساس کے باوجود ان کی شاعری زندگی جینے کا سلیقہ پیش کرتی ہے۔
جینے کو جیئے جاتے ہیں مگر
سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں
خاموش وفائیں جلتی ہیں
سنگین حقائق زاروں میں
خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

ساحر کی غائرنظر نے ادب اور عوام ادب اور سماج، ادب اور سیاست اور ادب اور اشتراکیت کے تمام پہلوؤں پر پرمغز روشنی ڈالی بقول ڈاکٹر محمد حسن۔

''ساحر لدھیانوی نے سماجی حقیقت پسندی کا بڑا سنبھلا ہوا انداز پایا ہے۔ ساحر لدھیانوی کے عہد میں اس صدی کے بڑے حصے میں جنگ کے بادل عالم انسانیت پر منڈلاتے رہے۔ سیاست دانوں کی لغزشوں کا نتیجہ بے شمار بے قصور انسانوں کو بھگتنا پڑا۔ اس عہد کے متعدد شاعروں نے جنگ و خون ریزی کی مزمت کی امن و خیر سگالی کی فضا قائم رکھنے کی اپیل کی۔'' شعر نو صفحہ ۱۷۱

انکے قلم کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ شہنشاہیت اور سامراجیت کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے

اور عوام اور عوامی جذبات کے سچے قدرداں ہونے کے باعث ان کا خیر مقدم کرتیں ہیں۔
سنگ و آہنگ کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کیوں ہٹ جائیں
کروٹیں لینے چلنے کو ہے سیل انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کیوں چھٹ جائیں

احمد ندیم قاسمی نے ساحر اور انکی شاعری پر جامع تبصر کئے اور اہل ادب کی جو توقعات وابستہ تھیں انھیں اس طرح الفاظ کے پیرایئے میں سمیٹا۔

''اردو کے جدید شعراء میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے اگر اسکے کلام کی پختگی، زبان کی پاکیزگی اور اسلوب کی بے

پناہ جذباتیت کے مقابلے میں اسکی عمر کو دیکھا جائے تو تعجب ہوتا ہے لیکن شاعری سن وسال کی محتاج نہیں اگر وہ افراط وتفریط سے بچارہا اور اپنے خلوص کو بے لوث اور احساس کو بے داغ رکھنے میں کامیاب ہوگیا تو بہت جلد ہندوستان کے ممتاز شعراء میں شامل ہوجائے گا'' (رسالہ دور حیات دسمبر ۱۹۴۱ صفحہ ۱۲)

جدید غزل میں انقلابی بانکپن کو ساحر نے بخوبی برتا۔ مجاز کی طرح ساحر کے یہاں شدت جذبات تو ہے مگر ان کی رومانیت مریضانہ اور غیر صحت مند نہیں۔ انداز کے والہانہ پن کی ایک شاندار مثال نظم تاج محل سے اخذ ہے۔

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

نئی زندگی اور خوش آئند مستقبل کے پیروکار ساحر غم آشنا فطرت کے مالک بھی تھے۔ اک مثال پیش ہے۔

حیات ایک مستقل غم کے سوا کچھ نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

جاں نثار اختر ساحر کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اس نے قلم کی قوت سے اگر ایک طرف حسن کی لطافت اور نزاکت عشق کا درد اور کسک بخشی تو دوسری جانب سماجی مادی اور اقتصادی شعور دیا۔ اس نے خود کو دھوکہ نہ دیا نہ اپنے فن کو نہ ترقی پسند تحریک کو نہ عوام کو۔ اس نے وہ کیا جو بحیثیت ایک بیدار شاعر کا فرض تھا'' (رسالہ دور حیات دسمبر ۱۹۴۱ صفحہ ۱۶)

ساحر کی نظم میرے عہد کے حسینوں اردو شاعری میں ایک کامیاب اضافہ ہے۔ اس میں موجودہ ایٹمی دور کی اچھی عکاسی کی گئی ہے لومبا کے قتل سے متاثر ہوکر ساحر نے 'خون پھر خون' کے عنوان سے ایک نظم قلم بند کی۔ ایسی نظم جس میں انسانیت کا بھرپور جذبہ چھپا ہوا ہے جو اس بات کا مصداق ہے کہ شاعر کا دل ہمیشہ سے انسانیت کے لئے تڑپتا رہا۔ الغرض شعری معنویت کے لحاظ سے ساحر کا کلام وقیع اہمیت وافادیت کا حامل ہے جس کے توسط سے عوامی انقلاب کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔ ساحر کے خیال اور اشعار میں ایک برجستگی ہے جس نے بین الاقوامی فہم کی راہوں کو مستحکم و مربوط کیا۔ انہیں کلام پر قدرت ہے اور اس عتبار سے وہ اپنی تمام معاصرین میں یکتا ہے عصری مسائل پر آپ کے قلم میں جن موضوعات کا احاطہ کیا اس سے آپ کی نگاہ کی تہہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

نگار خانہء ساحرؔ

GOVERNMENT COLLEGE

ساحر لدھیانوی کی درخواست برائے داخلہ،
سال اول لدھیانہ کالج

ساحر لدھیانوی اور شورش کاشمیری (زمانہ کالج میں)

(بائیں سے) سلطانہ جعفری، عصمت چغتائی، وشوامتر، علی سردار جعفری، کرشن چندر، مہندر ناتھ، ممتاز حسین، راجندر سنگھ بیدی (سامنے) ساحر لدھیانوی، حبیب تنویر۔ ۱۹۴۶ء بمبئی

ساحر اور ستیہ پال آنند (۱۹۵۶)
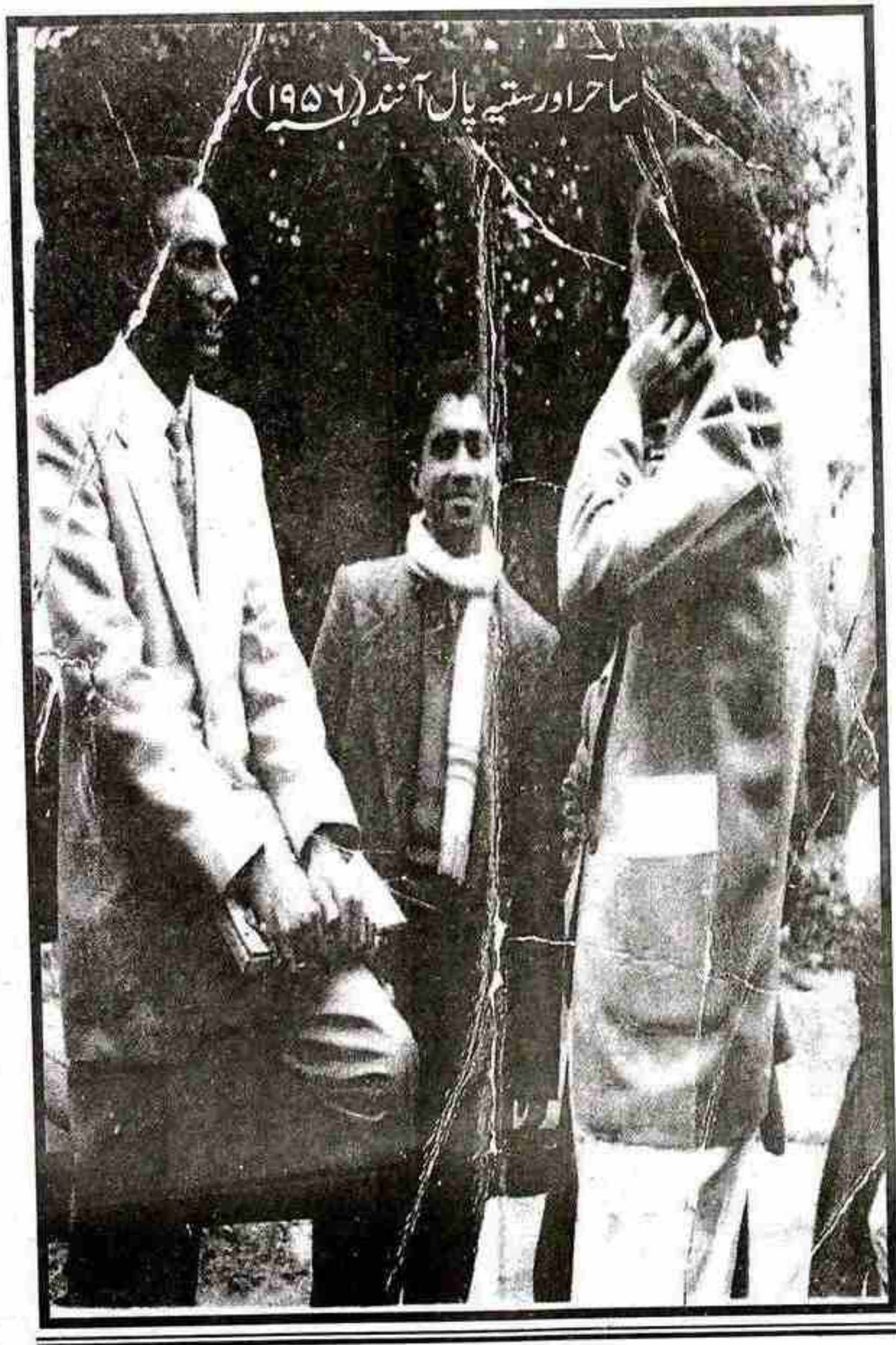
ساحر لدھیانوی، اپنے دوستوں شیو کمار، بھلہ اور سمن گپتا کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف

دہلی کے ایک مشاعرے میں کلام پڑھتے ہوئے ساحرؔ،
ڈائس پر فیضؔ، ساغر نظامی اور جگر مرادآبادی

ایک مشاعرے میں نظم سرا ساحرؔ

ساحر اور قرۃ العین حیدر
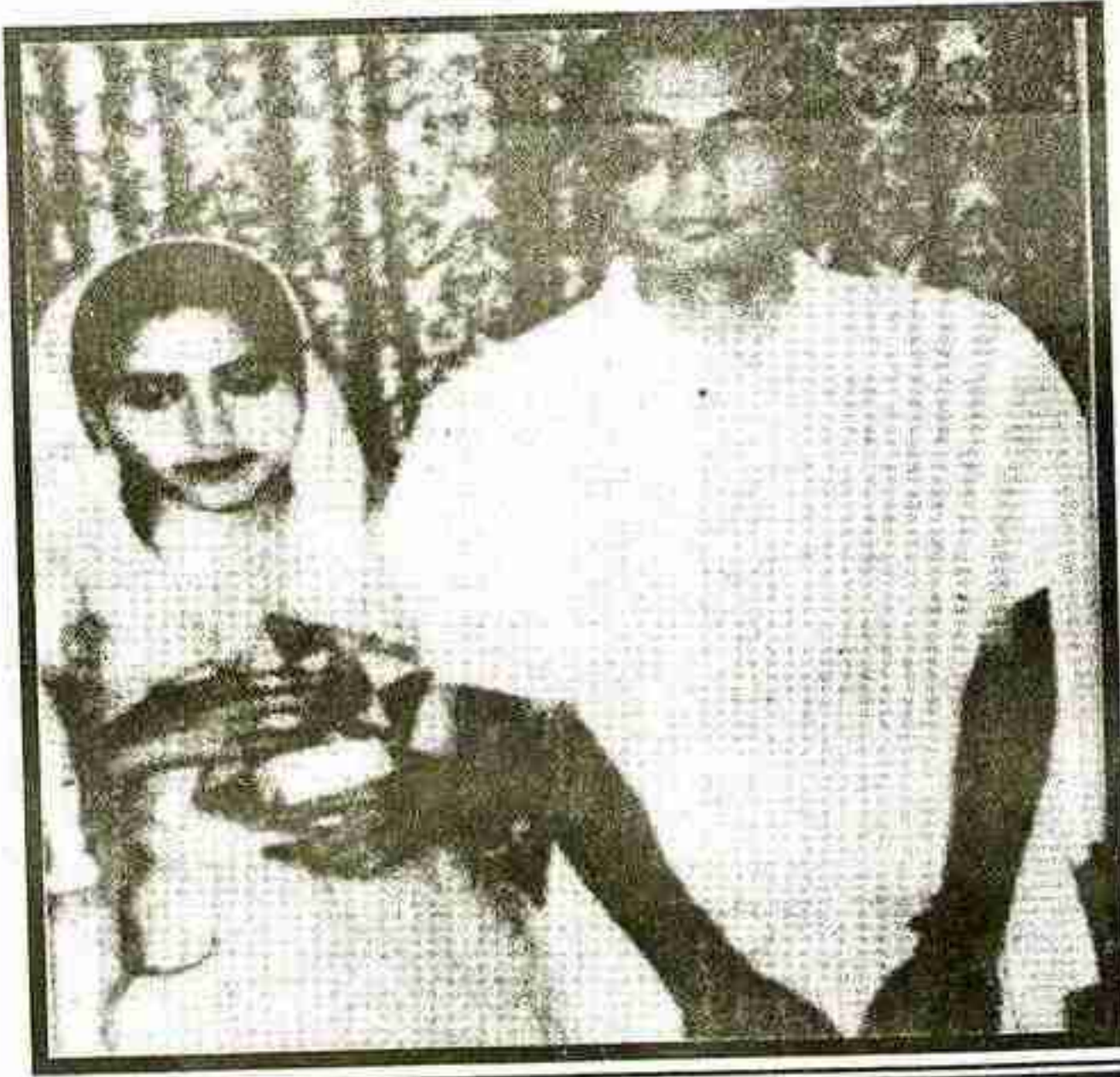
ساحر اور واجدہ تبسم

ساحرؔ، پنڈت میلا رام وفا کے ساتھ (درمیان میں)
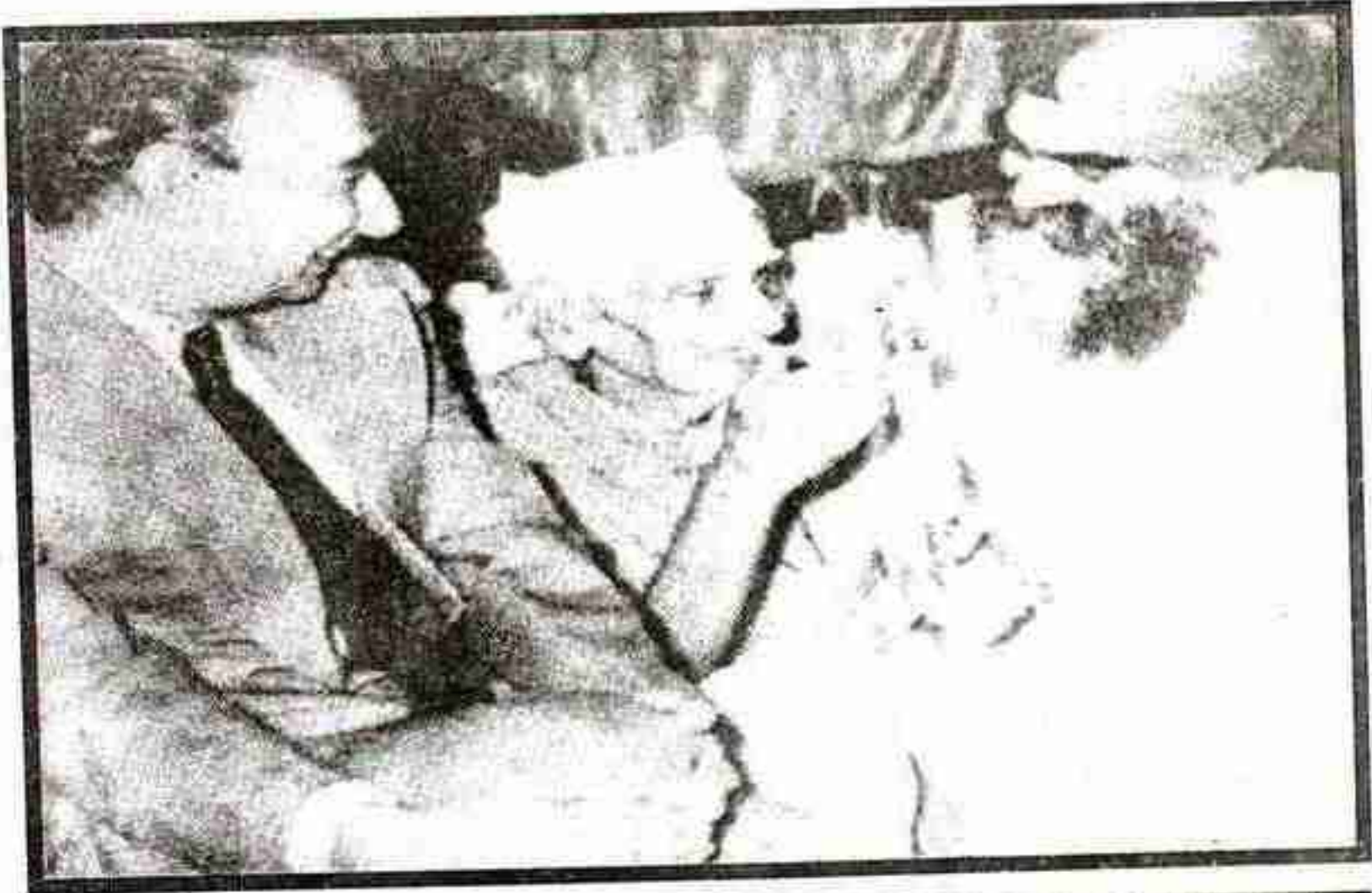
پہلی صف (دائیں سے) جاں نثار اختر، پرکاش پنڈت، ساحر، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی
پرکاش کے پیچھے دوسری صف میں راجہ مہدی علی خاں
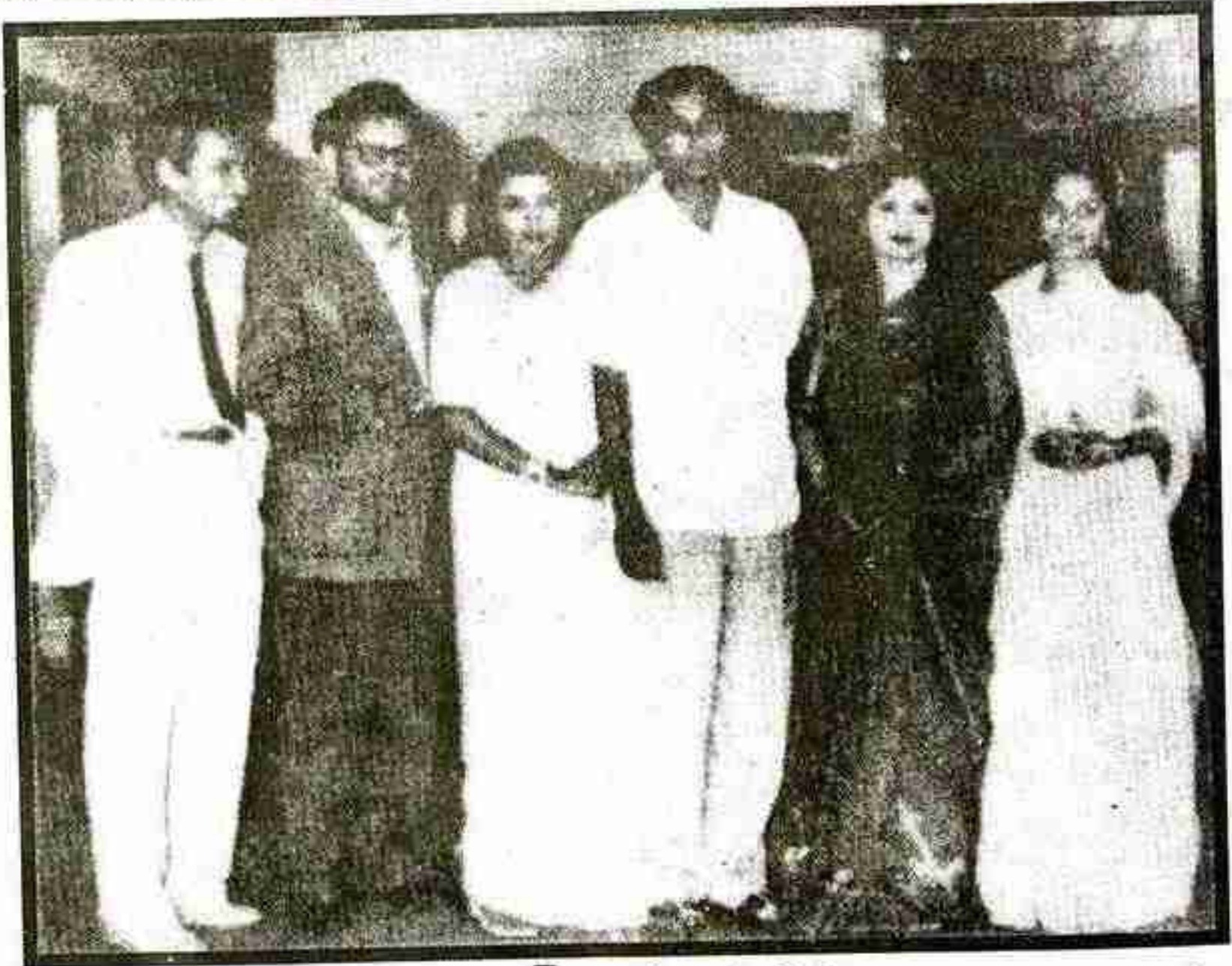
سنیما کے اداکاروں کے ساتھ ساحر

(دائیں سے) راماننڈ ساگر، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شوکت کیفی اور ساحرؔ

(دائیں سے) امرتا پریتم، جاں نثار اختر اور آخر میں ساحرؔ

سنیما ''کبھی کبھی'' کے مہورت پر یش چوپڑہ، لتا منگیشکر، ساگر سرحدی، خیام، ساحرؔ و دیگر

ساحرؔ اپنی والدہ کے ساتھ، صابر دت بھی موجود ہیں

جناب جی ایس پاٹھک، نائب صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ساحرؔ "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" قبول کرتے ہوئے
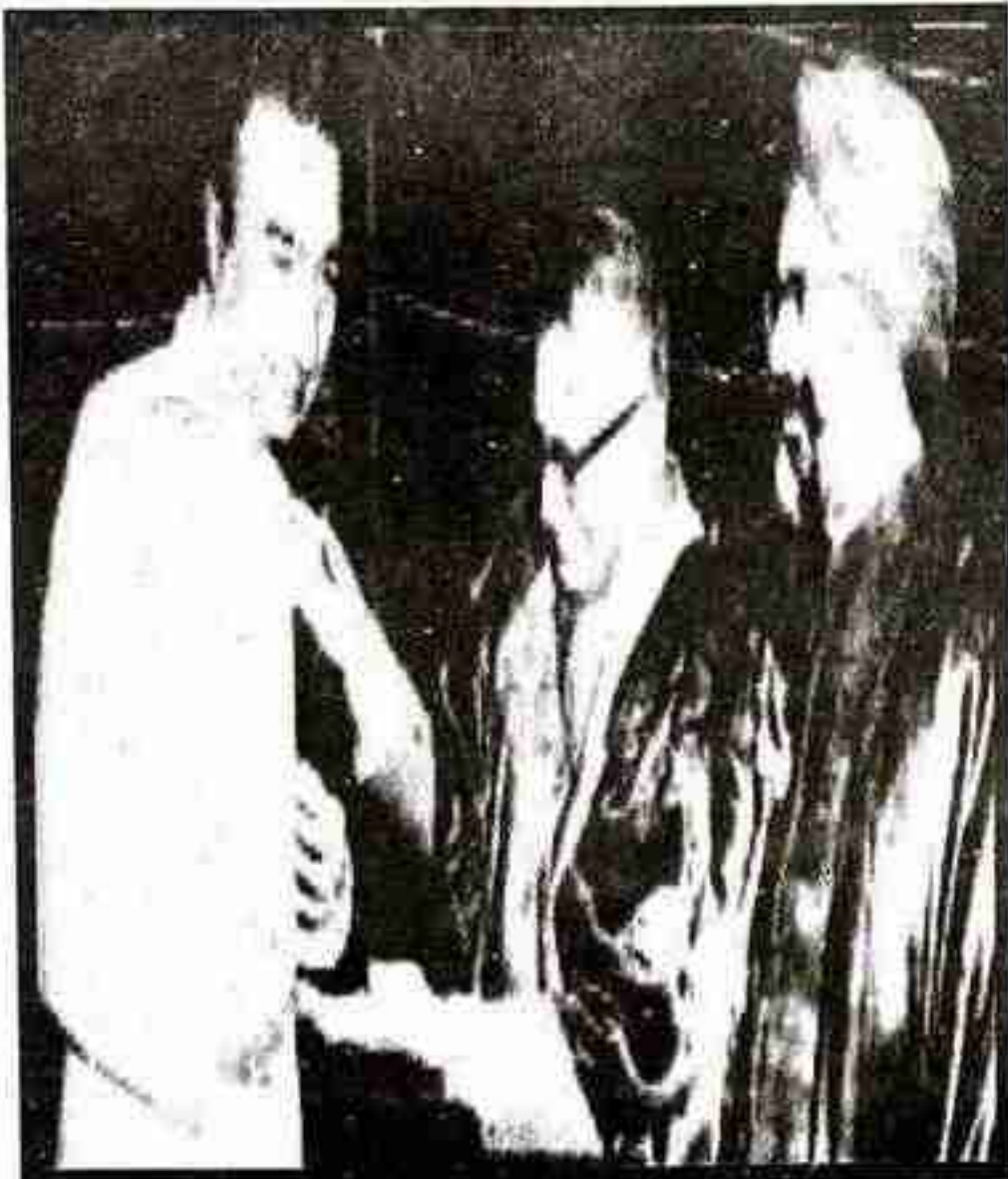
ساحرؔ کو لدھیانہ کالج کی جانب سے گولڈ میڈل دیتے ہوئے مرکزی وزیر تعلیم وی کے آر وی راؤ

ساحرؔ لدھیانوی اور کرشن چندر

آئینہ در آئینہ
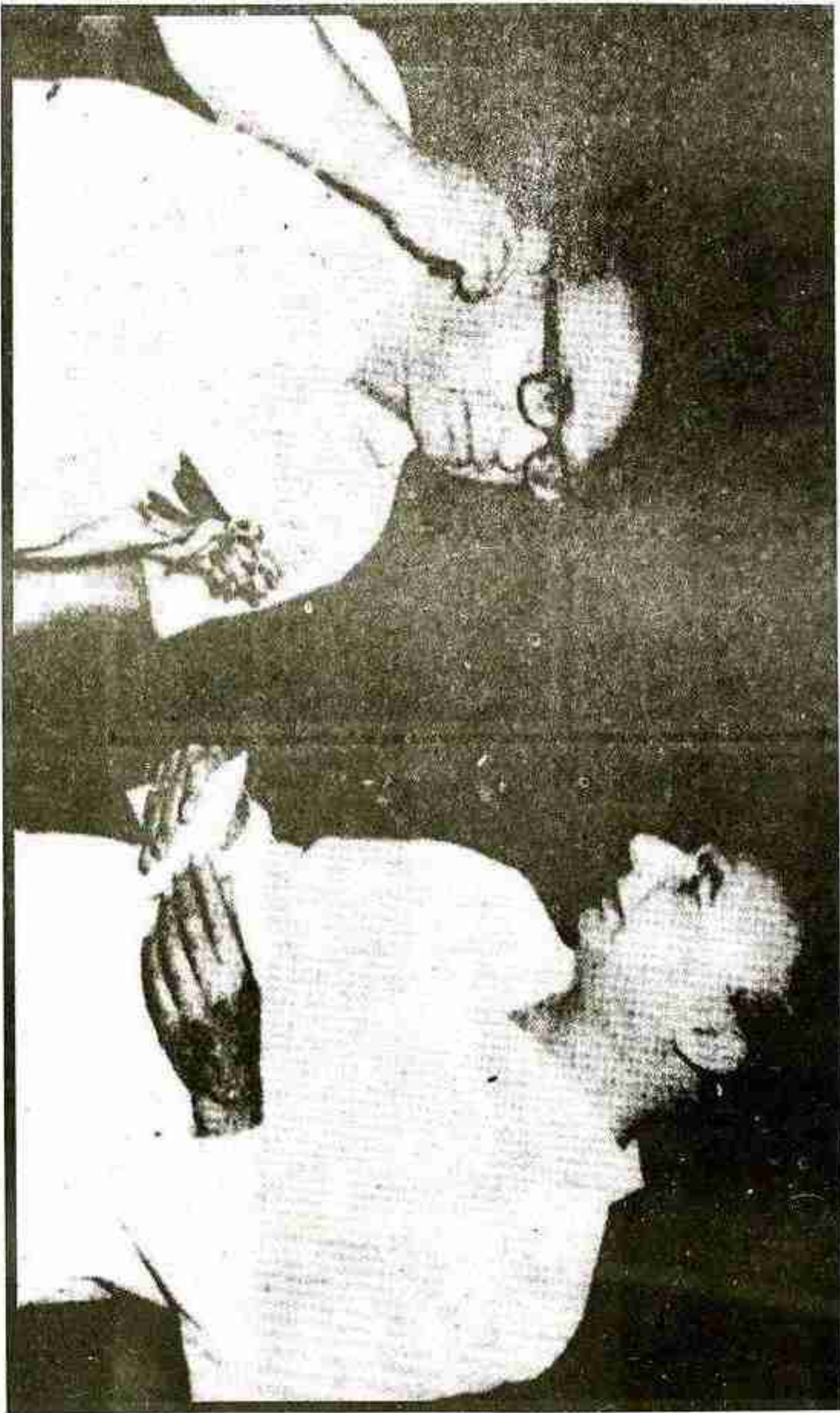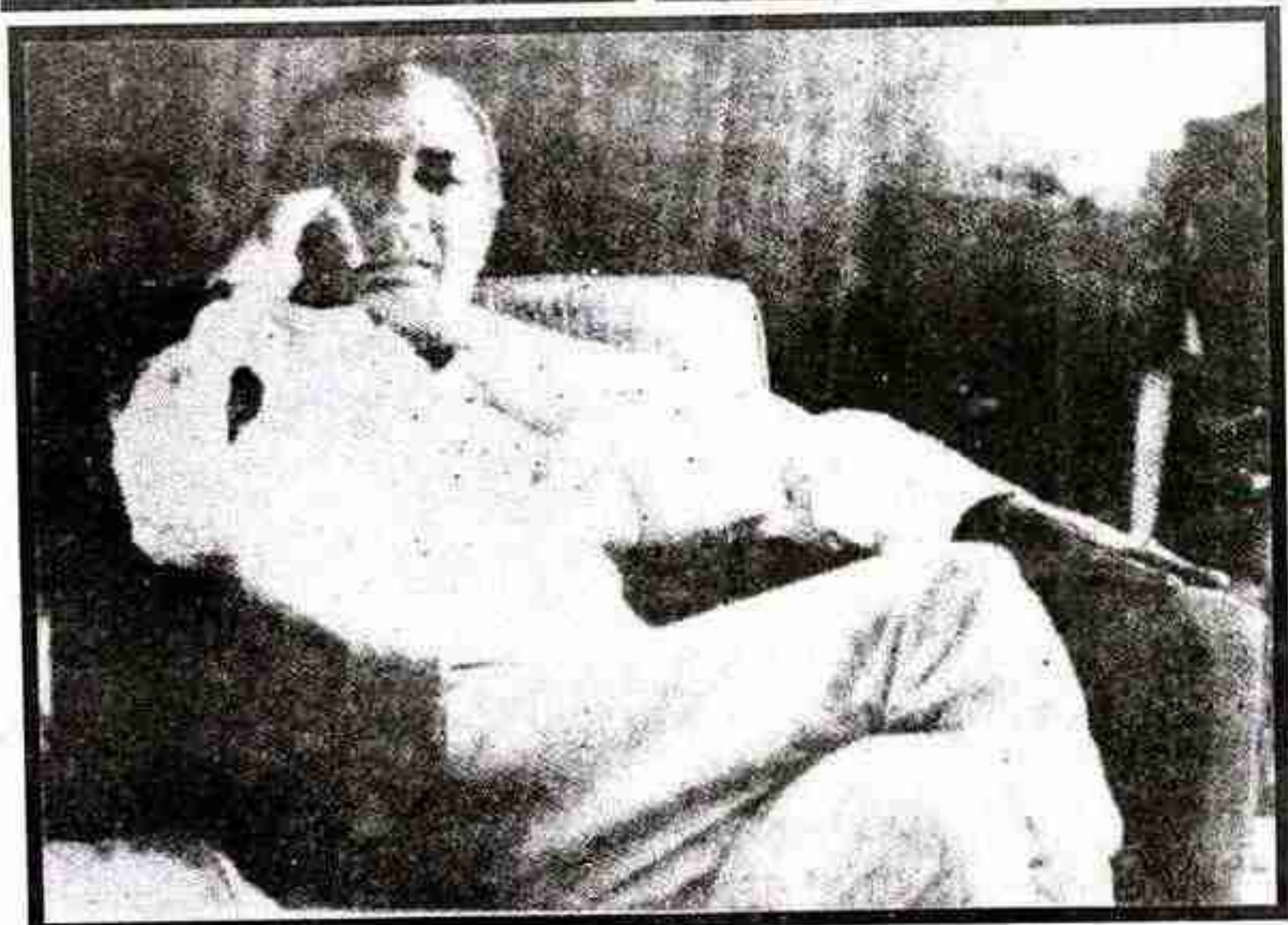
(بائیں سے) قمر صدیقی، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، ایک عزیز (۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء لکھنو)

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن ...
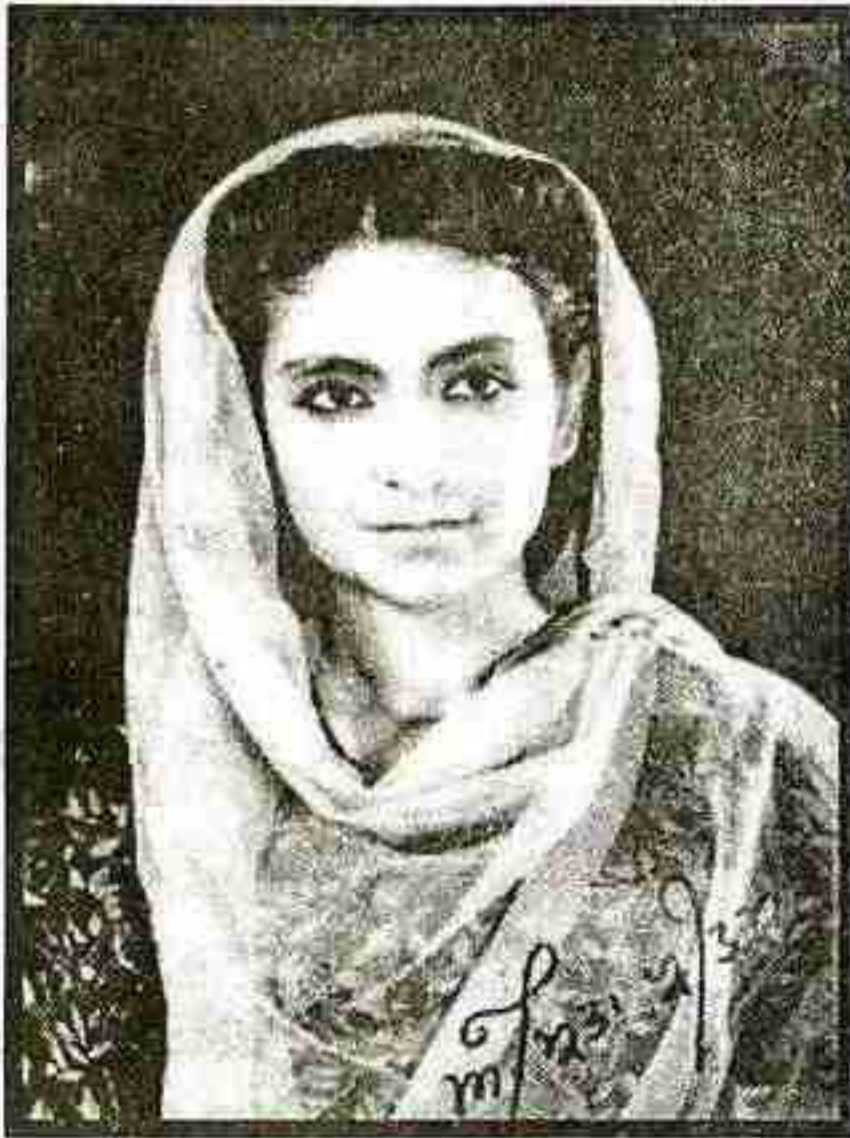
ساحر کا ادھورا افسانہ

امرتا پریتم

ساحرکا اولین شعری مجموعہ 'تلخیاں' (۱۹۴۴) سرورق
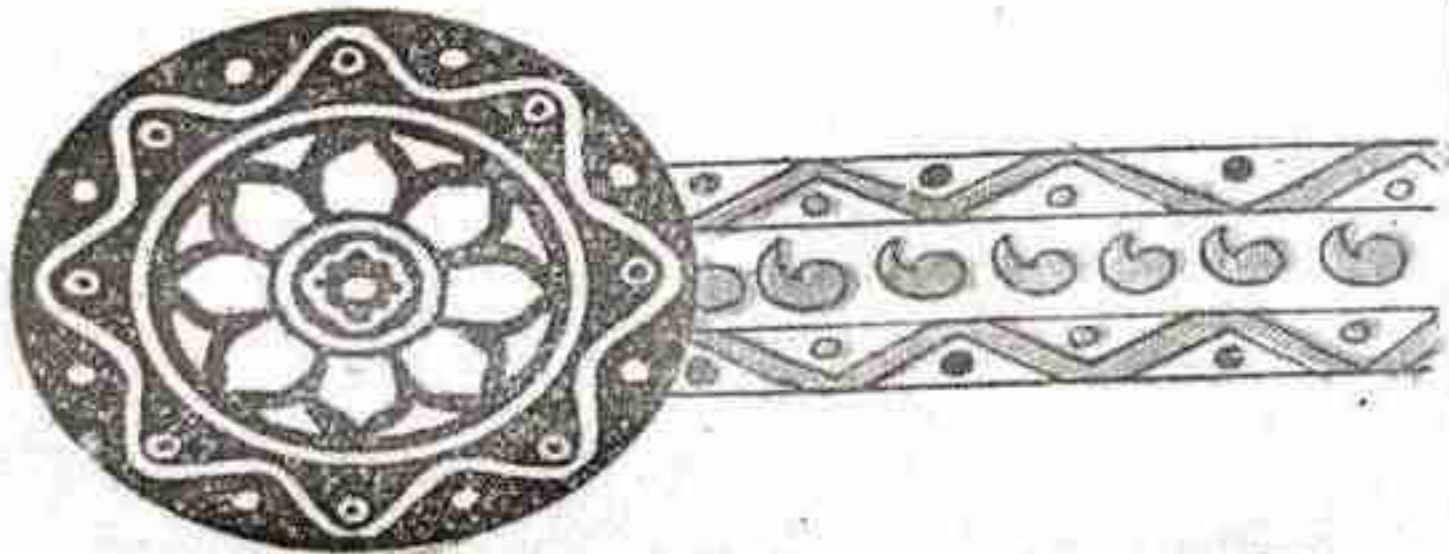
ساحرؔ کی طویل نظم 'پرچھائیاں' (۱۹۵۵ء) کتابی صورت میں شائع ہوئی

مکاتیبِ ساحرؔ

مکتوبِ ساحرؔ لدھیانوی بنام خلیل فرحتؔ کارنجوی (۱)

۱۲ اپریل سنہ ۶۲

Sahir Ludhianvi

CHINAI NIWAS, SEVEN BUNGALOWS, ANDHERI, BOMBAY.

فرحت صاحب!

آپ کا خط ملا۔ بیحد شکرگزار ہوں۔

نظم "تاج محل" کی پیروڈی کے سلسلے میں آپ نے میری رائے مانگی ہے
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا رائے دوں۔ سچ پوچھا جائے تو
یہ پیروڈی ایک آزاد نظم ہے، جو تاج محل ہی کے بارے میں
آپ نے لکھی ہے اور جس میں نظم "تاج محل" کے کچھ مصرعے اڑا
لیے گئے ہیں۔ یہی اس نظم کا میری نظم سے تعلق ہے
اس تعلق کو آپ "پیروڈی" بھی کہہ سکتے ہیں، مگر کسی حد
تک ہی۔

بہرحال میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ کہ آپ نے یہ نظم
بھیجی۔ اور اسے میری نظم سے منسوب کیا۔ میری نیک خواہشات
آپ کے ساتھ ہیں۔ اور میں آپ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔
امید ہے، آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

والدِ گرامی خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم کے ساحرؔ لدھیانوی سے مراسلاتی مراسم تھے۔ میرے ہوش سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد تک میں نے ساحرؔ کے کئی ایک خطوط فرحتؔ مرحوم کے نزدیک دیکھے تھے۔ فرحتؔ مرحوم کا یہ تہذیبی رکھ کھاؤ ہی تھا کہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک خطوط بڑے اہتمام سے سنبھال کرر کھے تھے۔ لیکن آپ اسے میری شومیِ قسمت پر ہی محمول فرمائیں کہ آسماں کے دستِ ستم سے نجات پاتے پاتے مذکورہ خطوط میں سے کئی ایک اہم خطوط گم شدگی کا شکار ہوگئے، جتنے باقی بچے، سو حاضرِ خدمت ہے۔ وسیم فرحتؔ کارنجوی

مکتوبِ ساحرؔ لدھیانوی بنام خلیل فرحتؔ کارنجوی

(۱)

۱۲ستمبر ۱۹۶۶

فرحتؔ صاحب!

آپ کا خط ملا۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ نظم 'تاج محل' کی پیروڈی کے سلسلے میں آپ نے میری رائے مانگی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ میں کیا رائے دوں، سچ پوچھا جائے تو یہ پیروڈی ایک الگ نظم ہے، جو تاج محل ہوٹل کے بارے میں آپ نے لکھی ہے اور جس میں نظم 'تاج محل' کے کچھ مصرعے استعمال کیئے گئے ہیں۔ یہی اس نظم کا میری نظم سے تعلق ہے، اس تعلق کو آپ 'پیروڈی' بھی کہہ سکتے ہیں، مگر کسی حد تک ہی،

بہر حال میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ نظم مجھے بھیجی۔ اور اسے میری نظم سے منسوب کیا۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ اور میں آپ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

امید ہے، آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا،
ساحرؔ

مکتوب ساحرؔ لدھیانوی بنام خلیل فرحتؔ کارنجوی (۲)

مکتوبِ ساحرؔ لدھیانوی بنام خلیل فرحتؔ کارنجوی

(۲)

۸نومبر ۱۹۶۰ء
بمبئی

برادرم!

آپ کا خط ملا۔ شکریہ

نظم ''وہ صبح کبھی تو آئیگی'' فلم کے لیے ہی لکھی گئی تھی۔ ''پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ'' اور اس کے بعد کا مصرع ،،،،،، یعنی ،، ''دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو'' ''تلخیاں'' سے لیا گیا ہے، باقی اشعار فلم کے لیے لکھے گئے ہیں۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا،
ساحرؔ

رفیقانِ ساحرؔ

ایک موقع پر سرسید احمد خاں نے کہا تھا ''اگر خدا نے مجھ سے پوچھا کہ دنیا میں تم نے کیا کام کیا تو میں جواب دوں گا کہ ''میں نے خواجہ الطاف حسین حالی سے مسدسِ حالی لکھوائی۔'' اسی طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک تحریر میں نے لکھی جو تاریخی طور سے موثر ثابت ہوئی تو وہ ایک 'کھلی چٹھی' تھی جو میں نے 1948 میں ساحر لدھیانوی کے نام لکھی تھی۔ ساحر اس وقت پاکستان چلے گئے تھے۔

یہ کھلا خط ساحر لدھیانوی کے نام تھا مگر اس کے ذریعے میں ان سب ترقی پسندوں کو آواز دے رہا تھا جو فسادات کے دوران یہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔

تین مہینے بعد میں حیران رہ گیا جب میں نے ساحر لدھیانوی کو بمبئی میں دیکھا۔ اس وقت تک میں ساحر سے ذاتی طور سے زیادہ واقف نہ تھا۔ لیکن ان کی نظموں (خاص طور سے 'تاج محل') کا میں قائل تھا۔ اور اسی لیے میں نے وہ 'چٹھی' ساحر کے نام لکھی تھی...

بلا کی مقبولیت ملی ساحر کو۔ اس میں اردو زبان کی لطافت، شیرینی، حسن اور زور کا بھی دخل تھا اور اس زبان کے سبب سے حساس اور نازک مزاج اور رنگیلے شاعر کی تخلیق کا بھی دخل تھا جو اس زبان کا بیک وقت واشق بھی تھا اور معشوق بھی۔ عاشق صادق اس لحاظ سے کہ وہ اس زبان پر فریفتہ تھے۔ نہ صرف انھوں نے اپنی کئی فلموں کو اردو سرٹیفکیٹ دلوائے بلکہ اردو کے لیے بہت سے دکھ جھیلے اور لڑتے بھی رہے۔ معشوق ان معنوں میں کہ اس زبان نے جتنی چھوٹ ساحر کو دے رکھی تھی اتنی کسی اور شاعر کو کبھی نہیں دی۔ ساحر نے جتنے تجربات شاعری میں کیے ہیں وہ دوسروں نے کم ہی کیے ہوں گے۔ انھوں نے سیاسی شاعری کی ہے، رومانی شاعری کی ہے، نفسیاتی شاعری کی ہے... ایسی بھی شاعری کی ہے جو تخلیقی طور سے پیغمبری کی سرحدوں کو چھو گئی ہے اور ایسی شاعری بھی کی ہے جس میں رنگین مزاجی اور شوخی جھلکتی ہے اور یہ سب شاعری کی اصناف ان کے فلمی گانوں میں ملتی ہیں۔

(خواجہ احمد عباس)

....

ساحر لدھیانوی چل بسا، یوں جیسے پنجرا اڑ گیا ہو پنچھی یہیں رہ گیا ہو۔ اس کے نغمے اس کی شاعری اس کی ساحرانہ یادیں وہ ہمارے پاس زندہ ہیں۔ خدا میں اتنی طاقت نہیں کہ انھیں ہم سے لے جاسکے۔ خدا کتنے معاموں میں کتنا بے بس ہوتا ہے شاید خدا کے نصیب میں یہی پنجرا لکھا ہے اور بس... مگر ساحر کی روح ــــ کل ہی میں اس کا ایک

شعر گنگنا رہا تھا:

غریب شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیر شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

ہاں، خدا کا کوئی موت کا فرشتہ اس شعر کو فنا نہیں کر سکتا کیونکہ ساحر تو اس شعر اور ایسے ہی کئی شعروں میں زندہ ہے۔

(فکر تونسوی)

....

ساحؔر سے میری مراسلت ۱۹۵۵ کے وسط سے شروع ہوئی۔ انہیں پہلے پہل نقوش لاہور کے 'غزل نمبر' میں پڑھا تھا۔ بلا کی جاذبیت ان کی شاعری میں محسوس کی۔ بہتوں سے یہ کہتے سنا کہ ساحؔر کی شاعری پر حضرت فیض کا پرتو دکھائی پڑتا ہے، یادش بخیر، ایک آدھ کے علاوہ فیض صاحب کے بھی شعری مجموعے ۱۹۵۵ کے بعد منظر عام پر آئے، اس تناظر میں غور کریں تو اس بات کی یہیں تردید ہو جاتی ہے۔ اپنے پیش روؤں یا ہم عصروں سے اثر انداز ہونا الگ بات ہے اور تقلید حدیث دیگرے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ساحؔر نے کلی طور پر فیض صاحب کا تتبع کیا ہے۔ فیض صاحب، مجاز اور ساحؔر، تینوں کے یہاں غنائیت، مختلف ذائقہ اور لذت رکھتی ہے، لہٰذا ہم کسی کو بھی باہم مضموم نہیں کر سکتے۔

(مرحوم خلیل فرحؔت کارنجوی)

....

(جناب ستیہ پال آنند نے اپنی یادداشتوں کے مجموعہ "کتھا چار جنموں کی" سے ساحر لدھیانوی سے متعلقہ دو اقتباسات مرحمت فرمائے ہیں۔ موصوف کی کتاب حال ہی میں کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ مدیر)

اقتباس (ایک)

کرشن ادیب دراصل کچھ دیر کے بعد ہمارے گروپ میں شامل ہوئے تھے۔ ہم لوگ مغربی پاکستان سے آئے تھے، لیکن وہ لدھیانہ کے قریبی قصبے پھلور کے رہنے والے تھے۔ مرنجاں مرنج، ڈھائی ہڈی

کے نوجوان جوٹی بی سے نجات پا کر پھر سگرٹ، شراب اور تمبا کو کھانے کی طرف لوٹ گئے تھے، شعر کہتے تھے، کچھ اچھے، کچھ بے وزن۔ میں چونکہ بحور واوزان کا دماغ رکھتا تھا اس لیے وہ اپنی نئی نظم سب سے پہلے مجھے ہی سناتے۔ کہتے، ''لو، آنند، نکالو، اپنا مستریوں والا پیمانہ اور ماپو ان کو!'' میں حتے الوسع تصحیح کر دیتا۔

تقسیم سے پہلے ان کے ساحرؔ لدھیانوی سے دوستانہ مراسم رہے تھے۔ لیکن چونکہ ساحرؔ سے کم عمر تھے اس لیے یہ دوستی زیادہ دیر تک نہ پنپ سکی۔ کرشن ایک اچھے فوٹو گرافر تھے اور یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اپنے خرچ پر ہی دوستوں کی تصویریں بناتے رہتے تھے۔ رسائل میں چھپی ہوئی میری کئی تصویریں کرشن نے ہی بنائی تھیں۔

جب ہم دوستوں نے مل کر ایک سیاسی اور سماجی کارکن ست پال حتل کی مدد سے گورنمنٹ کالج میں ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے ساحر لدھیانوی کو ایک خط لکھا تو اس کے ساتھ ہی کرشن ادیب سے بھی ایک خط لکھوایا۔ ساحر تب تک پاکستان بننے کے بعد لدھیانہ نہیں لوٹے تھے۔ انہوں نے آنے کی حامی بھر لی اور کہا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ آئیں گے، تا کہ وہ بھی اپنے پرانے مکان کو دیکھ سکیں اور کچھ دیر لدھیانہ کی ہوا میں سانس لے سکیں۔ مقررہ وقت پر ساحر گاڑی کے فرسٹ کلاس کے ڈبے سے اپنی ماں کے ساتھ اترے، ہم لوگ تانگے میں سیدھے ہی انہیں گورنمنٹ کالج میں لے گئے۔ ساحر میرے نام سے واقف تھے کیونکہ ساحر کے اور ان کے ایک پرانے دوست پینٹر باوری کے بارے میں میری ایک کہانی ''شمع'' میں چھپی تھی، جس پر ساحرؔ کو یہ اعتراض تھا کہ میں نے یہ کہانی لکھ کر اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آخر کار یہ تصفیہ ہوا کہ ساحر لدھیانوی کی دوستی اور خلوص کو سامنے رکھتے ہوئے میں اپنی یہ کہانی کسی کتاب میں شامل نہیں کروں گا، کسی اور رسالے میں بغرض اشاعت نہیں بھیجوں گا اور کہ یہ سمجھا جائے گا کہ اس کا کاپی رایٹ ساحرؔ لدھیانوی نے خرید لیا ہے۔ ساحرؔ نے مجھے کچھ روپے دینا چاہے، لیکن میں نے نوٹوں کا بنڈل لوٹا دیا اور ان کو گلے لگاتے ہوئے کہا، ''آپ مجھ سے بہت سینئر ہیں، میں تو ابھی پچیس برس کا ہوں، لیکن آپ کی محبت کا قائل ہو گیا ہوں۔ امید ہے کہ میں اگر کبھی بمبئی آیا تو آپ سے مل سکوں گا۔'' ساحرؔ نے پھر مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا، ''آپ میرے پاس ٹھہر بھی سکتے ہیں۔'' پھر کرشن ادیب کی طرف دیکھ کر ایک جملہ کسا، ''غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے!'' ساتھ ہی اپنی کتاب ''پرچھائیاں'' کی ایک جلد نکالی۔ اس پر لکھا،

''ستیہ پال آنند دے لیی۔ بوہت بوہت پیار دے نال''

''بوہت'' ''بوہت'' پنجابی لہجے میں لکھ کر ساحرؔ نے ساتھ ہی مجاز کا ایک شعر لکھ دیا،'' کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں، اور کیا: کیوں بدگماں ہیں یوسف کنعاں لکھنؤ!''

اس کی وجہ تسمیہ میرا وہ گلہ تھا جو میں نے ساحر کو اپنی ایک دوست لڑکی کے ساتھ مشاعرے کے بعد

بغلگیر ہو کر اس کے گالوں پر بوسہ دینے کے سلسلے میں تھی۔ اسے میں نے ہی اسٹیج کے پیچھے ساحر سے متعارف کروایا تھا اور جب ساحر نے دیکھا کہ وہ حسینہ ان سے بہت مرعوب ہے تو میرے سامنے ہی اسے باہوں میں بھر کر اس کے گال چوم لیے تھے۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا، لیکن میں نے اس وقت کچھ نہیں کہا تھا اور بعد میں کھانے کی میز پر میں نے آہستہ سے کہا تھا، ''ساحر، کیا آپ ہمیشہ دوستوں کے مال پر ہاتھ صاف کرتے ہیں؟'' اس وقت تو ساحر مسکرا کر خاموش ہو گئے تھے، لیکن اپنی کتاب پر یہ حروف لکھ کر انہوں نے میرے دل کی خلش مٹادی تھی... ساحر کے ساتھ ذاتی سطح پر تعلقات کی بیخ و بنیاد تو یہ تھی ہے، لیکن یہ تعلقات کرشن ادیب کی وساطت سے کیسے مضبوط ہوئے، ان کا تذکرہ ابھی مجھے کرنا ہے۔

اقتباس دو (۲)

''سیریکس لدھیانوی''

ایک ماہ کے لیے ممبئی؟ اور وہ بھی کرشن ادیب کی رفاقت میں؟ خدا جانے کیسے میں نے موسم گرما کی تعطیلات میں یہ پروگرام بنالیا، لیکن اب یاد آتا ہے کہ ممبئی میں مقیم میرے ہم زلف کے ہاں کچھ تقریب تھی اور میری بیگم چاہتی تھیں کہ اس بار میں اکیلا ہی وہاں ہو آؤں۔ موقع میسر ہوا تو میں نے لدھیانہ سے بمبئی کے لیے دو سیٹیں ریزرو کروائیں، کرشن ادیب کو ساتھ لیا، اور یہ جا، وہ جا، ہم لوگ چوبیس گھنٹوں کے سفر کے بعد بمبئی پہنچ گئے۔ ساحر سے رابطہ ہو چکا تھا لیکن میں نے ان سے معذرت کے ساتھ یہ اجازت لے لی تھی، کہ میں رہوں گا تو اپنی سالی صاحبہ کے گھر لیکن انہیں ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔ کرشن تو ٹیکسی لے کر سیدھے ہی ساحر کے گھر چلے گئے، لیکن مجھے چونکہ میرے ہم زلف اسٹیشن پر لینے آئے ہوئے تھے، میں ان کے ساتھ نیوی کالونی پہنچ گیا۔

دو تین دنوں کے بعد کرشن کا فون کال آیا کہ ساحر میرا انتظار کر رہے ہیں اور ان کی امّی جان بھی مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں دو تین بسیں بدل کر پہنچا تو واقعی دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار ہو رہا تھا۔ ساحر کو مچھلی مرغوب تھی، اس لیے ان کے لیے ان کا نوکر ہمیشہ ایک دو طرح کی مچھلی پکاتا تھا۔ اس دن بھی دستر خوان پر مچھلی کے کباب، مچھلی کے پکوڑے، بیک Bake کی ہوئی مچھلی کے علاوہ کوئی اور سالن نہیں تھا۔ میں مچھلی سے الرجک ہوں، اس لیے میں نے نان لیا اور اسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھاتے ہوئے پانی کے ایک ایک گھونٹ کے ساتھ گلے سے اتارنے لگا۔ تبھی امّی کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ چشم زدن میں وہ سارا معاملہ سمجھ گئیں، کہ

شاید میں گوشت نہیں کھاتا، وہ خود اٹھیں، اندر فرج سے سویاں، حلیم اور دو تین دیگر پکوانوں کے ڈونگے نکال لائیں اور نوکر کو انہیں گرم کر کے لانے کو کہا۔ تبھی کرشن ادیب نے ایک مچھلی اور ماہی گیر کے درمیان ایک مزاحیہ مکالمہ ایسے سنایا کہ میں اور امی دونوں ہنس پڑے، لیکن ساحر نے ہنسنا تو در کنار، ہونٹوں کے ایک کونے کو بھی خم نہ دیا، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اسے ہنسی آتے آتے رک گئی ہے۔

امی نے کہا، ''ہنستا تو بالکل نہیں... بس سوچتا رہتا ہے۔ میرا عبدالحئی بیٹا!''

کرشن تو ماہر فن لطیفہ گو تھا، اس نے ایک لطیفہ سنایا، ''دو پٹھان، ایک بھینس کے آگے اور دوسرا اس کے پیچھے، کھینچ کھینچ کر اس کو سیڑھیوں پر چڑھانے کا جتن کر رہے تھے، لیکن وہ اپنے اگلے پاؤں ایک سیڑھی پر رکھتی پھر پیچھے کھسک آتی۔ پسینہ پسینہ ہو رہے تھے دونوں پٹھان۔ ایک ہمسائے نے پوچھا، ''ارے بھائی کیا کر رہے ہو؟'' بولے ''خو، اس کو ذبح کرنا ہے، اب یہ کھانگڑ ہو گئی ہے،'' ہمسائے نے پھر پوچھا، ''تو اسے اوپر چھت پر لے جانے کی کیا ضرورت ہے، نیچے باندھ کر گلے پر چھری پھیر دو!'' جواب ملا، ''خو، یہی تو جھگڑا ہے، ہمارا ذبح کرنے والا چھری اوپر چھت پر رکھا ہے!''

ہم دونوں، ساحر کی امی اور میں، زور زور سے ہنسے، لیکن ساحر کے ہونٹوں پر مجال ہے کہ مسکراہٹ کا ایک شائبہ سا آیا ہو!

کرشن نے کسی مزاحیہ مشاعرے کی روداد سنانی شروع کی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے سبھی وار خالی جا رہے ہیں، تو منہ سکوڑ کر خاموش ہو گیا۔ تبھی میں نے کہا، ''آپ کا نام تو ''ساحر لدھیانوی'' سے بدل کر ''سیریس لدھیانوی'' رکھ دیا جانا چاہیے، ساحر صاحب!''

دھماکے کی ہنسی کے ساتھ ساحر ایک بار تو زور سے ہنسے، پھر دوسری بار ذرا آہستگی سے ہنسے، پھر خاموش ہو گئے۔ ''کہا، یہ نام مجھے پہلے بھی مل چکا ہے۔ گورنمنٹ کالج، لدھیانہ، میں جس سکھ لڑکی سے میری دوستی تھی، اس نے بھی یہی کہا تھا کہ ساحر تخلص رکھ لینے کے بعد تم اسم بامسمّٰی نہیں بن سکتے، ہاں ''سیریس'' تخلص رکھ لو، تو تم 'جیسا کام ویسا نام' کی جیتی جاگتی تصویر بن جاؤ گے۔''

....

جگرؔ، مجازؔ، سردار جعفری اور نسبتاً نئے شاعروں میں شکیب جلالی، شہریار، بانی، عرفان صدیقی، بشیر بدر کو میں اتنا بڑا اور اہم شاعر نہیں مانتا جتنا کہ ہمارے مصلحت پسند نقادوں نے انہیں مشتہر کر دیا ہے۔ دراصل ان لوگوں کی مقبولیت اور شہرت کے شامیانے بیش تر غیر ادبی طنابوں پر ایستادہ ہیں۔ جن میں جذباتیت، سماجی

سروکار، اپنے منصب کا استعمال، نظریاتی گروہ بندی اور نقادوں سے رسم وراہ جیسے عوامل کا دخل ہے۔ ہر چند کہ ساحر لدھیانوی اس سلسلے کی کڑی نہیں ہیں پھر بھی ان کی بعینہ ادبی عظمت اور مقبولیت میں تخلیقی جوہر کے ساتھ کچھ رومانی تصورات اور غیر ادبی معاملات کی کارفرمائی بھی شامل ہے۔

ساحر ہمارے بڑے شاعروں میں بھلے ہی شامل نہ ہوں لیکن ان کی اہمیت بہر حال مسلم ہے۔ ہر چند کہ فیض کی شاعری کا تتبع ان کی بڑی کمزوری ہے لیکن میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ فلمی شاعری کے دلدل میں ساحر لدھیانوی نے ہر جگہ ادبی اقدار اور تخلیقی معیارات کا لحاظ رکھا ہے۔ اس ضمن میں ان کا مرتبہ بہر طور مجروح سلطانپوری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی، نئی دہلی)

....

جگر صاحب جب بھی کسی آل انڈیا مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آتے تھے اپنے کسی ہونہار شاگرد کو ساتھ لاتے اور فلم انڈسٹری میں متعارف کرا کے چلے جاتے تھے۔ شکیل مرادآبادی اور مجروح سلطانپوری کو بھی جگر صاحب نے دریافت کیا تھا اور انہوں نے اپنے پرانے جمے ہوئے شاعروں مدھوک، قمر جلال آبادی وغیرہ کی فصیلوں میں رخنہ ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ ساحر بمبئی آئے تو انہیں جگر صاحب جیسی کسی بیساکھی کا سہارا نصیب نہیں تھا، اپنی ہی پتلی پتلی ٹانگوں پر چلتے ہوئے داخل ہوئے۔ فلم انڈسٹری سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھی۔ شکیل انہیں سوٹ کرتے تھے۔ مجروح ہوشیار آدمی تھے، باغبان اور صیاد دونوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ سیاسی مشاعروں میں آتے تو یہ پڑھ کر داد سمیٹتے کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور فلموں میں اس قسم کے گیت لکھ کر پیسے سمیٹتے:

نجر لاگی راجہ تورے بنگلے پر

لیکن اس قسم کی سمجھوتے بازی ساحر کے فطرت کے خلاف تھی۔ کمیونسٹ ہونے کا لیبل ان پر لگ چکا تھا اس لیے کہ کبھی انہوں نے چھپانے کی کوشش نہیں کی، اردو مارواڑی اور گجراتی فلم پروڈیوسر اس لفظ سے ایسے بدکتے تھے جیسے لال کپڑے سے بیل۔

(سعید رضا سعید)

....

خراجِ عقیدت

خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

تاج محل ہوٹل بمبئی

(ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم 'تاج محل' کی پیروڈی)

تاج ہوٹل سے تجھے لاکھ محبت ہی سہی
تجھ کو اس اونچی عمارت سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملاکر مجھ سے

مہنگی ہوٹل میں غریبوں کا گزر کیا معنی!
ثبت جس راہ پہ ہوں نقرئی سکوں کے نشاں
اس پہ غربت بھری روحوں کا سفر کیا معنی!

جگمگاتی ہوئی ہوٹل سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا!
میری محبوب پسِ مرغ مسلم وکباب
اک نظر جیب کے خانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت ہوٹلیں ہیں دیکھ اسی بمبئی میں
کون کہتا ہے کہ اچھے نہیں کھانے ان کے
لیکن ان کے لئے آرائش سامان نہیں
وہی ہوٹل ہیں مری جان غریبوں کے لئے

بوائے[۱] خوشپوش، حسیں گرلز[۲]، مہذب ویٹر[۳]

برقی فانوس یہ پھولوں سے سجائے ہوئے طاق

ایک زردار نے دولت کا سہارا لیکر

ہم غریبوں کی غریبی کا اڑایا ہے مزاق

میری محبوب کہیں اور ملاکر مجھ سے

۱۹۶۴ء

۱. Boy

۲. Girls

۳. Waitor

خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم

ترانۂ اتحاد

(ساحؔر لدھیانوی کی مشہور نظم 'خوبصورت موڑ' کی پیروڈی)

چلو اک بار پھر سے 'بھارتی' بن جائیں ہم دونوں

نہ میں تم سے رکھوں امیدِ 'آر ایس ایس' نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو یوں 'لیگ' انداز نظروں سے
نہ میری 'تنگ نظری' لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمہاری 'عصبیت' کا راز نظروں سے
چلو اک بار پھر سے 'بھارتی' بن جائیں ہم دونوں

تمہیں بھی کتنے 'پنڈت' بدگماں کرتے رہے مجھ سے
مجھے بھی 'شیخ' کہتے ہیں کہ یہ 'کافر' پرائے ہیں
تمہارے ساتھ بھی کچھ 'سازشیں' ہیں اپنے ماضی کی
مرے ہمراہ بھی 'برطانوی فتنوں' کے سائے ہیں
چلو اک بار پھر سے 'بھارتی' بن جائیں ہم دونوں

'سیاست' روگ بن جائے تو اس کو بھولنا بہتر
'قیادت' بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ 'رہبر' جن سے فرحتؔ ملک کی خدمت نہ ہو ممکن
انہیں اک 'خوبصورت ڈاج' دے کر چھوڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے 'بھارتی' بن جائیں ہم دونوں

۱۹۶۷ء

خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم

کشمکش

(نذرِ ساحرؔ لدھیانوی)

دل کئی روز سے بے تاب و پریشاں سا تھا
آج کیا بات ہے مسرور نظر آتا ہے
لوٹ کر آئیں نہ آئیں یہ سکوں کے لمحے
اف یہ لمحے جو مرے دل کے سیہ خانوں میں
عید کے چاند کی مانند کبھی آتے ہیں
سوچتا ہوں کہ انہیں نذرِ سخن کیوں نہ کروں

کوئی پرسوز تڑپتا ہوا نغمہ لکھوں
کسی برہن کے خیالات کروں گیت میں بند
ترجمانی کسی بیوہ کے خیالوں کی کروں
جس کو سن لیں تو پگھل جائیں یہ پتھر کے صنم
جس کو سن لیں تو حسیں آنکھوں میں آنسو آجائیں
جس کو سن لیں تو کبھی آئے نہ ہونٹوں پہ ہنسی

یا لکھوں حسن کی تعریف میں اشعار غزل
زلف و رخسار کی توصیف میں اک نظم لکھوں
چشمِ مد ہوش کی مستی کا فسانہ چھیڑوں
یا کروں گیسوئے خمدار کی باتیں جس کے
پیچ و خم میں کئی باہوش بھی کھو جاتے ہیں
یا کروں نور سے معمور جبینوں کا بیاں

یا لکھوں محنت و سرمایہ پہ سرکش نغمے
جن کو سن لیں تو بغاوت پہ اتر آئیں عوام
یا کہ سرمایہ کے سامانِ تعیش کا بیاں
یا بلکتے ہوئے مزدور کے بھوکے بچے

یا دریچے پہ لٹکتے ہوئے کمخواب کا ذکر
کسی دوشیزۂ مفلس کے پھٹے کپڑوں کا
یا دکھاؤں کہیں محلوں میں غلاموں کا ہجوم
یا کہ بازار میں بکتی ہوئی عصمت کا بیاں
یا لکھوں مرثیہ اب خوئے وفا کا اپنی
کیسے مسرور ہیں اغراض و مقاصد والے

ذہن پر چھاگئی یہ فکر دمِ فکرِ سخن
کیا لکھوں کیا نہ لکھوں فیصلہ ہوتا ہی نہیں
ذہن کی سطح سے ابھرا وہ کوئی کہتا ہوا
سن رہا ہوں میں بہت دیر سے باتیں تیری
تجھ کو بھٹکائیں گے کب تک ترے آوارہ خیال
تیری ہر فکر ہر اک سوچ پہ حق ہے میرا
تو مجھے بھولے تو پھر شعر نہیں کہہ سکتا

۱۹۶۳ء

خلیل فرحت کارنجوی مرحوم

نقوشِ ماضی

(نذرِ ساحر لدھیانوی)

جانے کیوں آج تری یاد بہت آتی ہے
شوق ماضی کے جزیروں کی طرف لوٹ آیا
اس تمنا میں کہ خوابوں کا سہارا مل جائے
دل کو مستقبلِ رنگیں کا تجسس ہے مگر
حال افکار کی زنجیر لئے بیٹھا ہے
آنکھ لگتی نہیں اور تیرے تصور کا یہ حال
جاگتے میں بھی مجھے خواب نظر آتے ہیں

ہائے وہ پہلے پہل تجھ سے ملاقات لطیف
وہ نگاہوں کا تصادم وہ تمنائیں جواں
پیار میں ڈوبے ہوئے تیرے دلآویز خطوط
ذہن کی سطح پہ شدت سے ہیں پھر رقص کناں
جن کی ہر سطر میں پنہاں تھا وفاؤں کا ہجوم

جن کے ہرلفظ میں اخلاص نظر آتا تھا
جن میں تعداد تھی قسموں کی نہ وعدوں کا شمار
عشق ناراس بھی جب راس نظر آتا تھا

تو نے لکھا تھا کہ ہم تم نہ جدا ہونگے کبھی
انقلاب آئے ہزاروں کہ زمانہ بدلے
اسی انداز سے ہم گاتے رہیں پیار کے گیت
پیار بدلے نہ محبت کا ترانہ بدلے

میری محبوب کبھی یہ بھی کہا تھا تو نے
میرے افسانے کا عنوان تمہیں ہو فرحتؔ
میری دنیا ہو مری جان تمہیں ہو فرحتؔ

آہ! وہ آخری خط آہ ! وہ زہراب وفا
جس کا مضمون مری رگ رگ میں ہوا زہر اثر
اور اب تجھ سے ملاقات کا امکان نہیں
تیرا بدلا ہوا انداز یہ دیتا ہے خبر

۱۹۶۲ء

خلیل فرحتؔ کارنجوی مرحوم

زخمِ معصوم

(نذرِ ساحرؔ لدھیانوی)

جب کوئی دوست کوئی ہمدمِ دیرینہ مرا
مجھ سے کرتا ہے محبت کی وفا کی باتیں
تذکرے ریشمی زلفوں کے حسیں آنکھوں کے
یا دمکتے ہوئے عارض کی ضیا کے چرچے
شرم سے جھکتی ہوئی چشمِ حیا کی باتیں

توڑ کر آہنی پنجوں کو جہاں والوں کے
چاندنی رات میں رنگین ملاقات کا ذکر
کبھی وعدوں کے وفا ہونے کی خوشیوں کا بیاں
اور پھر دونوں کے بہکے ہوئے جذبات کا ذکر
کبھی محبوب کی تعریف میں ترہوتی زباں

میرے محبوب کی تعریف کہاں تک کیجیے

جیسے جنت سے کوئی حور اتر آئی ہو
حسنِ صورت ہے کہ نوخیز کلی ہو جیسے
حسنِ سیرت ہے کہ حوروں میں پلی ہو جیسے
رخِ زیبا کا وہ عالم ہے کہ ثانی نہ ملے
اس کو ہنستا ہوا دیکھے تو کبھی گل نہ کھلے
زلف بکھرے تو گھٹاؤں کا مہینہ آجائے
روپ دیکھے تو بہاروں کو پسینہ آجائے

مرمریں ہاتھوں پہ مہندی کے بنے گل بوٹے
ابرو ایسے کہ ابھی تیر کماں سے چھوٹے
مست آنکھوں میں گلابی کی لگاوٹ ہے ہے
سرخ عارض پہ وہ کاجل کی سجاوٹ ہے ہے
مجھ سے مت پوچھ مرے دوست تو اس حور کا نام
جس کی تقدیس کو آتے ہیں فرشتوں کے سلام
کانپ جاتا ہے مرا دل یہ کہانی سن کر

آنکھ روتی ہے مگر اشک نہیں بہہ سکتے
ذہن کی سطح سے رہ رہ کے ابھرتا ہے کوئی
جس کی معصوم نگاہوں نے مجھے لوٹ لیا
جب بھی سنتا ہوں کہیں لفظِ محبت فرحت
روح احساس کے پردوں میں لرز جاتی ہے
اور سوئے ہوئے جذبات سسک اٹھتے ہیں

۱۹۶۲ء

نقشبند قمر نقوی بخاری، امریکہ

غزل

(برزمین ساحرؔ)

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے
ساحرؔ لدھیانوی

یہ معجزہ دکھا ہی دیا اس بہار نے
سارا بدن گلاب کیا ایک خار نے

اب خود ہی رمز شوق کا عنوان بن گیا
وہ جو چلا تھا درد کی تصویر اتارنے

دیکھی تھی ان کے عکس کی صرف ایک ہی جھلک
دیوانہ کر دیا ہے نقوش و نگار نے

قطعاً غلط یہ حالتِ پیری کا اتہام
مجھ کو جھکا دیا ہے محبت کے بار نے

میں مانتا ہوں قوسِ قزح ہے مرا لباس
زخمی کیا ہے مجھ کو زمانے کے وار نے

سب کچھ خزاں نے پھونک دیا پھر بھی رہ گئے
وہ پھول جو تھے ان پہ سے صدقے اتارنے

اپنے وجود پر بھی قمرؔ نقوی ناز ہے
آئینہ کر دیا ہے مجھے قربِ یار نے

ڈاکٹر محبوب راہی، آکولہ

غزل

(برزمین ساحؔر)

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بیدلی سے ہم
ساحرلدھیانوی

وہ جس کے منتظر تھے گزشتہ صدی سے ہم
کیا پا رہے ہیں دوستی اس آگہی سے ہم

کب تک چلیں سفر میں یونہی گمرہی کے ساتھ
کب تک اجالے مانگا کریں تیرگی سے ہم

اپنے پرائے کی کوئی تخصیص کچھ نہیں
رشتے تمام توڑ چکے ہیں سبھی سے ہم

وہ جس پہ اعتماد مکمل رہا ہمیں
کھاتے رہے فریب مسلسل اسی سے ہم

اب تو برائے نام تعلق ہے اس کے ساتھ
رکھتے تھے ربط ضبط کبھی زندگی سے ہم

چل جائے گا وہ چال کچھ ایسی ہمارے ساتھ
واقف نہیں تھے وقت کی اس کجروی سے ہم

راہؔی جنوں نہ کرتا جو ہر گام رہبری
بچ پاتے کیسے عقل کی پھر گمرہی سے ہم

ڈاکٹر محبوب راہی، آکولہ

غزل

(برزمین ساحر)

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے
ساحر لدھیانوی

کاوش سے اپنے درد کا درماں نہ کر سکے
دشوار مرحلوں کو ہم آساں نہ کر سکے
دنیا کو وحشتوں سے دلاتے رہے نجات
لیکن رفو ہم اپنا گریباں نہ کر سکے
تھا مقتضائے ظرف کہ دشمن کی ہار پر
ہم جیت کر بھی جشنِ چراغاں نہ کر سکے
پرواز کی ہوس کو نہ بڑھنے دیا کبھی
ہم آرزوئے تختِ سلیماں نہ کر سکے
ہر اک درِ طلب پہ جھکایا نہ ہم نے سر
سجدوں کو اپنے اتنا بھی ارزاں نہ کر سکے
پورے ہوئے نہ وقت کے ہم سے مطالبات
ہم زندگی کو حرزِ دل و جاں نہ کر سکے
اے راہی کر کے ہر کس و نا کس سے التجا
ہم اپنی مشکلات کو آساں نہ کر سکے

ڈاکٹر گنیش گائکواڑ، بلڈانہ

غزل

(بر زمین ساحؔر)

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں
ساحؔر لدھیانوی

نگہ بلند مگر عزم پائیدار نہیں
یہی سفر ہے تو کچھ اس کا اعتبار نہیں
عجیب موڑ پہ لے آیا ولولہ دل کا
"میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں"
اسی سے بچ کے رہو جو عزیز لگتا ہے
وہ جان من ہے تمہارا وہ جاں نثار نہیں
تیرے قریب گیا تو پتہ چلا مجھ کو
قریب والوں میں تیرے مرا شمار نہیں
عجیب دور میں ہم لوگ جی رہے کہ جہاں
وفا خلوص کا اخلاق میں شمار نہیں
مرے لہو سے جلے ہیں مری غزل کے چراغ
یہ آئینہ ہے وفاؤں کا ،اشتہار نہیں

خورشیدؔ اکبر، پٹنہ

غزل

(برزمین ساحرؔ)

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں
ساحرؔ لدھیانوی

کسی کے درد میں کوئی شریکِ کار نہیں
سنا ہے شہر کا ماحول سازگار نہیں
مرے لیے تو کہیں موسمِ قرار نہیں
''میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں''
نیا سفر بھی ہے نوخیز بھی ستارۂ جاں
مگر اے رنگِ فلک تیرا اعتبار نہیں
یہ اور بات زمین و زماں امانت ہیں
یہ اور بات مجھے خود پہ اختیار نہیں
وہ ایک شخص سمجھتا ہے خود کو آئینہ
وہ ایک شخص مری طرح بے قرار نہیں
وہ ہم سفر ہے عجب سُر میں گا رہا ہے ابھی
وہ میری روح کا بجتا ہوا ستار نہیں
میں جا رہا ہوں تو آؤں گا لوٹ کر خورشیدؔ
اسی لیے تو کوئی آنکھ اشک بار نہیں

ڈاکٹر کلیم ضیاؔ، بمبئی

غزلیں

تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بیدلی سے ہم
ساحرؔ لدھیانوی

ہر گز نہیں ڈریں گے کبھی تیرگی سے ہم
مانوس ہو چکے ہیں نئی روشنی سے ہم
کرنے ہیں کتنے اور بھی سجدے بتایئے
بے زار ہو نہ جائیں کہیں بندگی سے ہم
اظہارِ مدعا میں ہے لفظوں کا کام کیا
واقف ہیں خوب اُن کی کہی اَن کہی سے ہم
ہر زاویئے سے دیکھ رہے ہیں وہ خیر ہو
کیسے بچیں گے آنکھوں کی منظر کشی سے ہم
ان کے فرشتوں کو بھی نہ ہوگی ذرا خبر
گزریں گے ان کی راہ سے اس خامشی سے ہم
قربانیوں کے نام پہ کب تک ستائیں گے
تنگ آچکے ہیں آپ کی اس دوستی سے ہم
ہر دل لگی تو ہوگی نہ دل کی لگی ضیاء
ڈرتے ہیں کس خیال میں پھر دل لگی سے ہم

رکھتے نہیں ہیں ربط کوئی بے حسی سے ہم
لڑتے ہیں زندگی کی طرح زندگی سے ہم
ہجرت نہیں کریں گے مگر سوچ لیجیے
اُکتا گئے ہیں آپ کی اب بے رُخی سے ہم
کڑوے کسیلے تجربے سب یاد ہیں ہمیں
واقف ہیں زندگی کی ہر اک چاشنی سے ہم
پھولوں کی بات چھوڑیئے کانٹوں کے ساتھ بھی
آتے نہیں ہیں پیش کبھی دشمنی سے ہم
ہے جسم تو سیاہ مگر خون ہے سفید
کیسے رکھیں امید بھلا آدمی سے ہم
جس آگہی سے آدمی انساں نہ بن سکے
رہتے ہیں کوسوں دور اُس آگہی سے ہم
دل آئینہ صفت ہے کوئی اس میں شک نہیں
کرتے نہیں کلیم ضیاؔ چھل کسی سے ہم

ڈاکٹر خواجہ اکرام، نئی دہلی

اردو اور جدید تکنالوجی

عہد حاضر کی بیشتر ترقیات کا انحصار تکنالوجی پر ہے۔ اس انحصار کی نوعیت یہ ہے کہ اب یہ نہ صرف انسانی زندگی کے لیے بلکہ دیگر تمام شعبہ حیات کے لیے بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ انسانی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے وقت کے ساتھ ساتھ اسباب زندگی کے لیے ہمیشہ کوشش کی ہے اسی لیے تمدنی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ نئے وسائل حیات نے انسان میں خود کو ناگزیر بنایا ہے۔ یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے لیکن موجودہ دور کی بات ہی کچھ اور ہے ''ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی'' گذشتہ دہائیوں میں زمانے کی ترقی کی رفتار کو دیکھیں اور اس رفتار کی سرعت کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی رفتار نے صدیوں کی رفتار کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ عرصۂ دراز سے انکشافات اور ایجادات کا سلسلہ جاری ہے لیکن ماضی کی دو دہائیوں میں آج کے انسان نے جو کرشمے کر دکھائے ہیں وہ حیرت و استعجاب کا باعث ہیں۔ سلیمان کی انگوٹھی اور علاء الدین کے چراغ جیسے حیرت انگیز کرشمے آج کے کمپیوٹر میں موجود ہیں اور ذخائر کو چھوٹی جگہ اور ڈیوائس مثلاً کمپیوٹر کے ہارڈ ڈسک، سی ڈی، ڈی وی ڈی اور پین ڈرائیو میں محفوظ کرنے کی صلاحیت عمرو عیار کی زنبیل سے کم نہیں ہے۔ ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ ہم 90 کی دہائی کو معلومات کے انقلاب کی دہائی کہتے تھے، زیادہ دن نہیں گذرے کہ اس ترقی نے دنیا کے حجم کو سمیٹ لیا اور ہم نے اسے گلوبل ویلیج کہنا شروع کیا اور اسے الیکٹرونک عہد سے موسوم کرنے لگے، پھر جلد ہی اسے ڈیجیٹل عہد کہا جانے لگا اور اب اسے سائبر ایج سے بھی موسوم کرنے لگے ہیں۔ ترقی کی اس رفتار کو کس نام سے موسوم کریں یہ بھی اب شاید نئے لفظ کا متلاشی ہے کیونکہ آج کی تکنالوجی نے روشنی اور ہوا کی رفتار کو بھی پیچھے چھوڑنے کا عزم کر لیا ہے۔ آج کے عہد کی ترقی کا یہ عالم ہے ہر دن ایک نئے تجربے اور ایجاد کا دن ہوتا ہے۔

یہ تمام ترقیات کمپیوٹر کے دوش پر سوار ہو کر آ رہی ہیں۔ کمپیوٹر ایک ایسا آلہ ہے جو آپ کو ڈاٹا ان

پٹ کرنے، جلدی اور صحیح طریقے سے ڈاٹا پروسیس کرنے، نتیجہ نکالنے اور ڈاٹا کو جمع کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس طرح سے کمپیوٹر ایک یا ایک سے زیادہ ان پٹ، آؤٹ پٹ، اور ایک پراسیسنگ اکائی پر مشتمل ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کی تین بنیادی خصوصیات ہیں؛ تیز رفتاری، درستگی اور مستعدی، کمپیوٹر بہت ہی مستعدی سے ہمیشہ بلا کسی رکاوٹ کے کام کرتا رہتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح اکتاتا اور تھکتا نہیں ہے۔ کمپیوٹر کے ارتقائی مراحل کو کمپیوٹر جنریشن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہر جنریشن میں کمپیوٹر ٹکنالوجی نے ترقی کی نئی منزلوں کو چھوا ہے، پہلے بڑے بڑے آلات اور مشینیں ہوتی تھی اب یہ ہتھیلیوں میں سما جانے والی مشین کی شکل میں بھی ہمارے سامنے ہے، جو نہایت کفایتی اور سستے داموں میں بھی دستیاب ہیں۔

عہد حاضر میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیات نے میڈیا کو بھی نئی پہنائیوں سے روشناس کرایا اور روایتی میڈیا کو الیکٹرانک میڈیا کے زرق برق لباس سے مزین کیا۔ ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا کہ ہم ٹی وی کو ایڈیٹ باکس کہا کرتے تھے اور اب یہ عالم ہے کہ ٹی وی پر دنیا جہان کی اتنی چیزیں موجود ہیں کہ آپ دیکھ بھی نہیں سکتے۔ بلکہ اپنی ترجیحات بھی طے کر لیں تب بھی معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ صرف اس میڈیم میں موجود ہے کہ آپ سب تک پہنچ بھی نہیں سکتے۔ اردو کے حوالے سے اس میڈیم میں اگرچہ بہت کام نہیں ہو رہے ہیں۔ دوردرشن کا ڈی ڈی اردو اب بھی ای ٹی وی اردو سے پیچھے ہے۔ سہارا کا عالمی اردو چینل، ذی نیٹ ورک کا ذی سلام جیسے اردو چینل ناظرین کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔

اسی طرح الیکٹرانک میڈیا میں ریڈیو بھی ایک اہم میڈیم ہے جہاں پہلے سے زیادہ اور بہتر فری کوئینسز موجود ہیں، جو بیک وقت تفریح کے ساتھ ساتھ معلومات کی ترسیل کی خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔ حالانکہ ٹی وی کی ترقی کے بعد یہ کہا جانے لگا تھا کہ ریڈیو کا دور ختم ہونے کو ہے۔ لیکن یہ غلط ثابت ہوا اور ریڈیو نے زمانے کے رجحانات کے مدنظر نئی تبدیلیوں کو راہ دی۔ ایف ایم اور کمیونٹی ریڈیو سے لے کر اسپیس ریڈیو تک کا سفر اس کی نئی ترقیات کا اشاریہ ہے۔

الیکٹرانک میڈیا میں ایک بڑا میڈیم کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہے۔ یہ ایسا میڈیم ہے جو گلوبل ویلیج کے تصور کو بدل کر اسکرین کی شکل میں پیش کر رہا ہے۔ یہ سب انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی کے سبب ممکن ہو سکا ہے۔ IT کی وجہ سے مشکل ترین کام اور ایسے کام جو طویل عرصے کے متقاضی ہوتے تھے اب انسان کی معمولی مداخلت یا بغیر کسی مداخلت کے خودکار (Automatic) طریقے سے ہو رہے ہیں۔ کمپیوٹر پر مبنی اپلی کیشنز کا استعمال مختلف النوع طریقے سے ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ معیاری وقت (Time Real) میں درست اور بالکل جدید معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ معلومات کے یہ جدید وسائل نہایت سرعت سے معلومات بہم

پہنچاتے ہیں اور اسے دوسروں کے ساتھ اشتراک کے قابل بھی بناتے ہیں۔ان کی رسائی کا حال یہ ہے کہ یہ تکنیکی وسائل، زبان اور جغرافیائی حدود کی دیواروں کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ہمارے وہم وگمان سے بھی زیادہ رسائی رکھتے ہیں۔کیونکہ اگر آپ زبان نہیں بھی جانتے ہیں تو اس مشین میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ دنیا کی بڑی زبانوں کے ترجمے بھی کرتی ہے۔حالانکہ اس حوالے سے ابھی ان کو بہت کامیابی نہیں ملی ہے لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ وہ کسی بھی زبان کے متن کا مفہوم تو سمجھا دیتی ہے۔مشین ٹرانسلیشن کی یہ آسانی اپنے آپ میں بڑی بات ہے اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے میدان میں ایک اور انقلابی قدم ہے۔اس کی مدد سے تجارت کے لیے ان بازاروں کی تلاش کی جاسکتی ہے جہاں تک رسائی ممکن نہ تھی۔اسی طرح Online Classrooms کی تکنیک کی وجہ سے آپ جہاں بھی ہوں علم وفن حاصل کرسکتے ہیں یا کوئی معلم دنیا کے کسی کونے میں بیٹھ کر کسی بھی ملک بلکہ کئی ممالک اور علاقوں کے طلبہ وطالبات سے براہ راست رابطہ کرسکتے ہیں۔انفارمیشن کے جدید وسائل کی دریافت کے سبب ہی دنیا کی تسخیر کی راہیں ہموار ہوتی جارہی ہے۔خلا میں موجود سٹیلائٹ نے اب تک تمام تر امکانات کی تلاش نہیں کی ہے، جستہ جستہ یہ انقلاب ہماری زمین پر اتر رہی ہے اور انسانی زندگی کوئی تبدیلیوں سے ہمکنار کررہی ہے۔تاہم موجود ذرائع وسائل دنیا بھر میں ربط وتعلق کو نئی بلندیوں تک پہنچا رہی ہے۔دور دراز مقیم احباب کاروبر و باتیں کرنا اور تجارتی رفیق کار سے ہمہ وقت جڑے رہنا یہ سب ممکن ہے۔جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ تجارت کسی بھی وقت اور کہیں سے بھی ممکن ہے۔اس میں بازار کے کھلے رہنے اور تعطیل کا دن ہونے کے باوجود کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اس لیے آج کا یہ صارفی دور بہت تیزی سے ترقی کررہا ہے۔صرف اتنا ہی نہیں!یہ جدید تکنیکی وسائل تجارت سے لے کر سیاحت تک اور معاشرتی سرگرمیوں یعنی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں سرایت کرچکی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج ذاتی کمپیوٹر، سیل فونس، ای۔میل اور انٹرنیٹ ہماری زندگی کے ایک جزو لاینفک ہوچکے ہیں۔

موبائل کی ایجاد نے بھی ایک بڑا انقلاب برپا کیا تھا لیکن ابتدا میں یہ نہیں معلوم تھا کہ موبائل رابطے کی تمام سریع تر امکانات کے ساتھ ساتھ اور کئی انقلاب بھی اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ابتدا میں یہ محض وائر لیس ٹکنالوجی سے بات چیت کو آسان بنا رہا تھا مگر اب موبائل فون کمپیوٹر ٹکنالوجی سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔اس کی گوناگوں خصوصیات کے سبب روٹی کپڑا اور مکان کی طرح موبائل ہماری ضرورت کی چوتھی بڑی ضرورت بن چکا ہے۔تکنیکی سطح پر موبائل کی ترقی نے بھی ہماری سہولتوں کی کئی راہیں ہموار کی ہیں۔آئی فون (iPhone)، آئی پیڈ اور اینڈرائیڈ کی سروسز دنیا کو ہتھیلیوں میں سمیٹنے لگی ہے۔　آئی فون، انٹرنیٹ اور ملٹی میڈیا استعمال کرنے والا اسمارٹ فون کی ایک قسم ہے جس کو ایپل کمپنی نے جنوری 2007 میں ڈیزائن کیا

تھا۔اب یہ اسمارٹ فون موجودہ شکل میں آئی پوڈ(iPod)، ٹیبلیٹ ذاتی کمپیوٹر(PC Tablet)،ڈیجیٹل کیمرہ اور سیلولر فون کی ایک ملی جلی شکل ہے۔آئی فون کیمرہ فون کے مانند ہی کام کرتا ہے،اور یہ پیغام رسانی (Text Messaging)اور ویژول وائس میل کو بھی سپورٹ کرتا ہے۔ یہ ایک پورٹیبل میڈیا پلیر، انٹرنیٹ کلائنٹ،ای۔میل ویب براوزنگ اور Wi-Fi کنکٹیویٹی کے خدمات بھی انجام دیتا ہے۔اس کا ٹچ اسکرین صارف کو اور بالخصوص نئی نسل کو مزید اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔اس ٹکنالوجی کے سبب اب دنیا کی معلومات لوگوں کی ہتھیلیوں میں موجود ہے۔اسی کے ساتھ آئی پیڈ (iPad) کی ایجاد نے معلومات کا حصول اور بھی آسان بنا دیا ہے۔آئی پیڈ ایک ٹیبلیٹ کمپیوٹر ہے یہ آڈیو اور ویڈیو میڈیا جیسے کہ کتابیں، ماہنامے، فلمیں، میوزک، گیمس اور اسی طرح ویب کے مشمولات کیلئے ایک خاص پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسمارٹ فون کے مقابلے بڑا اور لیپ ٹاپ کمپیوٹر سے چھوٹا ہوتا ہے۔اسے ایپل کمپنی نے مارچ 2011 میں مزید وسعت دے کر آئی پیڈ2 (iPad2) کی شکل میں ریلیز کیا۔آئی پیڈ اسی آپریٹنگ سسٹم سے چلتا ہے جس سے آئی فون بھی چلتا ہے۔ یہ اپنا الگ اپلی کیشن چلا سکتا ہے اور وہ بھی جو آئی فون کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

موبائل ٹکنالوجی میں اس کے علاوہ دو بڑے اہم انقلاب بلیک بیری(BerryBlack)اور اینڈ رائڈ (Android) کی شکل میں ہوئے۔ بلیک بیری فون خصوصی طور پر ایک پیغام رساں فون (Messaging Phone) ہے جس کے اندر اسمارٹ فون کی طرح ہی سہل پیغام رسانی کی خصوصیات(Messaging Features)ہوتے ہیں۔بلیک بیری ایڈریس بک، کلینڈر اور ٹو-ڈو-لسٹ (To-do-List)جیسی صلاحیتوں کی فہرست بنانے کے لیے ذاتی ڈیجیٹل معاون کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ ایک میڈیا پلیئر کے حیثیت سے بھی کام کرتا ہے جس میں میوزک اور ویڈیو پلے بیک، کیمرہ پکچر، اور ویڈیو جیسی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ بلیک بیری بنیادی طور پر انٹرنیٹ ای میل بھیجنے اور موصول کرنے کی صلاحیتوں کے لیے جانا جاتا ہے۔اور اینڈ رائڈ ایک موبائل آپریٹنگ سسٹم ہے جس کی ترقی گوگل کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اینڈرائڈ آپریٹنگ سسٹم کی شہرت لگاتار بڑھتی جارہی ہے کیونکہ تمام اعلیٰ درجے کے اسمارٹ فونس اسی کا استعمال کرتے ہیں۔ اینڈرائڈ پلیٹ فارم کا استعمال مختلف اسمارٹ فون ہینڈ سیٹ بنانے والی کمپنیاں کرسکتی ہیں۔ معروف اسمارٹ فونس جو اینڈرائڈ استعمال کرتے ہیں وہ ہیں سیمسنگ گلیکسی (Samsung Galaxy)، گوگل نیکسس (Google Nexus)، ایچ ٹی سی ایوو(HTC Evo)، موٹورولا ڈرونڈ (Motorola Droid)، ایل جی آپٹیمس (LG Optimus)وغیرہ۔

اسمارٹ فون میں یہ تمام خوبیاں کمپیوٹر کے سبب ہی آسکی ہیں۔اسی لیے کمپیوٹر کی اپنی الگ اہمیت ہے۔اسمارٹ

فون اور کمپیوٹر کی ترقیات میں نینو ٹکنالوجی (TechnologyNano) کا بڑا ہاتھ ہے کیونکہ اس کی مدد سے آلات بہت چھوٹے بننے لگے ہیں۔ کمپیوٹر کا حال یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والی اضافی چیزیں بھی بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ایک چھوٹے سے پین ڈرائیو یا ہارڈ ڈسک میں آپ چاہیں تو ہزاروں کتابیں رکھ لیں اور چاہیں تو تفریحی فلمیں محفوظ کرلیں۔ یہ آپ کے ذوق پر منحصر کرتا ہے کہ کس طرح کے ڈیجیٹل مواد کو رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اتنی بات تو آپ بھی مانتے ہیں کہ ترقی کی یہ صورت اور یہ ایجاد عجوبۂ روزگار ہے۔

اردو زبان کی تدریس اور سائبر اسپیس
ایک تحقیقی جائزہ
سائبر اسپیس اور اردو تدریس

اکیسویں صدی کی یہ دوسری دہائی ہے لیکن اس برق رفتار دنیا میں سرعت سے بدلتی تہذیبی اور لسانی اقدار کو دیکھ کر اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقتصاد اور طاقت وقوت کے دوش پر سوار مختلف اقوام اور ممالک کے لوگ اگر اپنی تہذیبی شناخت اور لسانی اقدار کو مضبوطی سے تھامے نہ رہیں تو عالمی نشیب و فراز کے ہلکے جھٹکے بھی انھیں گہری کھائی میں پہنچا دیں گے۔ ایسے وقت میں جب تمام اقوام و ملل اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہاں زبان وادب پر گفتگو چہ معنی دارد؟۔ کیونکہ صارفیت (Consumerism) کے اس دور میں دنیا نہ صرف ملٹی لنگول ہوتی جارہی ہے بلکہ علاقائی زبانوں کی اہمیت بھی بڑھ رہی ہے اور اردو کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے کسی علاقے سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ برصغیر کی وادیوں سے نکل کر سمندر کے دوسرے کناروں پر بسے ممالک میں بھی اس زبان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ تقریباً تمام براعظموں میں اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ رسم خط جاننے والوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔

مگر مقام شکر ہے کہ زمانے کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو کے اہل نظر اور صاحب بصیرت ادیبوں اور مفکروں نے ایسے لوگوں کے لیے جو اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے، مگر سمجھ اور بول سکتے ہیں، جن کا ذہنی معیار بہت بلند ہوتا ہے اور ان میں قوت اخذ بھی زیادہ ہوتی ہے، اُن کے لیے جدید سائنسی اصولوں کے تحت بیش قیمت کتابیں لکھی ہیں۔ مگر جس طرح دنیا کی کوئی چیز اپنے آپ میں مکمل نہیں، اسی طرح یہ کتابیں بھی کمی کا احساس دلاتی ہیں۔ باوجود اس کے وہ اس ضرورت کو کسی نہ کسی طرح پوری کررہی ہیں۔ اس لیے ان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن کتابوں کے حوالے سے اس مقالے میں بحث نہیں کی گئی ہے۔

یہاں میرا مقصود علم کے اس سمندر سے ہے جو زمین میں نہیں خلاؤں میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ سمندر آج کی دنیا کی ایسی ضرورت بن گیا ہے کہ اگر اس کی موجوں کے تلاطم سے کوئی تہذیب، خطہ، ملک یا قوم آشنا نہ ہوئی تو اس گلوبل ولیج میں شاید اس کی حصہ داری نہ رہے۔ جی ہاں! اسٹیلائٹ کے نظام پر مبنی تیزی سے گامزن دنیا کی تمام تر معلومات اور تمام تر امکانات اسی سمندر کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں۔ اس سمندر سے موتی وہی چن کر لائیں گے جو غوّاص اور شناور ہوں گے۔ عہد حاضر کی تمام ترقی اور تنزلی اسی سے منسوب ہے۔ لیکن گھبرانے کی بھی کوئی بات نہیں کیونکہ اس مضطرب اور تلاطم خیز سمندر تک رسائی آپ کی انگشت کی پوروں (Finger Tips) سے ہو سکتی ہے۔ کمپیوٹر کے Key Board پر انگشت رکھ کر دنیا اور دنیا کے تمام علوم وفنون اور ممکنہ معلومات آپ گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی سائبر اسپیس ہے اور یہی خلاؤں میں علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ سائبر اسپیس کی جو تعریف کی گئی ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

> "Cyberspace" is a term coined by a science fiction writer to describe the place where data is stored, transformed and communicated. Its meaning has broadened to include the full array of computer-mediated communications and interactions."

یعنی سائبر اسپیس عہد حاضر کا وہ خزانہ ہے جہاں علوم وفنون اور معلومات کا ذخیرہ پنہاں ہے۔ یہ ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے ہم آہنگی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ لیکن اردو زبان اور اہل زبان کے حوالے سے اگر سائبر اسپیس کا جائزہ لیں تو بر وقت یہ شعر یاد آتا ہے:

اے موج بلا ہلکے سے ذرا، دو چار تھپیڑے ان کو بھی
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

جی ہاں! ہم نے سائبر اسپیس کے امکانات کو خاطر میں نہیں لایا اسی لیے اردو تدریس کے حوالے سے جب کسی ایسے ویب سائٹ کی تلاش کرتے ہیں جو اردو زبان سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں پورے طور پر معاون ہو تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ (میں ان ویب سائٹس کی بات کر رہا ہوں جو مفت قابل حصول (Free Accessable) ہیں البتہ کئی Paid Sites ضرور موجود ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ حروف تہجی کی شناخت، لفظوں اور جملوں کی ساخت، قواعد اور فرہنگ سب کچھ انھوں نے مہیا کرایا ہے۔ مگر میں نے ان سائٹس کو اس مطالعے میں شامل نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے نام پر دنیا بھر میں کئی ایسے ادارے

موجود ہیں جن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس سمت میں کام کر رہے ہوں گے، یا کر لینا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ہندستان میں انجمن ترقی اردو اور صوبائی سطح پر مختلف اردو اکیڈمیاں موجود ہیں مگر انھوں نے اس سمت میں کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کے ویب سائٹس تو موجود ہیں مگر اکثر تو ایسے ہیں جو مہینوں تک Update بھی نہیں ہوتے۔ پاکستان میں البتہ اس سمت میں قابل قدر کوششیں ہوئی ہیں اور کئی ایسے سائٹس ہیں جو اردو سکھانے میں ابتدائی سطح پر معاون ہیں، لیکن یہ بھی بہت دور تک طالب علموں کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ محض چند اسباق اور حروف تہجی کی شناخت تک محدود ہیں۔

بی بی سی کا خود مختار ادارہ جو خبر رسانی کے سبب پوری دنیا میں اپنی شناخت اور اہمیت رکھتا ہے، اس کے سائٹس پر بھی Urdu Learning کی سہولت موجود ہے لیکن یہاں بھی روز مرہ کی ضرورتوں کے مدنظر محدود مکالمے اور حروف تہجی کی شناخت کے سوا اگر کچھ ہے تو Link Sites ہیں۔ لیکن اس سائٹس پر تجزیاتی گفتگو سے قبل بی بی سی کے Home Page پر جو چند جملے اردو زبان کے حوالے سے لکھے گئے ہیں اُن پر غور خوض کرنا زیادہ مناسب ہے تا کہ ہم اپنی زبان، اردو زبان کی وسعت کا اندازہ بھی کر سکیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

Why learn Urdu?

1. " It is a living language spoken by 490 million people around the world.

2. "The Urdu community in the UK numbers about one million speakers.

3. " It is not just a practical language spoken on a daily basis, but one that produced scholarships and poetry. *

پہلے جملے میں بی بی سی نے جو اعداد و شمار دی ہے، وہ قابل غور ہے کیونکہ ہر طرف اور کم از کم ہندستان میں بار بار یہ بات کہی جاتی ہے کہ اردو زبان ختم ہو رہی ہے اور اس کا مستقبل بہت روشن نہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ زبان کے زندہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بولنے والے کتنے ہیں۔ ہم اردو بولنے والے جب بھی اعداد و شمار کی بات کرتے ہیں تب یا تو سرحدوں کی لکیروں میں کھو جاتے ہیں یا اپنے ملک کے محدود رواج اور بے بنیاد اعداد و شمار پر صبر و سکون کر لیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ ایک تازہ ترین رپورٹ کے مطابق دنیا میں انگریزی کے بعد جس زبان نے وسیع علاقوں میں ہجرت کی ہے وہ اردو ہے۔ یعنی عالمی سطح پر اردو کو اس اعتبار سے دوسرا مقام حاصل ہے۔ اب ہماری توجہ اس بات پر ہونی چاہیے

کہ بی بی سی کے مطابق اردو بولنے والوں کی تعداد اگر 490 ملین ہے تو اس میں سے ایک ڈیڑھ سو ملین ایسے ضرور ہوں گے جو رسم خط سے واقف نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد ہندستان میں اور مغربی اور یوروپی ممالک میں زیادہ ہیں۔ پاکستان کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ لیکن مغربی اور یوروپی ممالک میں نئی نسل کی ایک بڑی تعداد ہے جو اردو تو بولتی ہے مگر پڑھ لکھ نہیں سکتی۔ یہ طبقہ جدید طرز تعلیم سے ہم آہنگ ہے۔ معمولی معلومات کے لیے بھی نئی نسل کے بچے انٹرنیٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ انٹرنیٹ ان کے تدریسی نظام کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ اس صورت حال کو ذہن میں رکھیں اور سائبر اسپیس کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اتنی بڑی آبادی کے لیے انٹرنیٹ پر اردو Learning کے لیے عربی فارسی لرنگ سائٹ کے مقابلے کا بھی کوئی سائٹ نہیں ہے۔ Google Search کے ذریعے جتنے سائٹ ہمیں ملے ہیں، ان کی فہرست اگر چہ طویل ہے مگر زیادہ تر سائٹس Similar ہیں یا Link Sites ہیں۔ Google Search میں حیرت انگیز طور پر اکتالیس لاکھ سائٹ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان تمام سائٹس کو ایک ایک کر کے دیکھنا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن TRP میں جو سائٹس اچھے ہیں۔ انہی کو بنیاد بنا کر ہم نے یہ مطالعہ کیا ہے اور موقع بہ موقع بعض ایسے سائٹس بھی دیکھے ہیں جو معیار بندی (Rating) میں بہت نیچے ہیں۔ بطور حوالہ چند اہم سائٹس پر اجمالاً گفتگو کی جا رہی ہے۔

bbc.co.uk/languages/other/guide/urdu: اس سائٹ پر حروف تہجی کو Audio Support اور رومن اسکرپٹ کے ذریعے درج کیا گیا ہے۔ لیکن صرف مفرد حرف کو بتایا گیا، مرکب حروف کا ذکر تک نہیں ہے۔ (1(a اس کے بعد Listen & learn: Urdu Key Pharses کے تحت روزمرہ کی ضرورت میں پیش آنے والے جملے درج ہیں ان جملوں کو رومن رسم خط میں لکھنے کے ساتھ ان کا انگریزی متبادل بھی درج کیا گیا ہے (1(b۔

userskynet.be: یہ ایک سہ لسانی (Tri lingual) سائٹ ہے جو Self Learning اصول کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے حروف تہجی درج ہیں (2a)۔ حروف کی مختلف شکلوں کو Initial, Medial, Final اور Detached کی درجہ بندی کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ (2b) بعد ازاں الگ الگ حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہے (2c) اور تلفظ کو ہندی، انگلش میں بھی بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد Short Vowel, Long Vowel اور مخصوص علامات (Special Sign) جیسے جزم، ساکن، ہمزہ وغیرہ کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد اسباق بھی دیے گئے ہیں۔ پہلے سبق میں چار خانوں کے تحت جملے بنانے کی ترکیب اور اس کا مفہوم انگلش میں دیا گیا ہے جسے سن کر بھی سمجھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ جملے بنانے کی ترکیب ایسی ہے جو

غیر اردو داں کے لیے بھی مفید ہے۔ سائٹ کی تیاری میں جدید تکنیک کا استعمال اس طرح کیا گیا ہے کہ تمام جملے اردو میں لکھے گئے ہیں لیکن جب کسی جملے پر کرسر (Cursor) رکھتے ہیں تو وہاں رومن اسکرپٹ میں وہی جملہ نظر آتا ہے اور اس کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ جملے کی ساخت میں اسماء، افعال، اور ضمائر کا استعمال آسانی سے سمجھ میں آجائے مثلاً: (2d)

۱۔ آداب عرض جناب۔ Greeting Sir!

Hello Sir!

۲۔ میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں University/in/Professor/am / I

I am Professor in the University.

باقی اسباق ابھی تیاری کے مراحل میں ہیں۔ بہر کیف اگر یہ سائٹ اسی جذبہ کے ساتھ Upload ہو گیا تو یہ بہت بہتر سائٹ ہوگا۔

ukindia.com: اس سائٹ میں پینٹ برش کی مدد سے حروف جس طرح لکھے گئے ہیں وہ ذوق جمال کو مجروح کرتے ہیں ضمیمہ نمبر 3 (3a)۔ اس کے علاوہ حروف میں یکسانیت نہیں آپاتی ہے۔ اعراب کا اہتمام اور مختلف حروف سے لفظوں کی ساخت بہت بہتر طور پر نہیں سمجھائے گئے ہیں اور نہ ہی Audio Support کے ذریعے ان آوازوں سے آشنا کرانے کا اہتمام ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ لفظوں کے لکھنے میں بھی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً فیئر کو فر لکھا گیا ہے (3b) اس میں شوشہ غائب ہے اور ہاف کو شوشہ کے ساتھ لکھا گیا ہے (4c)۔ یہ ایک مثال ہے مگر ایسی کئی غلطیاں موجود ہیں۔ اسی طرح تحریر میں حروف کے درست مقام (Placing) کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ (4d) اور جہاں بڑے جملے لکھے گئے ہیں وہاں رومن حروف کو بھی اُلٹا لکھا گیا ہے (4e)۔ مثال ملاحظہ فرمائیں:

وگی سُوچ ڈوڈیواُون

i.k.k.i.v ch.i.v.s the o.y.d.io n.o

آپ غور کریں کہ یہاں جو متبادل دیے گئے ہیں وہ کیسے ان حروف کی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ بہر کیف یہ ایک کوشش تو ضرور ہے مگر کیا ایسی کوششیں مثبت ہیں؟ اس سوال اس کا جواب قارئین کے لیے چھوڑتا ہوں۔ بہر کیف یہ سائٹ کئی اسباق پر مشتمل ہے جن کو Zipped Format کے تحت رکھا گیا ہے۔

pakdata.com: یہ سائٹ اس اعتبار سے بہت بہتر ہے کہ اس میں نستعلیق کا استعمال ہوا ہے۔

نستعلیق کا فونٹ کمپیوٹر کی اردو تحریر کے لیے سب سے دلکش ہے۔ سائٹ کے منتظمین حالانکہ اردو نستعلیق اور اردو سافٹ ویئر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کے پاس یہ صلاحیتیں موجود ہیں کہ وہ اردو سکھانے کے بہتر سے بہتر سائٹ بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے جو قابل استعمال لنک (Accessable Link) کی سہولت فراہم کر رکھی ہے وہ جدید طرز اور پرکشش نستعلیق رسم خط میں موجود ہے۔ تمام حروف تہجی کو خوبصورت اور مزین طریقہ سے Home Page پر رکھا گیا ہے ضمیمہ نمبر 4 اور کسی بھی حرف پر کلک کرنے سے وہ حرف بلیک بورڈ پر لکھتے ہوئے دکھائی دے گا۔ (4a) اس عمل سے نو آموز کو آسانی ہوتی ہے وہ حروف کو لکھنے کے صحیح طریقے سے واقف بھی ہو جاتا ہے۔ اور اسی صفحے پر دوسری جانب تصویر کی مدد سے لفظ اور معنی کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس کے آگے مفت قابل حصول (Free Accessable) اسباق نہیں ہیں۔ البتہ ان کے سائٹ پر قواعد اور لغت کے سافٹ ورژن موجود ہیں جنھیں خرید کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

www.languageshome.com: یہ سائٹ مختلف زبانوں کے حوالے سے بنایا گیا۔ اس سائٹ میں کئی ہندستانی زبانیں شامل ہیں۔ Urdu Learn کے حوالے سے جو پہلا صفحہ ہے، اس صفحے پر ضمیمہ نمبر 5 English Urdu کے عنوان سے رومن اسکرپٹ میں انگریزی کے الفاظ اور جملے لکھے گئے ہیں اور دوسری جانب اس کے معانی دیے گئے ہیں۔ اس سائٹ کی خامی یہ ہے کہ یہ اغلاط سے مبرا نہیں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

انگلش کا جملہ	اردو ترجمہ
He eats an apple.	(Woh sev khaatein hai)
He has eaten.	(Woh khaa chukhey)

صرف ان دو جملوں کو دیکھیں تو پہلے جملے میں اردو کے "وہ" کو ہندی کے "وَہ" کا تلفظ دیا گیا ہے۔ اور ہندی ہی کی طرح 'سیب' کو "سیو" لکھا گیا ہے اور 'چکے' کو 'چھکے' لکھا گیا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اسلامی سائٹ بھی ہیں جو عربی، اردو سیکھنے اور سکھانے کے اعتبار سے اہم ہیں۔ مگر ان کا دائرہ بھی محدود ہے۔ مختصر یہ کہ اردو سیکھنے کے بہت سے سائٹ ہیں، جن کی تعداد ہزاروں میں ہیں مگر زیادہ تر سائٹ محض حرف اور زبان کی بات کر کے سرسری گزر جاتے ہیں یا وہ Group Chat کے سائٹ ہیں یا معمولی معلومات مہیا کراتے ہیں۔ جدید ترٹکنالوجی کا استعمال اور انٹرنیٹ کے ذریعے اردو زبان کے سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں جو تساہلی برتی جا رہی ہے وہ باعث تشویش ہے۔ میں فارسی زبان سیکھنے کے لیے بنائے گئے ایک سائٹ کی مثال دینا چاہوں گا۔ easypersian.com کے نام کا سائٹ 157 سباق پر مشتمل ہے

اورمفت قابل حصول ہے ، جو انگریزی زبان کے ذریعے فارسی سیکھنے کا بہترین سائٹ ہے۔ اس میں Audio کی مدد سے تلفظ اور ادائیگی پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔اس سائٹ کو اسباق کے لحاظ سے ہفتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔زبان سیکھنے میں جو بھی عناصر معاون ہوتے ہیں حتی الامکان ان کا خیال رکھا گیا ہے۔اردو میں بھی اس طرح کے سائٹ بنانے کی ضرورت ہے۔ایسے سائٹ کی موجودگی سے نئی نسل کی بڑی آبادی اس سے مستفید ہو سکے گی۔

اردو کونسل کی ویب سائٹ پر موجود آن لائن ڈیجیٹل لرننگ پروگرام اردو زبان کی تدریس کا بے حد موثر پروگرام ہے۔اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ پروگرام Self- Learning Method کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے اور آڈیو ویژول (Audio-Visual) فورمیٹ میں ہے۔ یہ پروگرام درج ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

- Script Lesson
- Structure Lesson
- Anthology
- History of Urdu Literature
- Land & People

پہلا باب Script Lesson اردو رسم الخط کی تدریس سے متعلق ہے اور اس کے لیے گرافک السٹریشن کی مدد لی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ حروف اور الفاظ کے تلفظ کی صحیح ادائیگی میں بھی قاری کی مدد کرتا ہے۔اس باب میں کل ستائیس اسباق ہیں جو حروف تہجی، تنوین، ہندسوں وغیرہ کا احاطہ کرتے ہیں۔

دوسرا باب Structure Lesson جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اردو قوائد کے مطابق اردو بول چال کی تدریس پر مبنی ہے۔اس باب میں پچیس اسباق ہیں۔ جو مختلف مواقع کے اعتبار سے قاری کو اردو بول چال کا درس دیتا ہے۔اس میں بھی Illustration کا بہت عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔

تیسرے باب Anthology کے دو حصے ہیں نثر (Prose) اور شاعری (Poetry)۔حصۂ نثر میں انشائیہ کی تعریف کے علاوہ سولہ 16 اسباق ہیں جو درج ذیل ہیں۔ اس باب میں بھی وائس اوور کی مدد سے متن کی قرأت سے قاری کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

1	غالب کے لطیفے	اسد اللہ خان غالب
2	مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ	کنہیالال کپور

3	کتے	پطرس بخاری
4	ایک بار الیکشن میں	رشید احمد صدیقی
5	مچھر	خواجہ حسن نظامی
6	اچھی کتاب	عبدالحق
7	تعصب	سر سید احمد خاں
8	آرام کی قدر مصیبت کے بعد ہوتی ہے	شیخ سعدی
9	قصہ حاتم طائی	میر امن
10	کابلی والا	رابندر ناتھ ٹیگور
11	احسان کا بدلہ احسان	ذاکر حسین
12	بھولا	راجندر سنگھ بیدی
13	چندرو کی دنیا	کرشن چندر
14	دو بیل	پریم چند
15	امراؤ جان ادا	مرزا ہادی رسوا
16	محلے کی ہولی	اطہر پرویز

دوسرا حصہ جو شاعری کا ہے اس میں نظموں اور غزلوں کے الگ الگ زمرہ جات ہیں جن کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

نظمیں

1	ساری دنیا کے مالک	الطاف حسین حالی
2	ہمارا وطن	برج نرائن چکبست
3	پرندے کی فریاد	علامہ اقبال
4	آدمی نامہ	نظیر اکبرآبادی
5	برسات	اسمٰعیل میرٹھی
6	مٹی کا دیا	الطاف حسین حالی

7	بچے کی دعا	علامہ اقبال
8	بادل اور تارے	تلوک چند محروم
9	خواب بسیرا	فیض احمد فیض
10	نوالہ	علی سردار جعفری
11	قبر	اختر الایمان
12	ہم بادل کہلاتے ہیں	جگن ناتھ آزاد
13	شام	جوالا پرشاد برق لکھنوی

غزلیں

1	(ا) الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا	میر تقی میر
	(ب) چلتے ہیں تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے	
2	ابن مریم ہوا کرے کوئی	مرزا غالب
3	نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی	مرزا داغ دہلوی
4	آپ کی یاد آتی رہی رات بھر	مخدوم محی الدین
5	رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر	ناصر کاظمی تیسرا

تیسرا باب جس کا عنوان History of Urdu Literature ہے دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں A Historical Perspective of Urdu کے عنوان سے انگریزی میں ایک مضمون ہے جو ہندستان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے جبکہ دوسرے حصے میں سید احتشام حسین کی ایک کتاب "اردو کی کہانی" موجود ہے جس کے بشمول دو دیباچے اور سولہ ابواب ہیں۔

پانچواں باب جو Land & People کے عنوان سے ہے ابھی زیر تعمیر ہے اور یہ باب ان خطوں کی طرز زندگی سے متعلق دستاویزی فلموں پر مبنی ہوگا جہاں اردو بولی جاتی ہے۔

امکانات اور تجاویز

اس وسیلے کو اردو ادب اور زبان دونوں حوالوں سے استعمال کرنے کی بہت زیادہ گنجائشیں موجود ہیں۔ادب کے حوالے سے تو جو کام اب تک کیے گئے ہیں یا جو کچھ سائبر اسپیس میں موجود ہیں وہ تشفی بخش

ہیں۔اردو ادب کی ڈیجیٹل لائبریری، ادبی وتہذیبی رسالے، اخبارات اور کتابیں وغیرہ کے مختلف سائٹس موجود ہیں۔لیکن اسے آخری منزل نہ تصور کیا جائے کیونکہ:

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
اسی روز وشب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان ومکاں اور بھی ہیں

علامہ اقبال کی دور بینی ملاحظہ فرمائیں کہ جب انھوں نے یہ کہا تھا کہ ''تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں'' توان کے سامنے کیا تصورات رہے ہوں گے۔اس وقت تو انسان چاند پہ بھی نہیں پہنچ سکا تھا لیکن اگر آج وہ ہوتے تو یقیناً فضاؤں کی جگہ خلائیں کہتے۔اب اگر ہمیں رو بہ عروج رہنا ہے تو خلاؤں کی سیر تو ضروری ہی ہے مگر اس کا مطالعہ اور تحقیق ناگزیر ہے۔اس لیے اس سمت میں مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ہر میڈیم سے ہم آہنگ رہے۔

زبان کی تدریس کے لیے سائبر اسپیس کے استعمال کی جہاں تک بات ہے تو یہاں وسائل بے شمار ہیں اور طریقے بھی ہزار ہیں۔آڈیو، ویڈیو اور ڈیجیٹل تکنیک کی مدد سے ہم ان مسائل پر بھی قابو پا سکتے ہیں جو عام طور پر نو آموز طلبا کو پڑھانے میں پیش آتے ہیں۔ان میں سے دو مسائل بہت ہی اہم ہیں۔

1۔تلفظ کا مسئلہ

2۔رسم خط کا مسئلہ

تلفظ کا مسئلہ

یوں تو ہر نئے سیکھنے والے کے لیے رسم خط ایک مسئلہ ہوتا ہے مگر اردو رسم خط کے جو مسائل ہیں ان کی نوعیت جداگانہ ہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر زبان کی اپنی مخصوص آوازیں ہوتی ہیں اور یہی آوازیں لفظ بن کر مخصوص تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں۔جن طالب علموں کو ذہن میں رکھ کر تلفظ کے مسئلے پر بات ہو رہی ہے وہ بہت حد تک اس مخصوص تہذیب اور اس زبان کی آوازوں سے واقف ہوتے ہیں البتہ چند آوازیں ایسی ہیں جن میں تمیز کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔جن کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔

1۔ایسے طالب علم عام طور پر ''ج'' اور ''ز'' کی آوازوں کو تو ضرور جانتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کی ادائیگی وہ صحیح طور پر نہیں کر پاتے یا ان میں تمیز نہیں کر سکتے۔لیکن یہ دشواری تمام طالب علموں کے ساتھ نہیں کیونکہ ان میں سے تقریباً سبھی ایسے ہوتے ہیں جو انگریزی جانتے ہیں۔اس لیے J اور Z کے فرق کو محسوس

تو کرتے ہیں مگر اسے اپنی گفتگو میں کس قدر برتتے ہیں یہ الگ مسئلہ ہے۔ اردو رسم خط میں Z کی آواز کے لیے بالترتیب ذ۔ز۔ض۔ظ چار حروف ہیں۔ یہ آوازیں ان کے لیے کیوں کر پریشان کن ہوتی ہیں اس پہلو پر غور فرمائیں۔ ان چاروں آوازوں (ذ۔ز۔ض۔ظ) کے فرق کو ہم اور آپ بخوبی اپنی تحریروں میں ملحوظ رکھتے ہیں مگر کیا بول چال کی زبان میں خود اہل زبان ان آوازوں کے فرق کو نمایاں کر پاتے ہیں؟ میں قطعی طور پر نفی یا اثبات میں کچھ نہیں کہتا مگر آپ کسی ایسے جملے کو لیں جس میں یہ مختلف آوازیں شامل ہوں مثلاً ''استاد اگر اپنی ذمہ داریوں اور اپنے فرائض کو سمجھتے ہیں تو مجال ہے کہ کوئی نظر بھی اٹھا سکے یا باز پرس کی ہمت کرے۔'' آپ خود اس جملے کو دہرائیں۔ اس جملے میں ذ، ز، ض، ظ، اور ج یہ پانچوں آوازیں موجود ہیں مگر بیشتر حضرات کے تلفظ سے سوائے 'ج' اور 'ز' کے کوئی فرق نمایاں نہیں ہوگا۔

2۔ اسی طرح 'ع' کی آواز کو دیکھیں جب ہم جمعہ، وعدہ، طبیعت، جمع وغیرہ بولتے ہیں تو کیا 'ع' کی آواز کو پورے طور پر واضح کر پاتے ہیں۔

3۔ یا خطاب، خطا، خط، اور تماشہ، تمام، تاریک وغیرہ میں تلفظ کے لحاظ سے 'ط' اور 'ت' میں کیا فرق کرتے ہیں؟ نئے سیکھنے والوں کے لیے یہی پریشانی کا سبب ہوتا ہے کیونکہ جو چیزیں Practice میں ہوتی ہیں ان کا سیکھنا اور سکھانا آسان ہے لیکن جو Practice میں نہیں ہیں ان کا سیکھنا سکھانا دونوں مشکل ہے۔ اسی لیے نوخواندہ اور نوآموز طلبا اکثر پوچھتے ہیں کہ ایک ہی حرف کے لیے اتنے حروف کی کیا ضرورت ہے؟ انھیں مطمئن کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جب تک اُن کو اِن آوازوں کے طریقِ ادائیگی اور مخارج کی باریکیوں سے بخوبی واقف نہ کرایا جائے وہ مطمئن نہیں ہوں گے اور یہی باریکیاں اردو کی نزاکتیں بھی ہیں اور حُسن بھی لہٰذا یہ مسئلہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ اگر ہم اردو میں بھی انگریزی کی طرح ہجے (Spelling) کے طریقے کو رائج کر سکیں تو مناسب ہوگا جس طرح انگریزی پڑھتے وقت طالب علم Station اور Passion کے سلسلے میں اساتذہ سے یہ سوال نہیں کرتے کہ 'tion' اور 'ssion' دونوں ''شن'' کیسے پڑھا جاتا ہے۔ اگر اردو میں یہ رواج مستحکم ہوگئی تو یہاں بھی سوالات کم ہونے لگیں گے۔ انٹرنیٹ پر بھی ابتدا میں ہی اس بات کی وضاحت کر دی جائے تو طلبا کا ذہن شروع سے بن جائے گا۔ ساتھ ہی سمعی اور بصری امداد کا استعمال کرنے سے خفیف سے خفیف فرق کو بخوبی سمجھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر نقشے یا تصویر کی مدد سے مخارج کی بھی نشاندہی کی جائے تو تلفظ کا مسئلہ بہت حد تک کم ہو سکتا ہے۔

رسم خط کا مسئلہ

اردو رسمِ خط کے سلسلے میں بھی اسی طرح کی پریشانیاں سامنے آتی ہیں مثلاً زبان کی تدریس میں

بولنے، سننے اور پڑھنے کے علاوہ لکھنے کا عمل بھی نہایت اہم ہے جس پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیئے۔ اردو چونکہ مختلف طریقوں سے لکھی جاتی ہے مثلاً خطِ نسخ، خطِ شکستہ اور نستعلیق وغیرہ ساتھ ہی کتاب کی تحریر اور ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر میں بھی کافی فرق ہوتا ہے جو طلبہ کے لیے پریشانی کا سبب ہوتا ہے۔

1۔ اس کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ الفاظ کی شناخت کا بھی ہے کیونکہ وہ جس رسم خط کو جانتے ہیں میری مراد ہندی اور انگریزی سے ہے، یہاں الفاظ جداگانہ طور پر بآسانی پڑھے جاسکتے ہیں کیونکہ ہندی میں ایک لفظ کے مختلف حروف کے اوپر ایک لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ اس طرح ایک لفظ دوسرے لفظ سے واضح طور پر الگ ہو جاتا ہے اور انگریزی میں ایک لفظ اور دوسرے لفظ کے درمیان مناسب فاصلہ ہوتا ہے اور ایک لفظ کے تمام حروف باہم مربوط ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی اگرچہ اس طرح کا اہتمام ہے مگر بہت واضح نہیں بالخصوص مرکب الفاظ میں اور بعض اوقات ہم شکل حروف و الفاظ میں قرأت کی پریشانی تو بہر حال ہوتی ہے مثلاً ''یہ منزل دور و دراز اور بہت کٹھن ہے۔'' اس جملے میں ''دور و دراز اور'' کو پڑھنے میں نئے طالب علموں کو کئی طرح کی پریشانی ہوتی ہے۔ اول تو یہ کہ کون سے حروف ایک دوسرے سے مل کر پڑھے جائیں گے اور کون سے حروف مصوتے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر اصل مقصد تو اس طرح کے مسائل کا حل پیش کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اگر مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے تو اس طرح کے مسائل کے حل میں مدد مل سکتی ہے۔

2۔ ابتدائی سطح کے اسباق کی تیاری میں یہ خاص اہتمام کیا جائے کہ ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے درمیان مناسب فاصلہ ہو۔

3۔ اعراب یعنی مختلف آوازوں کے لیے جو علامتیں مخصوص ہیں ان کا خصوصی طور پر اہتمام کیا جائے۔ اور ابتدائی سطح کے کم از کم بیس اسباق ایسے ہوں کہ ان میں اعراب کا اہتمام کیا گیا ہو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ان کے پاس الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور وہ الفاظ ان کو ازبر بھی ہو جائیں گے اس کے بعد اگر نو آموز طلبہ کے سامنے ایسی تحریر آئے گی جن میں اعراب کا استعمال کم سے کم بھی ہو تو اسے پڑھنے میں انھیں اتنی پریشانی نہیں ہوگی۔

4۔ اردو کی ایسی آوازیں جو ان کے لیے بالکل نئی ہیں اور جن کی ادائیگی میں بھی خفیف فرق موجود ہے اسے سکھانے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کی آوازوں پر مشتمل الفاظ کی زیادہ سے زیادہ مشقیں تیار کرائی جائیں تاکہ ان کی ہجے انھیں یاد ہو جائیں اور اس طرح کے الفاظ کی شکلیں ان کے ذہن نشیں ہو جائیں۔

ان نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ماہرین لسانیات، تکنیکی ماہرین اور سافٹ ویئر انجینئرس کے مفید مشوروں کے ساتھ اگر Urdu Learning کے سائٹس بنائے جائیں تو شاید بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔

راشد اشرف، کراچی (پاکستان)

''مکتوباتِ یگانہؔ'': سعی بے بدل

بین الاقوامی ادبی جریدے سہ ماہی ''اردو'' کے مدیرِ اعلیٰ، نقاد، محقق، شاعر، ادب میں منفرد شناخت قائم کر چکے ہندوستان کے وسیم فرحت کارنجوی (علیگ)، مرزا واجد حسین یگانہ المعروف یاس یگانہ چنگیزی کے مداح ہیں۔ ایسے پرخلوص مداح کہ بات محض ان سے عقیدت تک ہی محدود نہ رہی بلکہ وسیم فرحت یگانہ پر ایک ایسا تحقیقی کام کرنے کی ٹھان بیٹھے جس کا ابھی محض پہلی کتاب کی صورت آغاز ہی ہوا ہے اور اس شان سے کہ قارئین نے اس سلسلے کی مزید کتابوں کا بے چینی سے انتظار شروع کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ ہے 'مکتوباتِ یگانہ' کا جو بمثل ہراول دستہ، اردو پبلیکیشنز، ولگاؤں روڈ، امراوتی ہندوستان سے چند ہی ماہ قبل زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔ ابھی تو آپ انتظار کیجیے ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ''یگانہ چنگیزی۔ تحقیق و تجزیہ'' کا اور اس کے بعد ''نگارشاتِ یگانہ'' اور پھر ''یگانہ آرٹ'' جن کی اشاعت کے بعد یقیناً وسیم فرحت کارنجوی یگانہ پر ایک اور اہم اتھارٹی تسلیم کر لیے جائیں گے۔ وسیم فرحت سے قبل مشفق خواجہ مرحوم نے پورے تیرہ برس 'کلیاتِ یگانہ' کو مرتب کرنے میں صرف کیے تھے۔

کل ایک سو ستاون مکتوبات پر مشتمل ''مکتوباتِ یگانہ'' چھ ابواب میں منقسم ہے۔ باب اول میں لالہ دوارکا داس شعلہ کے نام مکتوبات، باب دوم میں ضیاء احمد بدایونی، دل شاہ جہاں پوری، راغب مراد آبادی، رفیق بدایونی اور مالک رام، باب سوم میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، قاضی امین الدین جبکہ باب چہارم میں بلند اقبال، آغا جان، حیدر بیگ، الطاف حسین، من موہن تلخ، رضا انصاری اور زیبا ردولوی کے نام لکھے گئے مکاتیب شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ باب پنجم میں یگانہ کے خطوط کی نقول دیکھی جا سکتی ہیں آخری باب ششم میں اعتراف فن یگانہ میں علامہ اقبال، جوش، فہیم گوالیاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی آراء شامل کی گئی ہیں۔ ''مکتوباتِ یگانہ'' محض مکتوباتی مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس دو سو ساٹھ صفحاتی کتاب سے مکمل حیاتِ یگانہ قارئین کے سامنے آ جاتی ہے۔ کتاب ہٰذا میں یگانہ کی نصف زندگی ان کے خطوط سے اور ما بقیہ نصف زندگی وسیم فرحت کارنجوی کے مدلل حواشی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اردو ادب کے تا حال شائع شدہ مجموعہ ہائے مکاتیب میں یہ طرز اب سے پیش تر نہیں دیکھی گئی۔ میرزا محمد عسکری کی 'خطوطِ غالب' ہو یا صفدر میرزا پوری کی 'مرقع

ادب' یا پھر احسن اللہ خاں ثاقب کی 'مکاتیبِ امیر مینائی' کسی ایک میں بھی تفہیم و ترسیل کا وہ انداز نہیں جو ''مکتوباتِ یگانہ'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میرا مطمح نظر یگانہ چنگیزی کا غالب، امیر مینائی وغیرہ سے تقابل ہرگز نہیں اور نہ ہی محمد عسکری، احسن اللہ ثاقب کا وسیم فرحت کارنجوی سے مقابلہ مقصود ہے۔ کہنا صرف یہی ہے کہ مکتوب نگار کی کلّی حیات اب تک ان کے مجموعۂ خطوط سے سامنے نہ آسکی تھی، اور یہی بنیادی وصف ''مکتوباتِ یگانہ'' کو بہتیروں سے منفرد کرتا ہے۔

یاس یگانہ چنگیزی پر ہونے والے تحقیقی کاموں (ام فل اور پی ایچ ڈی) کی تفصیل یہ ہے۔ یہ تفصیل ۲۰۰۸ تک کیے گئے تحقیقی کاموں کے ایک ریکارڈ بعنوان ''جامعات میں اردو تحقیق از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی'' سے اخذ کی گئی ہے۔ اس کے مطابق:

پٹنہ سے عبدالرشید نے تحقیقی کام کیا۔

محمد کمال خان نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ''یگانہ چنگیزی کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ نجیب جمال نے ۱۹۸۹ میں، ملتان یونیورسٹی سے ''یگانہ۔ فن اور شخصیت'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی مکمل کی۔

۱۸۸۴ میں عظیم آباد میں پیدا ہونے والے مرزا واجد حسین یگانہ نے ۱۹۵۶ میں لکھنؤ میں انتقال کیا تھا۔ ۷۲ برس کی اس عمر میں غالب شکن کہلائے جانے والے یگانہ نے کیا کیا نہ دیکھا، کیسے کیسے معرکے نہ لڑے۔ واجد حسین کے نام کے ساتھ چنگیزی کا لاحقہ جڑا ہوا تھا۔ چنگیز خان سے ایسی قربت تھی کہ انہوں نے اپنی کتاب 'آیاتِ وجدانی' کا انتساب بھی چنگیز خان کے نام کیا تھا۔ چنگیز خان کا جب دم نکلا تھا تو اس کے اردگرد جاں نثاروں کی ایک فوج تھی، اولادوں کی بھرمار تھی، منکوحہ شاید تعداد میں اتنی نہ رہیں ہوں مگر غیر منکوحاؤں کا شمار نہ تھا۔ واجد حسین بھی کہنے کو چنگیزی تھے لیکن افسوس کہ وقتِ دم آخریں تمام عمر اتر پردیش تا پنجاب، اپنے دشمنوں سے چومکھی لڑنے والے اس ضعیف شخص کا یہ حال تھا کہ اس کی اکلوتی بیوی اس کو چھوڑ کر پاکستان جاچکی تھی، وہ دمے کے مریض تھے، لکھنؤ شہر پورے کا پورا ان کا دشمن ہو چکا تھا، اس شہر میں وہ مرتد کہلائے جانے لگے تھے، اس عمر میں جب یگانہ کو پل پل اپنی بیوی کی ضرورت تھی، وہ ان کے پاس موجود نہ تھی۔ ایسے میں وہ ہوا جس کی امید یگانہ کو ہرگز نہ رہی ہوگی۔ ایک گروہ نے ان کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا اور شہر بھر میں یگانہ کی رسوائی کا سامان کیا گیا۔ یہ تابوت میں آخری کیل تھی۔ اہل لکھنؤ کی اس غیر انسانی حرکت کے بہت کم عرصے بعد ایک روز نصف شب یگانہ نے رختِ سفر باندھا اور تمام دکھوں سے نجات پا گئے۔

شعری نقد و انتقاد، عمیق طرزِ تحقیق، لسانیاتی مقالات، خوش فکر شاعری اور اچھوتے مضامین سے

چونکا دینے والے ادیب جناب وسیم فرحت کارنجوی، یگانہ کو اپنا معنوی استاد کہتے ہیں۔ ان کے والد خلیل فرحت کارنجوی مرحوم کو یگانہ سے ایک تعلق خاطر تھا۔ بقول فرحت، ان کے والد یگانہ کی حق پرستی بصورتِ خودپرستی کو خوب سمجھتے تھے اور سمجھاتے بھی تھے۔ وسیم فرحت کارنجوی نے 'مکتوباتِ یگانہ' تو مرتب کی ہی، ساتھ ہی انہوں نے کڑی محنت کے بعد کتاب کے حواشی بھی ترتیب دیے۔ یہی اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ قاری کو ہر مکتوب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس کے متن سے آگاہی ہوتی چلی جاتی ہے، پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ کام وہی کرسکتا ہے جس کی نظر سے یگانہ کی حیات کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہا ہو۔ کتاب ہٰذا میں شامل تفصیلی وصراحتی حواشی، طویل مقدمہ و ماخذ تک رسائی، ان تمام باتوں کے پیش نظر وسیم فرحت کارنجوی علیگ کی مبادیاتِ تحقیق سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ پوری کتاب میں کہیں بھی مرتب کی جانب سے خیالی پلاؤ نہیں پکایا گیا ہے۔ کہیں کسی بات کی صراحت کے لیے ''فرضی واقعہ'' کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ہر واقعہ کا بیان، ہر معاملہ کا اندراج پختہ دلیلوں اور حوالوں کی مدد سے کیا گیا ہے، یہ اپنے آپ میں زندہ تحقیق پر دلالت کرتا ہے۔ تعین قدر کے ذیل میں بھی حضرتِ وسیم فرحت نے بڑی محنت اور اپنی تحقیقی بصیرت کو بروئے کار لایا ہے۔ بہ حدیثِ دیگرے، یگانہ چنگیزی کے علاوہ فانی بدایونی، ابوالکلام آزاد، جوش ملیح آبادی، مولانا ماجد دریابادی وغیرہم کے متعلق بھی کئی دلچسپ انکشافات ''مکتوباتِ یگانہ'' میں دیکھنے کو ملتے ہیں، اور مجموعی طور پر کتاب سے ایک اچھا تاثر قاری لے کر اٹھتا ہے۔

وسیم فرحت نے جب اس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا تو ایک جنون کی کیفیت میں وہ ہندوستان کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یگانہ کا یہ دوانہ اپنے جنون کا سودا سر میں سمائے مکتب عثمانیہ دکن اور ڈپارٹمنٹ آف آرکائز حیدرآباد پہنچا اور مطلوبہ مواد نہ پاکر اگلی منزل کا قصد کیا۔ یہ رام پور کی رضا لائبریری تھی۔ وہاں ایک قدر شناس پروفیسر عزیز الدین حسین کو موجود پایا جنہوں نے دست تعاون دراز کیا اور یوں مطلوبہ مواد بغل میں دابے وسیم فرحت وہاں سے شادکام اگلی منازل کی جانب عازم سفر ہوئے تھے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک راجستھان، مولانا آزاد علی گڑھ، دارالشکوہ لائبریری دہلی...... غرضیکہ کون سی جگہ تھی جہاں ان کے قدم نہ پہنچے تھے۔ کچھ کرم فرما ایسے بھی تھے جنہوں نے دیگر کتب خانوں سے مواد بھیجا۔ وسیم فرحت ان مقامات پر بھی گئے جہاں یگانہ برسرملازمت رہے تھے۔ ایسی جگہوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ پاکستان میں قومی عجائب گھر کراچی اور جی سی یونیورسٹی لاہور کے کتب خانوں سے فیض پایا۔ وہ یگانہ کی آل اولاد سے ملاقات کے لیے پاکستان بھی آنا چاہتے تھے جو ممکن نہ ہو پایا۔ اسی اثناء میں وسیم فرحت کو علی گڑھ میگزین کے ۱۹۶۰ کے ایک شمارے کے مطالعے سے علم ہوا کہ صغیر احمد زیدی نے مذکورہ پرچے میں یگانہ کی

خودنوشت شائع کی تھی، سوزیدی صاحب سے بدقت تمام رابطہ ممکن بنایا۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ محمد تقی، یگانہ کی ڈائری اپنے ہمراہ کینیڈا لے گئے تھے جہاں چند برس پیشتر یہ تمام چیزیں ان سے کہیں گم ہوگئیں۔ کتاب مکمل ہوئی تو امراوتی جیسے دورافتادہ اور غیر اردو علاقہ پر اس کی دیدہ ریزی یا پروف ریڈنگ بھی ایک کٹھن مرحلے کے طور پر سامنے آئی۔ بقول وسیم فرحت، ''شہر امراوتی میں قحط الرجال ہے، بلکہ امراوتی پر ہی کیا موقوف، بعینہ برار میں قحط الرجال ہے۔ معدودے چند قلم کار ہیں، وہ بہ زعم خویش اپنے میں مست رہتے ہیں۔''

یقیناً وسیم صاحب نے بڑی جانکاہی اور مستعدی سے مذکورہ امور انجام دیے ہیں، تبھی متذکرہ کتاب میں پروف کی اغلاط نہ ہونے کے برابر ہیں۔

وسیم فرحت کارنجوی کتاب کے مقدمے میں اپنے قارئین سے معذرت طلب کرتے ہیں کہ ''حواشی میں مجھے پیش رو محققین یگانہ سے بیش تر مقامات پر اختلاف رہا ہے۔ اور بعض جگہ لہجہ سخت بھی ہو چلا ہے''۔

ان کی معذرت کی شائستگی اپنی جگہ لیکن ایسا کرنے وہ حق بجانب تھے۔ ایک ایسا شخص جس کے انتقال کے ۵۷ برس بعد اس پر تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہو، زمانے بھر کی خاک چھانی گئی ہو، صلے کی تمنا اور ستائش کی پروا کے بنا یہ عرق ریزی کی گئی ہو، تو ایسا شخص ریکارڈ کی درستگی کی خاطر ذرا سی درشتگی کا مظاہرہ کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔

مکتوبات یگانہ کے باب اول میں دوارکا داس شعلہ کے نام یگانہ کے لکھے ۱۰۰ خط شامل ہیں۔ یہ موصوف، یگانہ کے عزیز ترین دوست تھے، یگانہ انہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ وسیم فرحت باب اول کے حواشی میں بیان کرتے ہیں:

''شعلہ خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ پیشے سے کیمسٹ اور لاہور کے معزز گھرانے سے آپ کا تعلق رہا۔ یگانہ سے شعلہ کی ملاقات یگانہ کے قیام لاہور کے زمانے ۱۹۲۶ میں ہوئی۔ اس سے پیشتر شعلہ، حفیظ جالندھری سے اصلاح کلام لیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ تا یگانہ کی وفات ۱۹۵۶، مکمل احوال شعلہ نے اپنے سیر حاصل مضمون 'یہ تیس برس کا قصہ ہے' میں بیان کیا ہے۔'' (مکتوبات یگانہ، صفحہ نمبر ۱۲۲)

مکتوبات یگانہ کے مطالعے سے ہمیں یاس یگانہ چنگیزی کی خانگی زندگی، ان کو درپیش رہے مصائب، حالات وواقعات، خود یگانہ کے ذہنی رجحانات، سبھوں سے مکمل آگاہی ہوتی ہے۔ ایسے ایک شخص کا عکس سامنے آتا ہے جو اپنے نظریات کے دفاع میں زمانے بھر سے جھگڑا مول لیتا رہا۔ اور بہ دقتِ تمام، ہر ہر محاذ پر زمانہ سے جیت لیتا رہا۔

دوارکا داس شعلہ کے نام ۲۹ اگست ۱۹۵۳ کو لکھنؤ سے لکھے گئے خط میں یگانہ کہتے ہیں:

''آخر اہل محلہ نے مجھے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ گرہستی کا سارا سامان اور اپنی بیش قیمت کتابیں، آیات وجدانی کی قریباً پچاس جلدیں۔ برتن باسن۔ الگنی پلنگ، میز کرسیاں سب چھوڑ آیا ہوں۔ یاروں نے سب لوٹ لیا۔ نہایت قیمتی مسودات میرے لکھے ہوئے نہ معلوم کن ہاتھوں میں پڑیں گے۔ میں اپنی علالت سے سخت ایذا میں ہوں۔ تھوڑی دور چلتا ہوں تو ہانپنے لگتا ہوں۔ نہایت غیر مستقل اور تکلیف کی حالت میں۔ مکان کوئی ملتا نہیں۔ خدا جانے کہاں جاؤں گا۔'' (مکتوبات یگانہ، صفحہ نمبر ۹۸)

یگانہ نے درج بالا حالات اس واقعے کے بعد لکھے ہیں جس کا انہیں لکھنؤ میں رہتے ہوئے سامنا کرنا پڑا تھا۔ یعنی اہل محلہ کے ہاتھوں منہ پر سیاہی کا ملے جانا۔ مذکورہ واقعے کی مختصر تفصیل اور اس کے اثرات کا عندیہ ہمیں یگانہ کے اس خط میں ملتا ہے جو انہوں نے شعلہ کو ۱۳۰پریل ۱۹۵۳ کو لکھا تھا۔ یگانہ لکھتے ہیں:

''ان بیہودگیوں اور بدمعاشیوں کا میرے ذہن پر کوئی برا اثر نہیں ہوا۔ بیگم نے بھی دیکھ لیا کہ اتنے بڑے واقع پر بھی مجھ میں کوئی بدحواسی نہیں پائی گئی۔ کیونکہ میں نے جو کچھ کیا اس پر مطمئن ہوں۔ عزت جسے کہتے ہیں وہ اپنی ذات میں موجود ہوتی ہے۔ کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔ ان جاہلوں کو یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے میرا منہ کالا کیا کہ اپنا اور اپنی قوم کا؟ اب میں اپنے سارے محلے اور سارے لکھنؤ سے cut off ہوں۔ میرے مکان پر سپاہی کا پہرہ ہے۔ جان کا خطرہ ہے مگر اب ویسا نہیں جیسا پہلے دو تین روز تک تھا۔'' (مکتوبات یگانہ، صفحہ نمبر ۹۲)

وسیم فرحت کارنجوی متذکرہ واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ایک حاشیے میں لکھتے ہیں:

''یہی وہ غیر انسانی حرکت ہے جو برصغیر میں کسی دانشور کے ساتھ پیش نہ آئی ہوگی۔ اہل لکھنؤ نے اپنی شرافت اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کے سارے بھرم توڑ کر رکھ دیے۔ یگانہ نے 'بحالت ہذیان' کچھ رباعیاں لکھ کر نیاز فتح پوری کو بھجوائیں۔ (حالت ہذیان۔ یہ مولانا ماجد دریابادی کے الفاظ ہیں) جن سے مسلمانان وطن کی تذلیل ہوتی تھی۔ (چار مصارع کی رباعی کو تو خیر جانے دیجیے، جس کے پاس یہ نگارش بھجوائی گئی خود اس نے الحاد و کفر کی تمام حدوں کو کسی زمانے میں منہدم کر دیا تھا) نیاز فتح پوری نے بقول ڈاکٹر راہی معصوم رضا 'میرے دریافت کیے جانے پر نیاز نے قبول کیا کہ میں نے شرارتاً وہ لفافہ مولانا ماجد کو دیا تھا'۔ مولانا نے اپنے ہفت روزہ 'صدق جدید' ۲۷ مارچ ۱۹۵۳ کے شمارے میں بڑا سخت اداریہ لکھا اور تینتالیس برس پرانے تمام واقعات (جن کو اہل لکھنؤ بھول گئے تھے) دوہرا دیے۔ جس میں غالب، اقبال، عزیز، اصغر، جگر اور تمام ہی ان صاحبان کو شمار کیا گیا جن میں سے تقریباً فوت ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں معصوم اور بھولی بھالی رعیت کو بھڑکانے میں کوئی وقت نہیں لگتا لہٰذا حسب منشا نتیجہ برآمد ہوا۔ لکھنؤ کے چند بد دماغ لڑکوں کے ہجوم نے یگانہ کے گھر پہنچ کر انہیں جوتوں کا ہار پہنایا۔ منہ پر تارکول کی کالک پوتی (بظاہر یگانہ کے منہ پر لیکن لگی لکھنؤ کی حمیت پر)

،انہیں پیدل جلوس کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا گیا۔ منصور نگر، کشمیری محلہ، چوک اور نخاس کے چوراہوں پر گھمایا۔ کچھ نالائق قسم کے لڑکے ان کے چہرے پر تھوکتے بھی رہے۔ ایک گھنٹہ تک یہی ظلم بر سر عام چلتا رہا۔ لوگ خاموش تماشہ دیکھتے رہے لیکن کسی شریف کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس انسانیت پر ہو رہے ظلم پر روک لگاتا۔ مولوی گنج سے گزرتے ہوئے جلوس کو پولیس نے حراست میں لے کر یگانہ کو کسی طرح تھانے لے گئے۔ ''(مکتوبات یگانہ، صفحہ نمبر ۱۳۳)

یہاں ایک دلچسپ پہلو کا تذکرہ کرتا چلوں۔ دوارکا داس شعلہ نے اپریل ۱۹۷۵ میں دہلی کے جریدہ آج کل میں اپنی مختصر سوانح تحریر کی تھی۔ زیر نظر مضمون میں ہم نے یگانہ کی شعلہ سے حد درجے قربت اور لگاؤ کا ذکر کیا ہے جس کی تصدیق یگانہ کے مکتوبات سے بھی ہوتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر شعلہ نے اپنی سوانح میں یگانہ کا تذکرہ مختصر طور پر کیا ہے جبکہ انہوں نے (شعلہ نے) کراچی میں ساٹھ کی دہائی میں وفات پانے والے شاعر حیرت شملوی سے نہ صرف اپنی قرابت داری کو بھر پور طریقے سے نمایاں کیا ہے بلکہ حیرت کے فنی محاسن کے بارے میں بھی تفصیلاً رطب للسان رہے ہیں۔ شعلہ، یگانہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرزا یگانہ کے قدموں میں بھی بیٹھنے کا فخر مجھے حاصل ہے۔ وہ میری ہر حماقت کو نہ صرف برداشت کرتے رہے بلکہ سہو نادانی سمجھ کر ہر سہو کو دانش کا حصہ بنا دیتے۔ انہوں نے مجھے رتبہ انسانیت بخشنے کی بہت کوشش کی اور میں خوش ہوں کہ آخر تک اپنی کامیابی کا یقین رہا۔ خوش فہمی ہو کہ غلط فہمی اس کا برسہا برس تک ایک نہج پر برقرار رہنا واقعی حیرت انگیز ہے۔ مرزا مرحوم بڑے شاعر تھے۔ بہت بڑے انسان اور دانائے راز۔ ان کی زندگی میں کہیں لغزش کا پتہ نہیں چلتا، اس ایک لغزش کے سوا کہ انہوں نے مرتبہ دوستی بخشا اور ہمیشہ بے انتہا محبت سے نوازا۔ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں۔ اب اس کے سوا اور کیا کہوں۔''

یگانہ ہی کے الفاظ میں:

سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا
شمع گل ہو گئی، دل بجھ گیا پروانے کا

مجموعی طور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مکتوبات یگانہ اور اس سلسلے کی آنے والی تینوں کتابیں، یاس یگانہ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک نہایت اہم حوالہ ثابت ہوں گی۔

مکتوبات یگانہ کراچی میں قیام پذیر شاعر، ادیب و ناشر سید معراج جامی صاحب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جامی صاحب کا رابطہ نمبر یہ ہے: 0321.8291908 جبکہ ہندوستان میں اردو پبلیکیشنز، امراوتی (مہاراشٹر) سے اس نمبر پر رابطہ کیا جا سکتا ہے: 0937022321

ڈاکٹر سید صفدر، امراوتی

یگانہ چنگیزی۔ خطوط کے آئینہ میں

منفرد اور با وقار مجلہ سہ ماہی "اردو" کے مدیر وسیم فرحت کارنجوی علیگ کی گزشتہ دنوں ایک اہم کتاب "مکتوباتِ یگانہ" منصۂ شہود پر آئی ہے۔ ذیل میں اس کتاب کا ایک جائزہ ہدیۂ قارئین ہے۔ جدید غزل کے امام یگانہ چنگیزی کا نام ایوانِ غزل کے اونچے مینار پر کندہ ہے۔ یگانہ کو غزل کی دنیا میں تیکھے لہجے، مردانہ آہنگ، نئی لفظیات اور منفرد فکر کے سبب بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ غزل کا یہ بادشاہ اک آگ کا دریا عبور کر کے کیسے اس مقامِ افتخار تک پہنچا اس کی داستان ہے 'مکتوباتِ یگانہ'۔ شاعر، ناقد اور محقق وسیم فرحت کارنجوی (علیگ) اس مایہ ناز کتاب کے مرتب ہیں۔

'مکتوباتِ یگانہ' حیاتِ یگانہ ہے کچھ وسیم فرحت، کچھ یگانہ کی زبانی۔ یگانہ کے خطوط اس کے ابتلا، زمانے کی معاندانہ روش، اہلِ قلم کی شپرہ چشمی اور زمانے پر یگانہ کی یلغار کی داستان ہے۔ وسیم فرحت نے اپنے مقدمے اور حواشی کے ساتھ اس داستان میں ایک اور داستان گو کا کردار ادا کیا ہے۔

وسیم فرحت کو یگانہ دوستی ورثے میں ملی ہے۔ وہ لائق وارث بن کر اس وراثت کو بڑے جتن سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ 'احوالِ واقعی' کی سرخی کے تحت فرماتے ہیں:

"یگانہ چنگیزی سے اس درجہ محبت و رغبت کی وجہ والدِ گرامی مرحوم خلیل فرحت کارنجوی رہیں۔ فرحت مرحوم یگانہ کے بڑے شائق تھے۔ یگانہ کی حق پرستی بصورتِ خود پرستی کو خوب سمجھتے تھے اور سمجھاتے بھی تھے۔ علاقہ برار فرحت مرحوم کی حق گوئی و بے باکی کا معترف رہا ہے۔ غیر مصلحت اندیش راست گوئی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔"

ادبی خطوط کو جمع کرنے اور شائع کرنے کا عمومی طریقہ یہ ہے کہ خطوط اکٹھا کر لیے اور شائع کر دیے۔ کبھی یوں کیا کہ تاریخ وار خطوط ترتیب دے لیے۔ یا مکتوب الیہیان کے ناموں کے ساتھ خطوط کی خانہ بندی کر لی۔ خال خال حواشی ٹانک دیے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ مگر 'مکتوباتِ یگانہ' اس میدان میں ایک نئی شان سے آئی ہے۔ اس کتاب میں شامل خطوط میں اکثر شائع شدہ ہیں۔ ان اشاعتوں پر بھی وقت کی گرد نے دبیز تہہ اختیار کر لی تھی۔ ان کی بازیافت کے لیے بھی وسیم فرحت کو کافی مشقت کرنی پڑی۔ 'احوالِ واقعی' کے زیرِ عنوان

مرتب نے اپنی محنتِ شاقہ کی تفصیل رقم کی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مرتب نے ان خطوط میں اضافے کے لئے بھی بہت ہاتھ پیر مارے ہیں۔ مثلاً مسعود حسن ادیب کے نام تیرہ خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ۱۲ خطوط ڈاکٹر نیر مسعود نے ادیب کے نام مشاہیر کے خطوط میں شامل کیے ہیں۔ ایک خط وسیم فرحت نے پاکستان قومی عجائب گھر سے حاصل کر کے اس باب میں اضافہ کیا ہے۔

'ماخذ' کے عنوان کے تحت وسیم فرحت نے اپنے ماخذ بھی تفصیل سے لکھ دیے ہیں۔ بعض خطوط وسیم فرحت نے خود بھی دریافت کیے ہیں، مثلاً فرماتے ہیں:

"بابِ سوم کے آخری دو خط نہایت اہم اور قطعی طور پر غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ دو خط بنام قاضی امین الرحمٰن ہیں جنھوں نے دس سالہ وقفے سے یگانہ سے دو مرتبہ اپنے کلام پر اصلاح طلب کی تھی اور جواباً آئے ہوئے خطوں کو بہت ذمے داری کے ساتھ سنبھال کر رکھا تھا۔ مذکورہ خط رضا لائبریری رامپور سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اور بہت وثوق کے ساتھ میں انھیں اپنی دریافت کہتا ہوں۔"

اب سے پیش تر بہت سارے خطوط اس حال میں شائع کیے گئے تھے کہ ان پر مکتوب الیہان کا نام تک درج نہیں تھا۔ وسیم فرحت نے اپنے حواشی میں اس کمی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہر خط کے مکتوب الیہ کی نشاندہی کی ہے۔ مکتوب الیہ کی نشاندہی سے خط کے متن کی معنویت آشکار ہوتی ہے۔ وسیم فرحت نے ایک بڑا کام تو یہ کیا کہ ان تمام خطوط کو یک جا کر دیا۔ پھر ان کے حواشی لکھ کر حیاتِ یگانہ کو واضح کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان خطوط میں یگانہ زمانے سے نبرد آزما ملتا ہے۔ یہ خطوط یگانہ کے مزاج، اس کی حوصلہ مندی، مستقل مزاجی اور طرزِ حیات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان خطوط میں یگانہ اپنے عہد سے مجادلہ کرتا ہوا ملتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہمارے عہد سے بھی مکالمہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ دیکھو یگانہ اس طرح یگانہ کے مقام و مرتبہ کو پہنچتا ہے۔

وسیم فرحت نے اپنے مقدمے میں حیاتِ یگانہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہاں موصوف نے یہاں وہاں سے اڑا کر عمومی بیانات ترتیب دیے ہوں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہر بات دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ رقم کی ہے۔ اس طریقہ کار نے 'مکتوباتِ یگانہ' کو Authentic دستاویز بنا دیا ہے۔ کتاب کی مشمولات حسبِ ذیل ہیں۔

۱) احوالِ واقعی: اس عنوان کے تحت مرتب نے اپنی جہد و کاوش رقم کی ہے جو مرتب کی یگانہ پروری اور عشق و جنون کی مظہر ہے۔

۲) مقدمہ: اس سرخی کے تحت مرتب نے حیاتِ یگانہ پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

۳) ماخذ: ماخذ کے عنوان سے مرتب نے اپنے ماخذ بیان کیے ہیں۔ ان کی کمی پر روشنی ڈالی ہے، ان کی تکمیل

کے لیے اپنی کوششوں کو واضح کیا ہے۔ مثلاً شعلہ کے نام پانچ خطوط قبل از این نقوش لاہور کے خطوط نمبر سے لیے گئے ہیں۔ مگر وہاں کیفیت یہ ہے کہ:

''نقوش خطوط نمبر میں شامل مکاتیب پر مدیر نے حواشی نہیں لکھے۔ بات اگر صرف یہیں تک محدود ہوتی تو کوئی قباحت نہ تھی لیکن حد تو یہ ہے کہ مکتوب الیہیان کے اسمائے گرامی بھی مدیر محترم درج کرنا بھول گئے۔''

اس پس منظر میں وسیم فرحت کے حواشی خاصے اہم ہو جاتے ہیں۔

مکتوبات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باب اول: باب اول میں دوار کا داس شعلہ کے نام سو خطوط شامل ہیں۔

باب دوم: باب دوم میں کل پندرہ خطوط ہیں۔ جن کے مکتوب الیہیان میں ہمہ جناب مولوی ضیاء احمد بدایونی، دل شاہجہاں پوری، راغب مراد آبادی، رفیق بدایونی اور مالک رام ہیں۔

باب سوم: باب سوم بھی پندرہ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور قاضی امین الرحمٰن کے نام ہیں۔

باب چہارم: اس باب میں چودہ خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط یگانہ کی بیٹی بلند اقبال، بیٹے آغا جان اور حیدر بیگ، من موہن تلخ اور ضیا انصاری کے نام لکھے گئے ہیں۔

باب پنجم: اس باب میں نو خطوط ''بخط یگانہ'' یعنی یگانہ کی اہلیہ کے نام خطوط بھی شامل ہیں۔

باب ششم: اس باب میں 'اعتراف یگانہ' کی سرخی کے تحت چار خط ہیں۔ ان میں اقبال اور جوش جیسے نابغہ شعرا کا یگانہ کے تئیں ان کی علمیت اور فن کا اعتراف کیا گیا ہے۔

شعلہ اور ادیب کے نام خطوط میں یگانہ زمانے کی یلغار کا مقابلہ کرتا ہوا ملتا ہے، یگانہ بیگم، بیٹی بلند اقبال اور بیٹوں کے نام خطوط میں ان کی نجی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شاگردوں اور ہم عصروں کے خطوط سے ان کا مقام و مرتبہ واضح ہوتا ہے۔ یگانہ پہلے بھی یگانہ روزگار تھے، مگر اس کتاب کے ساتھ وسیم فرحت نے ایک بار پھر یگانہ کو ہمارے درمیان قائم کر دیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادھر ادھر بکھرے خطوط کو مرتب نے بس اکٹھا کر دیا ہے، مگر بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ اس کے حواشی لکھنے میں وسیم فرحت نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

یگانہ اردو تاریخ کا بڑا نام ہے۔ حیات یگانہ کو ان مکتوبات سے مرتب کرنا بھی بڑا کام ہے، یہ بڑا کام ہمارے دوست محقق وسیم فرحت نے کر دکھایا ہے۔ مکتوبات یگانہ کی تحقیق و تدوین کے لیے وسیم فرحت کارنجوی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب میں یگانہ کی مختلف تصاویر شامل ہیں، یہ تصاویر عمر کے مختلف مرحلوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مرتب نے بڑی محنت سے ان تصاویر کے سن و سال کا تعین کیا ہے۔ اولین تصویر ۱۹۱۴ کی ہے جب 'آتش جوان ہوگا' یا یوں کہیے کہ 'ہم رنگ آتش جوان ہوگا'۔ دوسری تصویر ۱۹۳۳ کی ہے جب یگانہ یاس عظیم آبادی سے غالب شکن یاس یگانہ چنگیزی ہو چکے تھے۔ تیسری تصویر ۱۹۵۱ کی ہے، جس کے متعلق مرتب نے ایک خط کے حاشیہ میں لکھا ہے:

"یگانہ کا مکتوب ۲۴ اور ۲۵ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپریل ۱۹۴۶ تا وسط مئی ۱۹۴۶ بمبئی میں مقیم رہے۔ یگانہ کے ایک نزدیکی خیر خواہ ذوالفقار علی بخاری، جو ان دنوں آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ملازم تھے، نے یگانہ کو تبدیلی ، آب و ہوا کی غرض سے اپنا مہمان بنایا۔ یگانہ قیام بمبئی میں ان ہی کے یہاں مقیم رہے۔ (سرگزشت، از ذوالفقار علی بخاری، معارف کراچی ۱۹۶۶ء صفحہ نمبر ۱۷۸) اسی درمیان یگانہ نے بخاری کے توسط سے اپنے بیٹے آغا جان کو آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت فراہم کروادی۔ مزید اسی اثنا میں ترقی پسند مصنفین کے روح رواں سجاد ظہیر نے ان کا دیوان ''گنجینہ'' کمیونسٹ پارٹی کے دارالاشاعت (لاہور) سے شائع کروانے کے متعلق کاروائی کی۔ جس کی ترتیب یگانہ نے بمبئی میں ہی قیام پذیری کے دوران سرانجام دی۔ مشفق خواجہ مرحوم کے مرتبہ ''کلیات یگانہ'' کے سرورق پر ''گنجینہ'' میں شائع شدہ تصویر لی گئی ہے، جو قیام بمبئی کی ہی دین ہے۔ یہ تصویر علی سردار جعفری نے کھنچوائی تھی اور یہ غالباً پہلی اور آخری تصویر ہے جس میں یگانہ مسکراتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔"

اس تناظر میں یگانہ لکھنو کے جدال کی بجائے بمبئی کے خیر خواہوں کے درمیان فاتحانہ مسکرا رہے ہیں۔ چوتھی تصویر ۱۹۵۵ کی ہے جس میں یگانہ ناقدری زمانہ سے لڑتے لڑتے بدحال نظر آرہے ہیں۔

کتاب کا سرورق سادہ مگر ذوق سلیم کی غمازی کرتا ہے۔ سرورق کی کتابت جدید تر 'اسپاٹ لیمی نیشن' سے آراستہ ہے۔ جلد بندی کتاب کو دیدہ زیب بناتی ہے۔ کتاب کی پشت پر مرتب کے نام آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا خط دیا گیا ہے جس میں آزاد کھلے طور پر مرتب کے کارہائے نمایاں کا اعتراف کر رہے ہیں۔ فلیپ اول پر نیاز فتح پوری کی تحریر درج ہے جس میں نیاز نے یگانہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ فلیپ دوم پر مرتب کی یگانہ سے متعلقہ پیش آئند کتابوں کی فہرست درج ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کتاب کی پذیرائی ہونی چاہیے بلکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اردو کی علمی دنیا میں 'مکتوبات یگانہ' کی خوب خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

ساحرؔ کے سحر انگیز گیتوں، اقبال نیازی کی اسکرپٹ، اور ٹام آلٹر کے بیانیہ نے رنگ جمایا!!

"کردار" کے رنگ اور نور کی بارات کے شوز، ممبئی، لکھنؤ، بھوپال اور نوساری میں

کردار آرٹ اکیڈمی کے زیر اہتمام نہرو سینٹر میں چند ماہ قبل ''غالب رنگ'' جیسے بامعنی عنوان کے تحت غالبؔ کے خطوط کی ڈرامائی ریڈنگ اور غالب کی غزلوں کے خوبصورت امتزاج نے شائقین کو مسحور کر دیا تھا اور گزشتہ دنوں باندرہ کے رنگ شاردا آڈیٹوریم میں ایک بار پھر ''کردار'' نے وسیع پیمانے پر ایک خوبصورت میوزیکل پروگرام ''رنگ اور نور کی بارات! ساحرؔ کے ساتھ!!'' کا انعقاد کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ''تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ تفریحی میدان میں بھی اس کے فنکار اپنی چھاپ چھوڑ سکتے ہیں۔''رنگ اور نور کی بارات!'' ایک محض کمرشیل میوزیکل آرکسترانہ ہوتے ہوئے ادب کی چاشنی لیے ہوئے ایک باوقار، منضبط پروگرام تھا جس میں اقبال نیازی کی تحریر کردہ اسکرپٹ کو ٹام آلٹر نے بے حد پراثر انداز میں پیش کیا بالخصوص گیتوں پر ان کے مست ہو کر جھومنے کے انداز سے شائقین محظوظ ہو رہے تھے۔ ساحرؔ کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے حالات، شعر و سخن کا آغاز، عشق میں ناکامیاں، فلمی جدوجہد، ساحرؔ کی انا پرستی فلمی دنیا میں نغمہ نگاروں اور ادیبوں کے حقوق کے بازیابی کے لئے ان کی جدوجہد اور ہندی فلموں کے گیتوں کو اعلیٰ معیاری درجہ تک پہنچانے میں ساحرؔ کی پیش رفت کو بہت جامع اور پراثر انداز میں اسکرپٹ میں شامل کیا گیا تھا۔ سونے پہ سہاگہ ساحرؔ کی اپنی آواز میں ایک نظم ''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے۔۔'' بھی شائقین کو سنائی گئی اور اس انوکھے تحفہ سے ساحرؔ کے مداح لطف اندوز ہوئے اور متاثر بھی۔

مہمان خصوصی اور ساحرؔ کے ساتھی، مشہور شاعر اور صحافی جناب حسنؔ کمال نے ساحرؔ لدھیانوی کو یاد کرتے ہوئے ان کے ساتھ گزرے کچھ لمحوں کو لفظوں کا پیکر عطا کیا اور کچھ دلچسپ واقعات سنائے۔ دیگر مہمانان میں پرنسپل لوکھنڈ والا، شمشیر خان پٹھان، سلیم الوارے اور موسیقار مدن موہن کے صاحبزادے سمیرؔ کو کردار کے فنکاروں نے اعزاز و اکرام سے نوازا۔ رنگ شاردا جیسے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں شائقین گیت و موسیقی کا ہجوم تھا۔ جن میں اکثریت غیر اردو داں حضرات کی تھی۔ وہ ساحرؔ کے گیتوں کو سن کر جھوم رہے تھے اور سریلے گلوکار ریکھا راول، رفیع حبیب، یٰسین سید، کیرتی انوراگ، حنیف شیخ، سہیل اختر اور کشمیری پرساد کو داد و تحسین سے نواز رہے تھے۔ اخیر میں راوی ٹام آلٹر نے اس پروگرام کے محرک، ترتیب کار اور ہدایتکار اقبال نیازی کی ان کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ''آواز ضرور میری تھی لیکن ساحرؔ سے متعلق یہ دلچسپ معلومات، واقعات، ریسرچ اور ان ۲۶ گیتوں کے انتخاب میں اقبال نیازی کی سخت محنت اور ان کا تخلیقی ذہن کارفرما تھا۔ رنگ و نور کی بارات کے دو شوز عنقریب ممبئی میں اور پھر نوساری (گجرات) لکھنؤ اور بھوپال میں ہونے جا رہے ہیں۔ (رپوٹ: اقبال نیازی، ممبئی)

انتخابِ ساحرؔ لدھیانوی

منظومات

یکسوئی

عہدِ گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو؟
ایک آوارۂ منزل کو ستاتی کیوں ہو؟
وہ حسیں عہد جو شرمندہ ایفا نہ ہوا
اس حسیں عہد کا مفہوم جتاتی کیوں ہو
زندگی شعلہء بے باک بنالو اپنی!
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو
میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟
کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو
میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

شاہکار

مصور میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں
اب ان رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے
لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے
نمایاں رنگِ پیشانی پہ عکسِ سوزِ دل کر دے
تبسم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدہ پن بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دے دے
مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

نذرِ کالج

(لدھیانہ گورنمنٹ کالج 1943)

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام
اے وادیٔ جمیل میرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں!
تو آج بھی ہے میرے لیے جنتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال
کمھلائے ہیں یہاں پہ مری زندگی کے پھول
ان راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول
تیری نوازشوں کو بھلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا
تیری نشاط خیز فضائے جواں کی خیر
گلہائے رنگ و بو کے حسیں کارواں کی خیر
دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسین فضائیں بسی رہیں!
ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے حدِ وطن سے نکل گئے
گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی!
سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں

برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں
نغمہ نشاطِ روح کا گایا ہے بارہا
گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا
معصومیوں کے جرم میں بدنام ہم ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے
اس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

خانہ آبادی

ایک دوست کی شادی پر
ترانے گونج اٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہوا ہے عطر آگیں ذرہ ذرہ مسکراتا ہے
مگر دور ایک افسردہ مکاں میں سرد بستر پر
کوئی دل ہے کہ ہر آہٹ پہ یوں ہی چونک جاتا ہے
مری آنکھوں میں آنسو آگئے نادیدہ آنکھوں کے
مرے دل میں کوئی غمگین نغمہ سرسراتا ہے
یہ رسمِ انقطاعِ عہدِ الفت، یہ حیاتِ نو
محبت رو رہی ہے اور تمدن مسکراتا ہے
یہ شادی خانہ آبادی ہو میرے محترم بھائی
مبارک کہہ نہیں سکتا مرا دل کانپ جاتا ہے

ایک شعر

پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

معذوری

خلوت وجلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مسکرا سکتا نہیں
میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں
مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں
روح افزا ہیں جنونِ عشق کے نغمے مگر
اب میں ان گائے ہوئے گیتوں کو گا سکتا نہیں
میں نے دیکھا ہے شکستِ سازِ الفت کا سماں
اب کسی تحریک پر بربط اٹھا سکتا نہیں
دل تمہاری شدتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں
تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمہارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں
گائے ہیں میں نے خلوصِ دل سے بھی الفت کے گیت
اب ریاکاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں

کس طرح تم کو بنالوں میں شریکِ زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں
یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمعِ آرزو کی لو بڑھا سکتا نہیں

سرزمینِ یاس

جینے سے دل بیزار ہے
ہر سانس اک آزار ہے
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی
وہ بزمِ احبابِ وطن
وہ ہم نوایانِ سخن
آتے ہیں جس دم یاد اب
کرتے ہیں دل ناشاد اب
گزری ہوئی رنگینیاں
کھوئی ہوئی دلچسپیاں
پہروں رلاتی ہیں مجھے
اکثر ستاتی ہیں مجھے
وہ زمزمے وہ چہچہے
وہ روح افزا قہقہے
جب دل کو موت آئی نہ تھی
یوں بے حسی چھائی نہ تھی

کالج کی رنگیں وادیاں
وہ دلنشیں آبادیاں
وہ نازنینانِ وطن
زہرہ جبینانِ وطن
جن میں سے اک رنگیں قبا
آتش نفس، آتش نوا
کر کے محبت آشنا
رنگِ عقیدت آشنا
میرے دلِ ناکام کو
خوں گشتۂ آلام کو
داغِ جدائی دے گئی
ساری خدائی لے گئی
اُن ساعتوں کی یاد میں
اُن راحتوں کی یاد میں
مغموم سا رہتا ہوں میں
غم کی کسک سہتا ہوں میں
سنتا ہوں جب احباب سے
قصے غمِ ایام کے
بیتاب ہو جاتا ہوں میں
آہوں میں کھو جاتا ہوں میں
پھر وہ عزیز و اقربا
جو توڑ کر عہدِ وفا
احباب سے منہ موڑ کر
دنیا سے رشتہ جوڑ کر
حدِ افق سے اس طرف

رنگِ شفق سے اُس طرف
اک وادیِ خاموش کی
اک عالمِ بے ہوش کی
گہرائیوں میں سو گئے
تاریکیوں میں کھو گئے
ان کا تصور ناگہاں
لیتا ہے دل میں چٹکیاں
اور خوں رلاتا ہے مجھے
بے کل بناتا ہے مجھے
وہ گاؤں کی ہمجولیاں
مفلوک دہقاں زادیاں
جو دستِ فرطِ یاس سے
اور یورشِ افلاس سے
عصمت لٹا کر رہ گئیں
خود کو گنوا کر رہ گئیں
غمگیں جوانی بن گئیں
رسوا کہانی بن گئیں
اُن سے کبھی گلیوں میں اب
ہوتا ہوں میں دوچار جب
نظریں جھکا لیتا ہوں میں
خود کو چھپا لیتا ہوں میں
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے امید کی لاش
مدتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دو چار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے
جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے
اور اب جب کہ مری روح کی پہنائی میں / ایک سنسان سی مغموم گھٹا چھائی ہے
تو دمکتے ہوئے عارض کی شعاعیں لے کر
گل شدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے
میری محبوب، یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا
میری افسردہ جوانی کے لیے راس نہیں
میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کے لیے
ان کا دھندلا سا تصور بھی میرے پاس نہیں
ایک یخ بستہ اُداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ امید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی امنگوں کا خروش / ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا / بجھ چکے ہیں مرے سینے میں محبت کے کنول
اب ترے حسنِ پشیماں سے مجھے کیا لینا / تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگیِ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محبوب نگاہوں کا پیامِ تجدید
اک تلافی ہی سہی ---- میری تمنا تو نہیں

کسی کو اداس دیکھ کر

تمہیں اداس سا پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اٹھا رہی ہو تم
وہ شوخیاں وہ تبسم وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تم
چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم
میری امید اگر مٹ گئی تو مٹنے دو
امید کیا ہے بس اک پیش و پس ہے کچھ بھی نہیں
میری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غمِ حیات غمِ یک نفس ہے کچھ بھی نہیں
تم اپنے حسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے، طولِ ہوس ہے کچھ بھی نہیں
مجھے تمہارے تغافل سے کیوں شکایت ہو؟
مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے
میں جانتا ہوں کہ دنیا کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے
یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے
شکستِ ساز کی آواز روحِ نغمہ ہے
مجھے تمہاری جدائی کا کوئی رنج نہیں
مرے خیال کی دنیا میں میرے پاس ہو تم
یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں ملا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اداس ہو تم
خفا نہ ہونا مری جرأتِ تخاطب پر

تمہیں خبر ہے مری زندگی کی آس ہو تم
مرا تو کچھ بھی نہیں ہے، میں رو کے جی لوں گا
مگر خدا کے لیے تم اسیرِ غم نہ رہو
ہوا ہی کیا جو زمانے نے تم کو چھین لیا
یہاں پہ کون ہوا ہے کسی کا، سوچو تو
مجھے قسم ہے مری دکھ بھری جوانی کی
میں خوش ہوں میری محبت کے پھول ٹھکرا دو
میں اپنی روح کی ہر اک خوشی مٹا لوں گا
مگر تمہاری مسرت مٹا نہیں سکتا
میں خود کو موت کے ہاتھوں میں سونپ سکتا ہوں
مگر یہ بارِ مصائب اٹھا نہیں سکتا
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا
یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں ہے افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ
یہ شاہراہوں پہ رنگین ساڑھیوں کی جھلک
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد رو بچے
گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی

یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہے اٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون وضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

مرے گیت

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ وجدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خوں ریزی کے افسانے سے رغبت ہے
مری دنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص ونغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے
مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پر سوز راتوں کو
میں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
تصور بن کے بھولی وارداتیں یاد آتی ہیں
تو سوز ودرد کی شدت سے پہروں تلملاتا ہوں
کوئی خوابوں میں خوابیدہ امنگوں کو جگاتی ہے
تو اپنی زندگی کو موت کے پہلو میں پاتا ہوں
میں شاعر ہوں مجھے فطرت کے نظاروں سے الفت ہے
مرا دل دشمنِ نغمہ سرائی ہو نہیں سکتا
مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے

مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا
جواں ہوں میں جوانی لغزشوں کا ایک طوفاں ہے
مری باتوں میں رنگِ پارسائی ہو نہیں سکتا
مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب بھی دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں مفلسوں کو بے کسوں کو بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

اشعار

ہر چند مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبع خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریِ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارہ نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

سوچتا ہوں

سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارا کرلوں
دل کو بیگانۂ ترغیب وتمنا کرلوں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنونِ رسوا
چند بے کار سے بے ہودہ خیالوں کا ہجوم
ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعیِ موہوم
سوچتا ہوں کہ محبت ہے سرور ومستی
اس کی تنویر سے روشن ہے فضائے ہستی
سوچتا ہوں کہ محبت ہے بشر کی فطرت
اس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے
سوچتا ہوں کہ محبت سے ہے تابندہ حیات
اور یہ شمع بجھا دینا بہت مشکل ہے
سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزت وناموس میں کفنائی ہوئی / دورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب واخلاق سے ٹھکرائی ہوئی / سوچتا ہوں کہ بشر اور محبت کا جنوں
ایسے بوسیدہ تمدن میں ہے اک کارِ زبوں
سوچتا ہوں کہ محبت نہ بچے گی زندہ
پیش ازاں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش
یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ الفت ہو کر
اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش
سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارا کرلوں ۔۔۔۔۔۔ دل کو بیگانۂ ترغیب وتمنا کرلوں

ناکامی

میں نے ہر چند غمِ عشق کو کھونا چاہا
غمِ الفت غمِ دنیا میں سمونا چاہا
وہی افسانے مری سمت رواں ہیں اب تک
وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں اب تک
وہی بے سود خلش ہے مرے سینے میں ہنوز
وہی بیکار تمنائیں جواں ہیں اب تک
وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے
وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں اب تک
کثرتِ غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی!
میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا
دل نے دنیا کے ہر اک درد کو اپنا تو لیا
مضمحل روح کو اندازِ جنوں مل نہ سکا
میری تخئیل کا شیرازۂ برہم ہے وہی
میرے بجھتے ہوئے احساس کا عالم ہے وہی
وہی بے جان ارادے وہی بے رنگ سوال
وہی بے روح کشاکش وہی بے چین خیال
آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام مری سعیِ عمل بھی ناکام

مجھے سوچنے دے

میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سم ہی سہی
درد و آزار سہی، جبر سہی، غم ہی سہی
لیکن اس درد و غم و جبر کی وسعت کو تو دیکھ
ظلم کی چھاؤں میں دم توڑتی خلقت کو تو دیکھ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ
جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ
رہ گزاروں پہ فلاکت زدہ لوگوں کا گروہ
بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں
تیرہ و تار مکاں، مفلس و بیمار مکیں
نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلابِ عظیم
نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں
اور دہقان کے چھپر میں نہ بتی نہ دھواں
یہ فلک بوس ملیں، دلکش و سیمیں بازار
یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار
دور ساحل پہ وہ شفاف مکانوں کی قطار
سرسراتے ہوئے پردوں میں سمٹتے گلزار

در و دیوار پہ انوار کا سیلاب رواں
جیسے اک شاعرِ مدہوش کے خوابوں کا جہاں
یہ سبھی کیوں ہے یہ کیا ہے مجھے کچھ سوچنے دے
کون انساں کا خدا ہے مجھے کچھ سوچنے دے
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ

صبحِ نوروز

پھوٹ پڑیں مشرق سے کرنیں
حال بنا ماضی کا فسانہ
گونجا مستقبل کا ترانہ
بھیجے ہیں احباب نے تحفے
اٹے پڑے ہیں میز کے کونے
دلہن بنی ہوئی ہیں راہیں
جشن مناؤ سالِ نو کے
نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے
بھوکے، زرد گداگر بچے

کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں
وقت سے پہلے جاگ اُٹھے ہیں
پیپ بھری آنکھیں سہلاتے
سر کے پھوڑوں کو کھجلاتے
وہ دیکھو کچھ اور بھی نکلے
جشن مناؤ سالِ نو کے

گریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسوانِ زیبائی
ان آرزوں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنھوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دل و دماغ میں وحشت کی کارفرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
سلا گئی تھیں جنھیں تیری ملتفت نظریں
وہ درد جاگ اُٹھے پھر سے لے کے انگڑائی
عجیب عالمِ افسردگی ہے رو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی
تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب

مری اداس طبیعت ہے سب سے اُکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنتِ شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پرشکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پر بخشی طویل تنہائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی!
وہ پھر جھکا کسی در پر غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی

کچھ باتیں

دیس کے ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں
اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر
اس جہنم زار کی باتیں کریں
ہو چکے اوصاف پردے کے بیاں
شاہدِ بازار کی باتیں کریں
دہر کے حالات کی باتیں کریں
اس مسلسل رات کی باتیں کریں
من و سلویٰ کا زمانہ جا چکا
بھوک اور آفات کی باتیں کریں
آؤ پرکھیں دین کے اوہام کو
علمِ موجودات کی باتیں کریں
جابر و مجبور کی باتیں کریں
اس کہن دستور کی باتیں کریں
تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے
فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں
گرنے والے قصر کی توصیف کیا
تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

چکلے

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پُر پیچ گلیاں یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی یہ سکوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

تعفن سے پرنیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وہ اجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفس کی الجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

طرحِ نو

سعیٔ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر
بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر
فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام
سرمایہ کے فریب جہاں پروری کی خیر
طبقاتِ متبذل میں ہے تنظیم کی نمود
شاہنشہوں کے ضابطۂ خودسری کی خیر
احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا
پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر
ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر
صحنِ جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں
آقائے ہست و بود کی صنعت گری کی خیر
شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغِ جناں میں جلوۂ حور و پری کی خیر
انساں الٹ رہا ہے رخِ زیست کا نقاب
مذہب کے اہتمام فسوں پروری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

تاج محل

تاج تیرے لیے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ میں ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟

میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا

مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی!
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش درودیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں، اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے، اُٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے
چوک چوک پر گلی گلی میں سرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت اُمڈے آتے ہیں
شاہی درباروں کے در سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
رسوا بازاری خاتونیں حقِ نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں
روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اُٹھی ہے

جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکے بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر ایک بھبکتا شعلہ ہو کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں ہونٹوں پر بے باک ترانے
دہقانوں کے دل نکلے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے
آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
اُبھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے
راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رکے گا
کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جباروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِ الٰہی منہ اترے ہیں غداروں کے
ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضوباری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

اجنبی محافظ

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں پہ نقاہت کی نمود
خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود
علم کے نور سے عاری ــــــ محروم
فلکِ ہند کے افسردہ ــــــ نجوم
جن کی تخئیل کے پر

چھو نہیں سکتے ہیں اس اونچی پہاڑی کا سرا!
جس پہ ہوٹل کے دریچوں میں کھڑے ہیں تن کر
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
منہ میں سگریٹ لیے ہاتھوں میں برانڈی کا گلاس
جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک
بھوکے دہقانوں کے ماتھے کا عرق
رات کو جس کے عوض بکتا ہے
کسی افلاس کی ماری کا تقدس۔۔۔۔یعنی
کسی دوشیزۂ مجبور کی عصمت کا غرور
محفلِ عیش کے گونجے ہوئے ایوانوں میں
اونچے ہوٹل کے شبستانوں میں
قہقہے مارتے ہنستے ہوئے استادہ ہیں
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اسی ہوٹل کے قریب
بھوکے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعتِ نایاب کے جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کتوں کے احساس پہ ہنس دینے کو
بھوکے مجبور غلاموں کا گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہوا استادہ ہے

کاش یہ بے حس و بے وقعت و بیدل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابند سلاسل کتے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوت
کاش یہ اپنے لیے آپ صف آراء ہوتے
اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے
ان کی دل میں ابھی باقی رہتا
قومی غیرت کا وجود
ان کی سنگین و سیہ سینوں میں
گل نہ ہوتی ابھی احساس کی شمع
اور پورب سے اُمڈتے ہوئے خطرے کے لیے
یہ کرائے کے محافظ نہ منگانے پڑتے

بلاوا

دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو!
اُٹھو اے مظلوم انسانو!
دھرتی کے ان داتا تم ہو
جگ کے پران ودھاتا تم ہو
دھنیوں کی خوشحالی تم ہو
کھیتوں کی ہریالی تم ہو
اونچے محل بنائے تم نے

شاہی تخت سجائے تم نے
ہیرے لعل نکالے تم نے
نیزے بھالے ڈھالے تم نے
ہر بگیا کے مالی تم ہو
اس سنسار کے والی تم ہو
وقت ہے دھرتی کو اپنا لو
آگے بڑھو ہتھیار سنبھالو
اٹھو اے مظلوم انسانو
جاگو اے مزدور کسانو
دیکھو دھرتی کانپ رہی ہے
گرد پھریرا ڈھانپ رہی ہے
کشٹ کی جوالا پھوٹ پڑی ہے
وقت ہے تھوڑا جنگ کڑی ہے
پھیل رہے ہیں کال کے گھیرے
تھامو اپنے سرخ پھریرے
تم ہو جگ جنتا کے سینک
پاپ کے ناشک ستیہ کے رکھشک
بھوک کے عادی ظلم کے پالے
کالی کٹیاؤں کے اجالے
کیا روکے گی تم کو شاہی
تم ہو بہادر سرخ سپاہی
جاگو اے مزدور کسانو
اٹھو اے مظلوم انسانو
دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا

شہزادے

ذہن میں عظمتِ اجداد کے قصے لے کر
اپنے تاریک گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
مرمریں خوابوں کی پریوں سے لپٹ کر سو جاؤ
ابر پاروں پہ چلو، چاند ستاروں میں اڑو
یہی اجداد سے ورثہ میں ملا ہے تم کو
دور مغرب کی فضاؤں میں دہکتی ہوئی آگ
اہلِ سرمایہ کی آویزشِ باہم نہ سہی
جنگِ سرمایہ و محنت ہی سہی
دور مغرب میں ہے۔۔۔ مشرق کی فضا میں تو نہیں
تم کو مغرب کے بکھیڑوں سے بھلا کیا لینا؟
تیرگی ختم ہوئی سرخ شعاعیں پھیلیں
دورِ مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے
فتح جمہور کے، انصاف کے، آزادی کے
ساحلِ شرق پہ گیسوں کا دھواں چھانے لگا
آگ برسانے لگے اجنبی توپوں کے دہن
خواب گاہوں کی چھتیں گرنے لگیں
اپنے بستر سے اُٹھو
نئے آقاؤں کی تعظیم کرو
اور۔۔۔ پھر اپنے گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
تم بہت دیر۔۔۔ بہت دیر تلک سوئے رہے

شعاعِ فردا

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لیے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا
اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر
اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہو جائے گی انساں کے لہو کی تقطیر
اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی لیکن جی لے

بنگال

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا؟
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے

زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خون سے سینچا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں
زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو!
ملوں کے منتظمو! سلطنت کے فرزندو
پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دوکان پہ نیلام اٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، میرا احساس
جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک تیرے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض

چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے
دیکھ اس عرصہ گہہ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

کبھی کبھی

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی
عجب نہ تھا کہ میں بے گانۂ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہیں حسین فسانوں میں محو ہو رہتا
پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا
مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے

کہ تو نہیں ترا غم، تری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں
زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی رہ گزاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پرہول خارزاروں میں
نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

فرار

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے
میرے ماضی کو اندھیروں میں دبا رہنے دو
مرا ماضی مری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل مری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں
کتنی بے کار امیدوں کا سہارا لے کر

میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم سائے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر
مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ میں نے انہیں چاہا ہی نہیں
اور وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
میں نے ان مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں
مجھ کو کہنے دو کہ میں آج بھی جی سکتا ہوں
عشق ناکام سہی، زندگی ناکام نہیں
ان کو اپنانے کی خواہش انہیں پانے کی طلب
شوقِ بے کار سہی، سعیِ غم انجام نہیں
وہی گیسو، وہی نظریں، وہی عارض، وہی جسم
میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی ان کے لیے کھلنا تھا
ان کی نظروں سے بہت دور بھی کھل سکتے ہیں

کل اور آج

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا
بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں
دوش ہوا پر میخانے ہی میخانے گھر آئے ہیں
رت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے

اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے
چرواہے بنسی کی دھن سے گیت فضا میں بوئیں گے
آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکیں گے
الجھی الجھی راہوں میں وہ آنچل تھامے آئیں گے
دھرتی، پھول، آکاش، ستارے سپنا سا بن جائیں گے
کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا

(۲)

آج بھی بوندیں برسیں گی
آج بھی بادل چھائے ہیں
اور کوی اس سوچ میں ہے
بستی پر بادل چھائے ہیں پر یہ بستی کس کی ہے
دھرتی پر امرت برسے گا لیکن دھرتی کس کی ہے
ہل جوتے گی کھیتوں میں الہڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلّے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آ کر سب پونجی لے جائیں گے
بوڑھے دہقانوں کے گھر، بنیے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی
آج بھی جنتا بھوکی ہے کل بھی جنتا ترسی تھی

آج بھی رم جھم برکھا ہوگی کل بھی بارش برسی تھی
آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوئی اس سوچ میں ہے

ہراس

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر
مرے خیال میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے
یوں اچانک تیرے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کو سرد خموشی میں ہر اک جھونکے سے
تیرے انفاس، ترے جسم کی آنچ آتی ہے

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں
لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اجالے میں بیاں تو کر دوں
ان حسیں خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں

وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

سوچتا ہوں کہ تجھے مل کے میں جس سوچ میں ہوں
پہلے اس سوچ کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں
میں ترے شہر میں انجان ہوں، پردیسی ہوں
تیرے الطاف کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں

کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے تھرّا جائیں
اور تری مرمریں بانہوں کا سہارا نہ ملے
اشک بہتے رہیں خاموش، سیہ راتوں میں
اور ترے ریشمی آنچل کا کنارا نہ ملے

اسی دوراہے پر

اب نہ اُن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اپنی نادار محبت کی شکستوں کے طفیل
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجلائی تھی

اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حالِ تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا

پھر ترے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی
جال بننے لگی، بنتی رہی، بنتی ہی رہی

میں کھنچا تجھ سے، مگر تو مری راہوں کے لیے
پھول چنتی رہی، چنتی رہی، چنتی ہی رہی

برف برسائی مرے ذہن و تصور نے مگر
دل میں اک شعلہء بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھپا
میں اس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں
تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مقسوم سمجھ سکتا ہوں

اب نہ اُن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجلائی تھی

ایک تصویرِ رنگ

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حسن کا نغمہء جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبہء بے تاب نظر آئی تھی

اے طرب زار جوانی کی پریشاں تتلی

تو بھی اک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا

تیرے نازک سے پروں پر یہ زروسیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دیگا
تو نے راحت کی تمنا میں جو غم پالا ہے
وہ تری روح کو آباد نہ ہونے دے گا

تو نے سرمائے کی چھاوں میں پنپنے کے لیے
اپنے دل، اپنی محبت کا لہو بیچا ہے
دن کی تزئینِ فسردہ کا اثاثہ لے کر
شوخ راتوں کی مسرت کا لہو بیچا ہے

زخم خوردہ ہیں تخیل کی اڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری روح کے غم پلتے ہیں
سرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیے جلتے ہیں

اس سے کیا فائدہ؟ رنگین لبادوں کے تلے
روح جلتی رہے، گھلتی رہے، پژمردہ رہے
ہونٹ ہنستے ہوں دکھاوے کے تبسم کے لیے
دل غمِ زیست سے بوجھل رہے، آزردہ رہے

دل کی تسکین بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل

زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیستِ احساس بھی ہے، شوق بھی ہے، درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری روح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ جو تیری لے میں مسرت بھر دے

ایک شام

قمقموں کی زہر اگلتی روشنی
سنگ دل پر ہول دیواروں کے سائے
آہنی بت، دیو پیکر اجنبی
چیختی چنگھاڑتی خونیں سرائے
روح الجھی جا رہی ہے کیا کروں
چار جانب ارتعاشِ رنگ و نور
چار جانب اجنبی بانہوں کے جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند
میں، مری غیرت، مرا دستِ سوال
زندگی شرما رہی ہے کیا کروں
کارگاہِ زیست کے ہر موڑ پر
روحِ چنگیزی برافگندہ نقاب
تھام اے صبحِ جہانِ نو کی ضوء
جاگ اے مستقبلِ انساں کے خواب
آس ڈوبی جا رہی ہے کیا کروں

احساسِ کامراں

افقِ روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو
شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے
تیرگی جتنا سنبھلنے کے لیے رکتی ہے
سرخ سیل اور بھی بے باک ہوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسہ نہ کرے
کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں
جذبۂ نصرتِ جمہور کی بڑھتی رو میں
ملک اور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں

سنگ و آہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کہو ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سیلِ انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کہو چھٹ جائیں

سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزمِ آزادیٔ انساں، بہ ہزاروں جبروت
اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر

اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لیے
کوئی زنجیر گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

میرے گیت تمہارے ہیں

اب تک میرے گیتوں میں امید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا اور خوابوں کی شہنائی بھی

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم، لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پتھ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا

آج سے اے مزدور کسانو! میرے گیت تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ نغمے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فنکار نہ مانیں

فکرو فن کے تاجر میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں
میرا فن میری امیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں!
آج سے میرے گیت تمہارے دکھ اور سکھ کا درپن ہیں

تم سے قوت لے کر اب میں تم کو راہ دکھلاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی میں بربط پر گاؤں گا
آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

میں نہیں تو کیا؟

مرے لیے یہ تکلف، یہ دکھ، یہ حسرت کیوں
مری نگاہِ طلب، آخری نگاہ نہ تھی
حیات زارِ جہاں کی طویل راہوں میں
ہزار دیدہ ء حیراں فسوں بکھیریں گے
ہزار چشم تمنا بنے گی دستِ سوال
نکل کے خلوتِ غم سے نظر اُٹھاو تو
وہی شفق ہے، وہی ضو ہے، میں نہیں تو کیا؟
مرے بغیر بھی تم کامیابِ عشرت تھیں
مرے بغیر بھی آباد تھے نشاط کدے
مرے بغیر بھی تم نے دیے جلائے ہیں
مرے بغیر بھی دیکھا ہے ظلمتوں کا نزول
مرے نہ ہونے سے امید کا زیاں کیوں ہو
بڑھی چلو مئے عشرت کا جام چھلکاتی
تمہاری سیج، تمہارے بدن کے پھولوں پر

اسی بہار کا پرتو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے لیے یہ اداسی، یہ سوگ کیوں آخر
ملیح چہرے پہ گردِ فسردگی کیسی
بہار غازہ سے عارض کو تازگی بخشو
علیل آنکھوں میں کاجل لگاؤ رنگ بھرو
سیاہ جوڑے میں کلیوں کی کہکشاں گوندھو

ہزار ہانپتے سینے ہزار کانپتے لب
تمہاری چشمِ توجہ کے منتظر ہیں ابھی
جلو میں نغمہ و رنگ و بہار و نور لیے

حیات گرمِ تگ و دو ہے، میں نہیں تو کیا

خودکشی سے پہلے

اُف یہ بے درد سیاہی یہ ہوا کے جھونکے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستانوں کے دیے
نیلگوں پردوں سے چھنتی ہیں شعاعیں اب تک
اجنبی بانہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ردائیں اب تک
سرد ہوتی ہوئی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ

ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
کون پونچھے مری آنکھوں کے سلگتے آنسو
کون الجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے

آہ یہ غارِ ہلاکت، یہ دیے کا محبس
عمر اپنی انھی تاریک مکانوں میں کٹی
زندگی فطرت بے حس کی پرانی تقصیر
اک حقیقت تھی مگر چند فسانوں میں کٹی

کتنی آسائشیں ہنستی رہیں ایوانوں میں
کتنے در میری جوانی پہ سدا بند رہے
کتنے ہاتھوں نے بنا اطلس و کمخواب مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے

ظلم سہتے ہوئے انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظلمت ہے فضاؤں پہ ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر
جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیے
آج میں موت کے غاروں میں اتر جاؤں گا
اور دم توڑتی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ
سرحدِ مرگِ مسلسل سے گزر جاؤں گا

پھر وہی کنجِ قفس

چند لمحوں کے لیے شور اٹھا ڈوب گیا
کہنہ زنجیرِ غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیلِ بلا، وہی دامِ امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی
ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعلطل کا فسوں
نبضِ امیدِ وطن ابھری، مگر ڈوب گئی
پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پا کر
ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی

میرے محبوب وطن! تیرے مقدر کے خدا
دستِ اغیار میں قسمت کے عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے، وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے، وہی بچوں کی پکار

تیرے رہبر تجھے مرنے کے لیے چھوڑ چلے
ارضِ بنگال! انھیں ڈوبتی سانسوں کی پکار

بول! چتگاوں کی مظلوم خموشی کچھ بول
بول اے پیپ سے رستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں
بول اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار

روک ان ٹوٹتے قدموں کو انھیں پوچھ ذرا
پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک

نور جہاں کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں دخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے
کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لیے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لیے
سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے
کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئین حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر
کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ہاتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ
سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد

اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے
سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان! مجھے حیرت وحسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نورو جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

جاگیر

پھر اسی وادیِ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیش کے لیے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم حسیں بانہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرات ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دل آویز ابلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی یہ کساں
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی میری، حاصل محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اُس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری نکہتِ گیسو بھی مری

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
عذر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں
ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں ادھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

مادام

آپ بے وجہ پریشاں سی کیوں ہیں مادام
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں تو لوگوں کو تعجب کیسا
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزت کیسی
لوگ کہتے ہیں، مگر آپ ابھی تک چپ ہیں
آپ بھی کہیے، غریبوں کی شرافت کیسی

نیک مادام! بہت جلد وہ دور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہوں گے
اپنی ذلت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہوں گے

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن اس تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی

میں جہاں ہوں وہاں انسان نہ رہتے ہوں گے
وجہِ بے رنگیِ گلزار کہوں یا نہ کہوں!!
کون ہے کتنا گنہگار کہوں یا نہ کہوں!!

مفاہمت

نشیبِ ارض پہ ذروں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید و سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سل ہی گئے

جہاد ختم ہوا دورِ آتشی آیا!
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شرابِ ہوس کے پیمانے

یہ جشن، جشنِ مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسیں فانوس

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لیے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمہارا مغنی تمہارے لیے
جب بھی آیا نئے گیت گاتا رہا
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں

میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں
میں تمہارا مغنی ہوں، نغمہ نہیں ہوں
اور نغمے کی تخلیق کا ساز و ساماں
ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں

میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے
بربریت کے خوں خوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرا رہے ہیں
بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشاں ہیں

ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفاں میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں!
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
میری گیتوں کی لے، میرا سُر، میری نے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو
ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لیے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں
سرفروشی کے خوابیدہ جذبے ابھارے
اور اس صبح کی راہ دیکھی!
جس میں اس ملک کی روح آزادہ
آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس ملک کے بحر و بر بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
ان کے خوابوں کو تکمیل کا روپ دو
ملک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں

عورتیں، بچیاں
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو ان کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچوں کو ان کی خوشی بخش دو
مجھ کو میری ہنر میری لے بخش دو
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمہارا مغنی تمہارے لیے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہوں گا

نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو

فریب جنتِ فردا کے جال ٹوٹ گئے
حیات اپنی امیدوں پہ شرمساری ہے
چمن میں جشنِ ورودِ بہار ہو بھی چکا
مگر نگاہِ گل و لالہ سوگواری ہے
فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے
افق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہر منور کہاں کی تنویریں
کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابنِ آدم نے
خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکستِ تمنا وہی غمِ ایام!
نگارِ زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا

جھک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریمِ شاہدِ رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہ گزر ختم ہو گئی لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پرانے راہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوعِ صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے

شکستِ زنداں

(چینی شاعر یانگ سو کے نام جس نے چیانگ کائی شیک کے جیل میں لکھا تھا" بیس سال قید: کاغذ کے ایک پرزے پر لکھے ہوئے چند الفاظ کی بنا پر ہوسکتا ہے کہ میں بیس سال تک سورج کی شکل نہ دیکھ سکوں، لیکن کیا تمہارا فرسودہ نظام جو لحہ بہ لحہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بیس سال تک زندہ رہ سکے گا؟؟")

خبر نہیں کہ بلا خانہء سلاسل میں
تیری حیاتِ ستم آشنا پہ کیا گزری
خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں
تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری

مگر وہ دیکھ فضا میں غبار سا اٹھا
وہ تیرے سرخ جوانوں کے رہوار آئے
نظر اٹھا کہ وہ تیرے وطن کے محنت کش
گلے سے کہنہ غلامی کا طوق اتار آئے

افق پہ صبح بہاراں کی آمد آمد ہے
فضا میں سرخ پھریروں کے پھول کھلتے ہیں
زمین خندہ بلب ہے شفیق ماں کی طرح
کہ اس کی گود میں بچھڑے رفیق ملتے ہیں

شکستِ مجلس و زنداں کا وقت آ پہنچا
وہ تیرے خواب حقیقت میں ڈھال آئے ہیں
نظر اُٹھا کہ ترے دیس کی فضاؤں پر
نئی بہار نئی جنتوں کے سائے ہیں

دریدہ تن ہے وہ قبائے سیم و زر جس کو
بہت سنبھال کے لائے تھے شاطرانِ کہن
رباب چھیڑ غزل خواں ہو رقص فرما ہو
کہ جشنِ نصرت محنت ہے جشنِ نصرتِ فن

میں تجھ سے دور سہی لیکن اے رفیق مرے
تری وفا کو مری جہدِ مستقل کا سلام
ترے وطن کو تری ارضِ باحمیت کو
دھڑکتے کھولتے ہندوستاں کے دل کا سلام

لہو نذر دے رہی حیات

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
افق سے تابہ اُفق پھانسیوں کے جھولے ہیں

پھر ایک منزلِ خونبار کی طرف ہیں رواں
وہ رہنما جو کئی بار راہ بھولے ہیں
بلند دعویٰ جمہوریت کے پردے میں
فروغِ مجلسِ زنداں ہیں تازیانے ہیں
بنامِ امن ہیں جنگ وجدل کے منصوبے
بہ شورِ عدل، تفاوت کے کارخانے ہیں
دلوں پہ خوف کے پہرے لبوں پہ قفلِ سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

مگر مٹے ہیں کہیں جبر اور تشدد سے
وہ فلسفے کہ جلا دے گئے دماغوں کو
کوئی سپاہِ ستم پیشہ چور کر نہ سکی
بشر کی جاگی ہوئی روح کے ایاغوں کو
قدم قدم پہ لہو نذر دے رہی ہے حیات
سپاہیوں سے الجھتے ہوئے چراغوں کو

رواں ہے قافلہء ارتقائے انسانی
نظامِ آتش و آہن کا دل ہلائے ہوئے
بغاوتوں کے دہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے
تمام ارضِ جہاں کھولتا سمندر ہے
تمام کوہ بیاباں میں تلملائے ہوئے

مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار، کون روکے گا؟

فصیلِ آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا؟
نئے خیال کی پرواز روکنے والے
نئے عوام کی تلوار کون روکے گا؟

پناہ لیتا ہے جن مجلسوں میں تیرہ نظام
وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں
ابھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں
ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

آوازِ آدم

دبے گی کب تلک آوازِ آدم ہم بھی دیکھیں گے
رکیں گے کب تلک جذبات برہم ہم بھی دیکھیں گے
چلو یونہی سہی یہ جورِ پیہم ہم بھی دیکھیں گے

درِ زنداں سے دیکھیں یا عروجِ دار سے دیکھیں
تمہیں رسوا سرِ بازارِ عالم ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو مآلِ شوکتِ جم، ہم بھی دیکھیں گے

یہ زعمِ قوتِ فولاد و آہن دیکھ لو تم بھی
بہ فیضِ جذبۂ ایمان محکم ہم بھی دیکھیں گے
جبینِ کج کلاہی خاک پر خم، ہم بھی دیکھیں گے

مکافاتِ عمل، تاریخ انساں کی روایت ہے
کروگے کب تلک ناوک فراہم، ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے

یہ ہنگامِ وداع شب ہے، اے ظلمت کے فرزندو
سحر کے دوش پر گلنار پرچم ہم بھی دیکھیں گے
تمہیں بھی دیکھنا ہوگا یہ عالم ہم بھی دیکھیں گے

متاعِ غیر

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتادے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں
چار دن کی یہ رفاقت، جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لیے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے
میری اجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی، کبھی غیر نظر آئی ہے
کبھی اخلاص کی مورت کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنہیں
ان تمناؤں کا اظہار و کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں، مری آنکھوں میں جھکی رہتی ہیں

تیرے ہاتھوں کی حرارت ترے سانسوں کی مہک
تیرتی رہتی ہے احساس کی پہنائی میں
ڈھونڈتی رہتی ہیں تخیل کی بانہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

تیرا انداز کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی حقیقت کا فسانہ ہی نہ ہو
تری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا اک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے
قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں
دل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں
دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمناؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
میرا حاصل، مری تقدیر بتا دے مجھ کو

بشرطِ استواری

خونِ جمہور میں بھیگے ہوئے پرچم لے کر
مجھ سے افراد کی شاہی نے وفا مانگی ہے
صبح کے نور پہ تعزیر لگانے کے لیے
شب کی سنگین سیاہی نے وفا مانگی ہے
اور یہ چاہا ہے کہ میں قافلۂ آدم کو
ٹوکنے والی نگاہوں کا مددگار بنوں!
جس تصور سے چراغاں ہے سرِ جادۂ زیست
اس تصور کی ہزیمت کا گنہگار بنوں!
ظلم پروردہ قوانین کے ایوانوں سے
بیڑیاں تکتی ہیں زنجیر صدا دیتی ہے
طاقِ تادیب سے انصاب کے بت گھورتے ہیں
مسندِ عدل سے شمشیر صدا دیتی ہے
لیکن اے عظمتِ انساں کے سنہرے خوابو
میں کسی تاج کی سطوت کا پرستار نہیں
میرے افکار کا عنوانِ ارادت تم ہو
میں تمہارا ہوں لٹیروں کا وفادار نہیں

انتظار

چاند مدہم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

دور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں
ان بہاروں کے سائے میں آجا
پھر محبت جواں رہے نہ رہے
زندگی تیرے نامرادوں پر!
کل تلک مہرباں رہے نہ رہے
روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں
آ ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں
چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

تیری آواز

رات سنسان تھی بوجھل تھیں فضا کی سانسیں
روح پر چھائے تھے بے نام غموں کے سائے
دل کو یہ ضد تھی کہ تو آئے تسلی دینے
میری کوشش تھی کہ کمبخت کو نیند آ جائے

دیر تک آنکھوں میں چبھتی رہی تاروں کی چمک
دیر تک ذہن سلگتا رہا تنہائی میں
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کی پرسش کے لیے
تو نہ آئی مگر اس رات کی پہنائی میں

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی!
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارہ ٹوٹے

شہد سا گھل گیا تلخابۂ تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے
دیر تک یوں تری مستانہ صدائیں گونجیں
جس طرح پھول چٹکنے لگیں ویرانے میں

تو بہت دور کسی انجمنِ ناز میں تھی
پھر بھی محسوس کیا میں نے کہ تو آئی ہے
اور نغموں میں چھپا کر مرے کھوئے ہوئے خواب
میری روٹھی ہوئی نیندوں کو منا لائی ہے

رات کی سطح پر ابھرے ترے چہرے کے نقوش
وہی چپ چاپ سی آنکھیں وہی سادہ سی نظر
وہی ڈھلکا ہوا آنچل وہی رفتار کا خم
وہی رہ رہ کے لچکتا ہوا نازک پیکر

تو میرے پاس نہ تھی پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس مرے جسم کو چھو کر گزرا
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گزرا

اب یہی ہے تجھے منظور تو اے جانِ قرار
میں تری راہ نہ دیکھوں گا سیہ راتوں میں
ڈھونڈ لیں گی مری ترسی ہوئی نظریں تجھ کو
نغمہ و شعر کی اُمڈی ہوئی برساتوں میں

اب ترا پیار ستائے گا تو میری ہستی!
تری مستی بھری آواز میں ڈھل جائے گی
اور یہ روح جو تیرے لیے بے چین سی ہے
گیت بن کر ترے ہونٹوں پہ مچل جائے گی

ترے نغمات تیرے حسن کی ٹھنڈک لے کر
میرے تپتے ہوئے ماحول میں آ جائیں گے
چند گھڑیوں کے لیے ہوں کہ ہمیشہ کے لیے
مری جاگی ہوئی راتوں کو سلا جائیں گے

خوبصورت موڑ

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے
تمہیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمہارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں
تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

(اس نظم کی 'خوبصورت پیروڈی' صفحہ نمبر ۲۸۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

غزلیات

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے
ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے
انہیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے
بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بیکار امیدو!
بہت دکھ سہہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے
اے آرزو کے دھندلے خرابو! جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے
تجھ کو خبر نہیں، مگر اک سادہ لوح کو
برباد کردیا ترے دو دن کے پیار نے
میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے
اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے
ہو کر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے
ٹوٹا طلسمِ عہد محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے
ہر شے قریب آکے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوق گریزاں نہ کر سکے
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لیے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیِ مآلِ محبت نہ پوچھیے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتہ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت پہ اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

غزلِ مسلسل

عقائد وہم ہیں، مذہب خیال خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ رانی
جوانی بے نیاز عبرتِ انجام ہے ساقی

ہوس ہوگی اسیرِ حلقۂ نیک و بد عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوق طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکس شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

توڑ لیں گے ہر اک شے سے رشتہ توڑنے دینے کی نوبت تو آئے
ہم قیامت کے خود منتظر ہیں، پر کسی دن قیامت تو آئے
ہم بھی سقراط ہیں عہدِ نو کے، تشنہ لب ہی نہ مرجائیں یارو
زہر ہو یا مئے آتشیں ہو، کوئی جامِ شہادت تو آئے
ایک تہذیب ہے دوستی کی ایک معیار ہے دشمنی کا
دوستوں نے مروت نہ سیکھی، دشمنوں کو عداوت تو آئے
رند رستے میں آنکھیں بچھائیں، جو کہے بن سنے مان جائیں
ناصح نیک طینت کسی شب سوئے کوئے ملامت تو آئے
علم و تہذیب، تاریخ و منطق، لوگ سوچیں گے ان مسئلوں پر
زندگی کے مشقت کدے میں کوئی عہدِ فراغت تو آئے
کانپ اٹھے قصرِ شاہی کے گنبد، تھرتھرائے زمیں معبدوں کی
کوچہ گردوں کی وحشت تو جاگے، غمزدوں کو بغاوت تو آئے